دمادم رواں ہے یمِ زندگی

حیاتِ اقبال کا پہلا دور - 1904ء تک

خرم علی شفیق

alhamra

دمادم رواں ہے یم زندگی

حیاتِ اقبال کا پہلا دور

1904ء تک

خرم علی شفیق

alhamra

میں اپنے خالق سے ملنا

اور یہ مطالبہ کرنا چاہوں گا

کہ وہ میرے ذہن کی معقول تشریح کرے۔

جسے کرنا، میرے خیال میں، اس کے لئے کوئی آسان کام

نہیں ہے!

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

سازِ خاموشم نوائے دیگرے دارم ہنوز
آنکہ بازم پردہ گرداند پئے آنم برید

سازِ خاموش ہوں مگر ابھی ایک نغمہ مجھ میں باقی ہے۔
جو دوبارہ میرا پردہ اٹھادے، مجھے اُس کے پاس لے چلو۔

پہلی بات

کسی موضوع کے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ کرنا عجیب سی بات ہے۔ مگر اس کے باوجود مجھے یہ کہنا ہے کہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اقبال کی ابتدائی زندگی کی وہ تمام باتیں جو کسی بھی صورت میں معلوم یا دستیاب ہیں اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس دائرے میں صرف اُن کی زندگی کے حالات ہی نہیں آتے بلکہ وہ خیالات جو انہوں نے دوسروں کی تحریروں سے اخذ کیے، خود اُن کی اپنی شاعری اور نثر کا مکمل جائزہ اور اِن کا تعارف اس میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کتاب اُس عہد کی تصویر بھی ہے۔

میں نے سوانح نگاری کے اُس بنیادی اُصول سے انحراف کیا ہے جو بیسویں صدی کے شروع میں رائج ہوا تھا اور جسے عام طور پر دُنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ یعنی ''سوانح نگار کا پہلا فرض یہ ہے کہ اُس کا دلکش اختصار ہر ایسی بات سے گریز کرے جو توجہ کے لائق نہیں ہے اور ہر ایسی بات کو شامل کر لے جو توجہ کے لائق ہے۔''

میں نے اس کے برعکس کلاسیکی دور کے اُن سوانح نگاروں کا راستہ اپنایا ہے جن کا خیال تھا کہ جب وہ کسی کی سوانح لکھتے ہیں تو اُس کی ہر بات توجہ کے قابل ہوتی ہے خواہ معمولی ہو یا غیر معمولی۔ سوانح نگار کسی صحافی کی مانند ہوتا ہے اور اُس کا کام یہ ہے کہ وہ پوری معلومات دیانت داری اور سلیقے کے ساتھ پیش کر دے۔ یہ فیصلہ کرنا قاری کا حق ہے کہ ان میں سے کون سی بات لائقِ توجہ ہے اور کون سی نہیں۔

اکیسویں صدی کے آغاز پر دنیا ایک کروٹ بدلتی نظر آ رہی ہے اور وہ رومانویت جسے بیسویں صدی کے ظاہر پرست مزاج نے ٹھکرا دیا تھا دوبارہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر رہی ہے۔ رومانویت کو انسان کے

فطری بچپنے سے بھی تشبیہہ دی جاتی ہے کیونکہ اس میں ہر چیز کی اہمیت اس بات سے ہوتی ہے کہ وہ کتنی دلچسپ اور کتنی نئی ہے۔ میری کوشش رہی ہے کہ یہ کتاب صرف مکمل معلومات ہی پیش نہ کرے بلکہ اُسے دلچسپ انداز میں بھی پیش کرے۔

ادب اور فن کے دیوتاؤں میں قریباً ایک صدی سے کسی فن پارے کے دلچسپ ہونے کو اُس کے گھٹیا ہونے کی دلیل سمجھا جاتا رہا ہے اور اعلیٰ درجے کی تحقیق کے دلچسپ ہونے کا تصور ہمارے یہاں ہی نہیں بلکہ دنیا میں کہیں بھی بہت زیادہ مقبول نہیں ہے۔ چنانچہ اس تحقیقی کتاب کے دلچسپ ہونے کی بات میں تعریف نہیں بلکہ تہمت سمجھ کر چھیڑ رہا ہوں، ایک ایسی تہمت جو مجھے قبول ہے۔ (اپنی ایک کتاب پر میں نے خود یہ تبصرہ پڑھا ہے کہ چونکہ کتاب دلچسپ ہے لہٰذا اس کے مستند ہونے میں شبہ پیدا ہوتا ہے!)

مجھے غیر جانبداری کا بھی کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ ہم اُسی شخص کے بارے میں زیادہ لکھتے یا پڑھتے ہیں جس سے ہم بہت محبت یا کافی نفرت کرتے ہیں۔ سوانح نگار اگر اپنا فن جانتا ہے تو وہ کسی کی زندگی پر لکھتے ہوئے اُس کا طرفدار ہونے کے باوجود اُسے تمام انسانی کمزوریوں کے ساتھ پیش کرے گا کیونکہ تصویر صرف سفید رنگ سے نہیں بنتی، اس میں دوسرے رنگ بھی شامل کرنے پڑتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اگر میں اقبال کے بارے میں ''غیر جانبدار'' ہوتا تو اُن کی بجائے کسی اور شخصیت پر کتاب لکھتا جس کا میرا کوئی تھوڑا بہت جذباتی رشتہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ مجھے اقبال سے ویسا لگاؤ ہے جیسا میں کم از کم اِس وقت کسی دوسری ادبی شخصیت سے محسوس نہیں کرتا ہوں۔

یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ یہ سوانح ایک ایسے دور کے آغاز پر پیش کی جا رہی ہے جب بیسویں صدی کا فطرتی نظریۂ زندگی دم توڑ رہا ہے اور اُس رومانویت کے دوبارہ زندہ ہونے کے آثار نظر آ رہے ہیں جسے گوئٹے اور ورڈزورتھ کے ہاتھوں عروج ملا اور جس کے آخری نقیب خود اقبال تھے۔ آج دنیا نے زندگی کو پھر اُس نظر سے دیکھنا شروع کیا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ یہ صدی اُس کی ہو جسے اقبال اپنی زبان میں ''عشق'' کہتے تھے۔ مشرق کے اس شاعر کی زندگی اور سوچ پر دوبارہ غور کرنے کے لئے شائد یہ گھڑی مناسب ہے۔ ''کتنے ہی شاعر ہیں کہ مرکر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ خود تو آنکھ بند کرتے ہیں مگر ہماری آنکھ کھول دیتے ہیں۔''

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بر بست و چشمِ ما کشاد

(اقبال)

شکریہ

اس کتاب کا نقشِ اول میں نے اپنی بیوی بشریٰ احمد کے لئے تحریر کیا تھا۔ اگر اُسے اقبال سے دلچسپی نہ ہوتی تو شائد میری اپنی دلچسپی بھی اُس وقت اظہار کا راستہ اختیار نہ کرتی۔

اس کے علاوہ مجھے استادِ محترم عباس حسین کا ذکر کرنا ہے جنہوں نے کئی مراحل پر اور بالخصوص تصوف کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے میں میری رہنمائی فرمائی۔ دوست حارث خلیق کا تذکرہ کرنا میرے لئے نہایت پرلطف ہے جنہوں نے نہ صرف کتاب کا عنوان تجویز کیا بلکہ اس طرح میرے اعصاب پر مسلط ہوئے کہ بالاخر کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچوا کر دم لیا۔ میرے لئے یہ ایک جناتی قسم کی مہم تھی جسے حارث کے خلوص کے بغیر سر کرنا شائد اور بھی دشوار ہوتا ع

ایک بیدادگرِ رنج فزا اور سہی

اُن تمام دیدہ و نادیدہ شخصیات کا بھی مشکور ہوں جن کی مہربانی اور دلچسپی نے مجھے پہلے پہل اقبال سے شناسا کیا اور بعد میں اُس شناسائی کو بڑھنے کے مواقع فراہم کئے۔ موخر الذکر میں وہ تمام جلیل القدر اہلِ قلم شامل ہیں جن کی تحریروں سے میں نے اکتسابِ فیض کیا۔ بالخصوص محترم جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال اور ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ اوّل الذکر میں میرے والد مرحوم محمد شفیق شامل ہیں جن کے فیض نظر کے بغیر میں اقبال کی شاعری کو محسوس کرنے کے قابل نہ ہوسکتا تھا۔

میں اپنی والدہ امتیاز شفیق کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کی زندگی میرے لئے مشعل راہ بنی ہے۔

فہرس

ہر اِک مقام سے آگے گزر گیا مہِ نو

باب ۱	آسمان اور زمیں	13
باب ۲	ماں کی آغوش میں	39
باب ۳	خاندانِ مرتضیٰ کی بارگاہ	46
باب ۴	گجرات کا قید خانہ	86
باب ۵	حکیموں کا بازار	110
باب ۶	مشرقی کالج	150
باب ۷	ہمالہ	170
باب ۸	سورج کے سامنے	202
باب ۹	امیر کا صنم خانہ	208
	حاشیے	258
	کتابیات	287

باب ا

زمین وآسماں

۱۸۷۹ء تک

پہلا حصہ

1

جب کشمیر کی برف پوش چوٹیوں پر سورج کی پہلی کرن چمکتی تھی تو اقبال کے آباواجداد اُسے نور دینے والے کو خراجِ عقیدت پیش کرتے تھے۔

اوم!

بُھر بُھوے سُوے...

اے آفتاب کو روشن کرنے والے آفتاب!

مقدس روشنیوں کے جھرمٹ!

ہم تیرا دھیان کرتے ہیں،

تو ہمارے شعور کو تحریک اور تڑپ دے!(۱)

سورج کی حرارت سے زندگی کے چشمے اُبلتے تھے اور ہر چیز متحرک، جوان اور خوبصورت ہو جاتی تھی۔

کبھی اسی سورج کی محبت دل میں لے کر آریاؤں کے لشکر وسط ایشیا سے اُٹھے تھے۔ کچھ مغرب کی طرف نکلے اور اُن کی اولادوں نے یونانی فلسفے اور ادب سے مغربی تہذیب کی شمع روشن کی۔ جو ایران میں

آباد ہوئے اُن میں زرتشت پیدا ہوئے۔ کچھ دریاؤں کی سرزمین میں آ پہنچے اور ان کے کارواں راوی اور گنگا کے کنارے اترنے لگے۔

کشمیری پنڈت انہی کی اولاد تھے۔

2

کشمیر میں اسلام بارہویں یا تیرھویں صدی میں داخل ہوا۔ پہلے پہل صوفی یہاں آئے۔ پھر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

۱۲۹۵ء میں فارسی سنسکرت کی جگہ سرکاری زبان قرار پائی۔ یہ اُن آریاؤں کی زبان تھی جو ایران میں آباد ہوئے تھے مگر اسلامی فکر اور فلسفہ کا سرمایہ اسی زبان میں محفوظ تھا۔

کچھ برہمنوں نے یہ زبان سیکھی اور اُن کے ساتھیوں نے حقارت سے انہیں 'سپّر' یعنی جلدی پڑھنے والے کہنا شروع کر دیا۔

3

پندرھویں صدی میں ایک سپرو نے اسلام قبول کیا۔

برہمن رشتہ دار اُن کے دشمن ہوگئے مگر یہ اسلام سے منحرف نہ ہوئے۔ بیوی سے تعلقات اچھے نہ تھے جو ان کی بھینگی آنکھوں اور ٹیڑھے پیروں کی وجہ سے اِن پر ہنستی تھی۔ ایک روز یہ پہاڑوں سے نیچے اتر گئے اور بارہ سال تک واپس نہ آئے۔ کئی بار حج کیا۔ کئی ملک دیکھے۔ واپس آئے تو لوگ اِن کا اصل نام بھول کر بابا لول حج کہنے لگے۔

واپس آنے کے بعد بابا لول حج ایک صوفی کے مرید ہوگئے اور بقیہ عمر مرشد کے پاس ہی گزاری۔

بابا لول حج مرنے لگے تو ہدایت کر گئے کہ اِنکی قبر کے سرہانے اِن کا عصا گاڑ دیا جائے۔

وہ عصا ایک سرسبز درخت بن گیا۔ (۲)

4

اٹھارہویں صدی کا آغاز ہوا۔

بابا لول حج کی نسل سے شیخ محمد اکبر ایک صوفی سیّد کے مرید تھے۔ مرشد کے انتقال کے بعد کچھ عرصے مریدوں کی ذمہ داری بھی اٹھائی۔

مرشد کے خاندان ہی میں اِن کی شادی ہوگئی۔

5

اٹھارہویں صدی کا اختتام تھا یا اُنیسویں صدی کا شروع! شیخ محمد اکبر کے پوتے یا پڑپوتے شیخ جلال الدّین تھے۔ ان کے چاروں بیٹے انہیں لے کر پہاڑوں سے نیچے اتر آئے۔ عبدالرحمٰن، محمد رمضان اور محمد رفیق سیالکوٹ میں آباد ہوئے جبکہ سب سے چھوٹے عبداللہ نے موضع سیالکوٹ کے ضلع جیٹھیکے میں سکونت اختیار کر لی۔

6

محمد رفیق عرف فیقا محلّہ کھٹیکا میں رہتے تھے۔ شہر میں ان کا کپڑے اور کشمیری دھسّوں کا چھوٹا سا کاروبار تھا۔

ان کی شادی بھی ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی مگر اولاد ہونے سے پہلے بیوی چل بسیں۔

۱۸۱۳ء کے قریب جلال پور جٹاں کے ایک کشمیری گھرانے میں محمد رفیق کی دوسری شادی ہوئی۔ یہ بیوی غیر معمولی طور پر حسین تھیں۔ ان کا نام گجری پڑ گیا۔

7

رنجیت سنگھ آندھی بن کر پنجاب پر چھایا تھا۔

اس نے ۱۷۹۹ء میں لاہور سے اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ سیالکوٹ ۱۸۰۷ء میں اس کے قبضے میں آیا۔

۱۸۱۴ء میں جب رنجیت سنگھ کی فوجیں کشمیر پر حملہ کرتے ہوئے راستے میں سیالکوٹ ٹھہری ہوں گی تو محمد رفیق نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہوگا۔

کشمیر پر رنجیت سنگھ کا قبضہ ۱۸۱۹ء میں ہوا۔ اس سے اگلے برس تک وہ سکھوں کی منتشر قوتوں کی

شیرازہ بندی کر کے ایک عظیم پنجابی سلطنت کی بنیاد رکھ چکا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو اپنے دربار میں جگہ دی مگر اس کے بعض اقدامات مسلمانوں کے لئے تکلیف دہ بھی تھے۔ پنجاب کے کونے کونے سے مغل مقبروں کے قیمتی پتھر نوچ کر امرتسر میں زیرِ تعمیر گردوارے میں لگائے گئے اور شاہی مسجد اصطبل بنادی گئی۔ سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ اس کے حکم پر کشمیر سے ان گنت دوشیزائیں اغوا کر کے لاہور پہنچائی گئیں تاکہ گورے رنگ کی آغوش میں رنجیت سنگھ اپنے چیچک کے داغوں اور ناکارہ آنکھ کے نقص کا غم بھلا سکے۔

8

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندو اس وقت جس مذہبی نظام پر عمل کر رہے ہیں وہ اُن کی سیاسی ترقی میں مددگار ثابت نہیں ہوسکتا... یہ بہت ضروری ہے کہ کم از کم اُن کے سیاسی فائدے اور اُن کے رہن سہن کے آرام کے لئے اُن کے مذہب میں بعض تبدیلیاں کی جائیں۔"

یہ الفاظ رام موہن رائے کے ہیں جو انہوں نے ۱۸۲۸ء میں تحریر کئے۔ وہ بنگال میں رہتے تھے، جو ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا مرکز تھا۔

ان کی قائم کردہ برہمو سماج کی شاخیں بہت دور تک پھیل گئیں۔

9

مسلمانوں کی وہ تحریک جسے ہندوستان میں اہلِ حدیث اور باقی دنیا میں وہابی تحریک کہا جاتا تھا، ایک بنیادی مقصد لے کر اٹھی تھی، یعنی اسلام کو اُن عقائد سے پاک کرنا جو تصوف کی وجہ سے اور غیر مسلموں کے ساتھ میل جول رکھنے سے پیدا ہوئے تھے، خاص طور پر رسولِ اکرم کی شفاعت کو اور اولیاء اللہ کو وسیلہ سمجھنا۔ حاکمِ جابر کے خلاف جہاد کر کے شریعت کو رائج کرنا بھی اس تحریک کے مقاصد میں شامل تھا۔ شاہ اسماعیل اُس زمانے میں اہلِ حدیث کے بڑے مبلغ تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ انگریزوں کی حکومت میں مسلمانوں کے عقائد محفوظ ہیں لہٰذا مسلمانوں پر رعایا ہونے کے ناتے انگریزوں کی اطاعت فرض ہے۔ البتہ سکھوں کے ماتحت مسجدیں اصطبل بنائی جارہی ہیں اس لئے پنجاب میں سکھوں سے جہاد کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

اِس تحریک کو سیّد احمد بریلوی کی صورت میں بلند حوصلہ قیادت میسّر آئی تو بظاہر یوں لگنے لگا کہ اب اس کے سپاہی رنجیت سنگھ کی افواج کو روندتے ہوئے پنجاب کے سینے تک پہنچ جائیں گے۔ مگر ایک طرف مجاہدوں نے معمولی اختلاف رکھنے والے مسلمانوں کے جسموں کے اعضا کاٹنے شروع کیے تو دوسری طرف رنجیت سنگھ بعض مقامی لوگوں کو اُن سے توڑنے میں کامیاب ہوگیا۔

اندرونی خلفشار اور رنجیت سنگھ کی افواج کے سامنے مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے تاریخی معرکے میں شاہ اسماعیل اور سیّد احمد بریلوی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

10

گجری کے یہاں اب تک دس لڑکے پیدا ہوئے تھے جن میں سے کوئی بھی دودھ چھٹنے کی عمر تک زندہ نہ رہا تھا۔

۱۸۳۷ء کے قریب ایک گیارہواں بچہ پیدا ہوا۔

گھر کی عورتوں نے پیروں فقیروں سے دعائیں کروائیں اور پھر کسی کو یہ اچھوتا خیال سوجھا کہ بچّے کی ناک میں نتھ ڈال دی جائے تاکہ موت کا فرشتہ اسے لڑکی سمجھ کر واپس چلا جائے۔ پھر شاید یہی ترکیب کام کر گئی۔ لڑکے کا نام نور محمد رکھا گیا مگر لوگوں میں وہ نتھو کے نام سے مشہور ہوا۔

کچھ عرصہ بعد ایک اور لڑکا پیدا ہوا مگر موت کا فرشتہ اب راستہ بھول چکا تھا۔ چھوٹے لڑکے کا نام غلام محمد رکھا گیا۔

11

کسی معاشرے کے زوال کا اندازہ اس کے کتب خانوں کی تاریخ سے لگایا جا سکتا ہے۔

سیالکوٹ میں عبدالحکیم کا کتب خانہ خاصے کی چیز تھا۔ یہ بزرگ دو سو سال پہلے گزرے تھے اور مجدّد الفِ ثانی کے اُستاد بھائی تھے۔

''افسوس! خلف وہ نہ نکلے جو سلف تھے۔ خلف بنانے کے لئے آئے تھے، خلف برباد کرنے کے لئے پیدا ہوئے۔ وہ کتب خانہ نااہلوں کے پاس آ کر رفتہ رفتہ تباہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ جب (رنجیت سنگھ کے بعد سکھوں کی خانہ جنگی میں) سیالکوٹ لُوٹا گیا، شہر میں آگ لگائی گئی، تو یہ نادر کتب خانہ بھی جو اپنے

زمانے میں شمالی ہند کالا جواب کتب خانہ تھا، سکھوں نے جلا دیا۔'' یہ تأثرات سیالکوٹ کے ایک باشندے کے ہیں جو اُس کتب خانے کی تباہی کے وقت بچہ تھا۔

12

کشمیر کے ڈوگرہ حکمراں نے ایک ایسے وقت اپنے آقاؤں کا ساتھ چھوڑا جب وہ پنجاب کو انگریزوں سے بچانے کی جدّ وجہد کر رہے تھے۔

۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے مسلمانوں سے بھری ہوئی کشمیر کی پہاڑیاں پچھتر لاکھ رُوپے (۷۵،۰۰،۰۰۰ رُوپے) کے عوض گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ دیں جس نے وعدہ کیا کہ وہ ہر سال ایک گھوڑا، بارہ بکریاں اور کشمیری شالوں کے تین جوڑے صاحب لوگوں کو بھیجا کرے گا۔

13

ایک روایت کے مطابق انگریزوں اور سکھوں کی جنگ میں شیخ رفیق نے سکھوں کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے حصہ لیا۔ (۳)

14

۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہو گیا۔

سیالکوٹ میں انگریزوں نے اسپتال کھولا اور اینگلوورنیکلر مڈل اسکول قائم کیا۔

انگریزوں کی آمد کے ساتھ پنجاب میں بھی ڈاک کا نظام متعارف ہوا جو اُن دنوں تیز رفتار تانگوں سے چلتا تھا۔ اِس کے ساتھ ساتھ پکّی سڑکیں بنیں جو بڑے شہروں کو ملاتی تھیں۔ چھوٹے شہروں کی طرف جانے والی سڑکیں اگرچہ کچّی ہی رہیں مگر راستوں پر ٹھگوں اور راہزنوں کا خطرہ قریب قریب ختم ہو گیا۔

کمپنی کی حکومت میں غلام اور کنیزیں بنانے کی ممانعت تھی۔ لڑکیوں کو اِغوا کر کے اُن سے زبردستی پیشہ کروانا بھی اب جُرم قرار پایا۔

زمینوں کی از سرِ نَو تقسیم ہوئی۔

15

پنجاب میں انگریزوں نے جو نہروں کا جال بچھایا اُس کی وجہ سے دور دور تک خوشحالی پھیل گئی۔ حکومت کے سامنے یہ مقصد تھا کہ رعایا کو جلد از جلد مطمئن کر دیا جائے کیونکہ مفتوحہ زمینوں کی زرخیزی پر آقاؤں کی اپنی خوشحالی کا انحصار تھا۔

''پنجاب کے اِس شہر اور ضلع (سیالکوٹ) میں جس قدر تعلیم کے فوائد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، غالباً تمام ہندوستان میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی کیونکہ... اِس کے قرب و جوار کے نو سو پچاس دیہات (میں) وہ خاص ٹیکس جو حکومت نے دیسیوں کی تعلیم کے لئے عائد کیا تھا، پیشگی ادا کر دیا گیا ہے۔''

گارسیں دتاسی۔ ۲ دسمبر ۱۸۵۵ء

16

مادّی ترقی کے پیچھے پیچھے عیسائی مشنری روحانی نجات کے تحفوں سے لدے پھندے چلے آ رہے تھے۔

ہنٹر صاحب جنوری ۱۸۵۷ء میں سیالکوٹ پہنچے۔ اُن کے ساتھ ایک سیّد لڑکا محمد اسماعیل تھا، جو اُن کے ہاتھ پر عیسائیت قبول کر چکا تھا۔

ہنٹر صاحب کا اسکاچ مشن سے تعلق تھا۔ اُنہوں نے ایک ماہ کے اندر اندر دو ورنیکلر اسکول قائم کئے جن کا مقصد نوجوان لڑکے لڑکیوں کو بائیبل کی تعلیم دے کر عیسائیت میں داخل کرنا تھا۔

سیالکوٹ کے ایک جدید مورخ کا بیان ہے۔ 'شہروں میں اسکول قائم کرنے کے علاوہ مشنری لوگ شہر کے بازاروں میں مقامی زبان یعنی اُردو میں تبلیغ کرتے۔ اِن غیر ملکی مشنریوں کے ہمراہ دیسی عیسائی بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ دینی کتابچے تقسیم کرتے، دینی کتب فروخت بھی کرتے۔ لوگوں کو طبّی سہولت مہیا کر کے بھی اُن کو مسیحیت کی طرف راغب کیا جاتا۔ دیہاتی لوگوں میں اِنہیں بڑی کامیابی ہوتی، خصوصاً کم ذات اور (نچلے طبقے) کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔'

۱۷

شیخ نور محمد جوان ہو چکے تھے مگر بچپن میں پہنی ہوئی نتھ کا نشان اب تک موجود تھا اور لوگوں میں شیخ نتھو کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ قد طویل تھا۔ ماں کا حسن ورثے میں پایا تھا اور خاموش طبیعت شائد بابا

لول جی کے تصوف کا اثر تھی جو اَن گنت پشتوں کے بعد اِن میں پوری طرح عود کر آیا تھا۔ داڑھی رکھی ہوئی تھی اور نماز روزے کے بھی پورے پابند تھے۔ اگرچہ صرف ناظرہ پڑھے ہوئے تھے مگر صوفیوں اور درویشوں کے درمیان بہت وقت گزارتے تھے اور اگر اِن میں بھی لول جی جیسی جرات ہوتی تو ضرور درزی کا کام چھوڑ کر ویرانوں میں نکل گئے ہوتے۔ مگر گجری اور فیقا اب بوڑھے ہو چلے تھے اور گھر کی ذمہ داری نور محمد کے کاندھوں پر آ گئی تھی۔

18

سمبڑیال میں ایک کشمیری گھرانہ آباد تھا۔

اس گھر کی لڑکی امام بی بی کی عمر شادی کے لائق ہوگئی تھی۔

ایک دن محمد رفیق اپنے بیٹے کی برات لے کے پہنچے اور امام بی بی کو بڑی بہو بنا کر لے گئے۔

تھوڑے عرصے بعد سمبڑیال کا کشمیری گھرانہ بھی سیالکوٹ ہی میں آ کر آباد ہوگیا۔

امام بی بی اور نور محمد ہم عمر تھے۔ دونوں دل کے نیک تھے اور نماز روزے کے پابند مگر اس سے آگے اُن کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

نور محمد کی طرح امام بی بی بھی اپنے دسترخوان کی روٹی کسی دوسرے کو کھلا سکتی تھیں مگر جہاں نور محمد کے انداز میں ایک درویش کی بے نیازی ہوتی وہاں امام بی بی کی ادا میں عنایاتِ خسروانہ کی جھلک۔ وہ بھری دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے دل کی گہرائیوں میں کسی کو ڈھونڈتے رہتے تھے اور اِن کا دل گھر کی چاردیواری میں رہتے ہوئے بھی معاشرے میں اپنے صحیح مقام کی جستجو کرتا رہتا۔

امام بی بی اور نور محمد کے اطراف میں ایک نیا معاشرہ وجود میں آنے والا تھا۔

اور اِس بات کا علم اُنہیں تو کیا، ملکہ وکٹوریہ کو بھی نہیں تھا!

دوسرا حصہ

۱۲ اپریل ۱۸۵۷

پنجاب کے ایک اخبار میں خبر چھپی: از روئے ایک چٹھی سیالکوٹ کے ظاہر ہوا کہ یہاں کے سپاہی بھی نئے کارتوسوں کے قواعد سے ٹکراتے ہیں اور بجائے دانتوں کے ہاتھوں سے کارتوس توڑتے

ہیں۔لوگوں کے دلوں کا شک ابھی بالکل رفع نہیں ہوا۔(۴)

۱۴ مئی

ضلع سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر نے سیالکوٹ میں موجود مشنریوں کو خطرے کی اطلاع دے دی۔صبح نو بجے امریکی مشن قلعۂ لاہور میں پناہ لینے روانہ ہوگیا۔ہنٹر صاحب خدا کے بھروسے پیچھے رہ گئے۔

۹ جولائی

سیالکوٹ میں چند نہتے سپاہی داخل ہوئے۔اِن کا تعلق جہلم رجمنٹ سے تھا۔ہندوستان کی کئی چھاؤنیوں میں بغاوت ہوجانے کے بعد انگریز افسروں نے اِن کے ہتھیار واپس لے لئے تھے۔

ہنٹر صاحب نے فضا میں تبدیلی کے آثار دیکھ لئے اور بیوی بچوں سمیت مشن ہاؤس سے نکل کر ایک بنگلے میں پناہ لی جو چھاؤنی سے تھوڑے فاصلے پر لاہور جانے والی سڑک پر تھا۔

آدھی رات کو انہوں نے کچھ خطرہ محسوس کیا مگر اُس وقت لاہور کے لئے نکلنا ممکن نہ تھا۔

۱۰ جولائی

ہنٹر صاحب کی صبح فائروں کی آواز سے ہوئی جو اُنہیں صاف سنائی دے رہی تھی۔انہوں نے گھوڑا گاڑی نکالی اور بیوی، بچے اور ملازم کے ساتھ بنگلے سے نکل پڑے۔

سیالکوٹ چھاؤنی میں مقامی سپاہیوں نے بغاوت کردی تھی۔ہنٹر صاحب نے انہیں دیکھا تو گھوڑا گاڑی قلعے کی طرف موڑ دی جہاں شہر کے تمام مشنری اور دوسرے انگریز جمع ہو رہے تھے۔ڈسٹرکٹ جیل تک پہنچے ہوں گے کہ ان باغیوں سے اُن کا سامنا ہوا جو قیدیوں کو رہا کروا رہے تھے۔اُن میں سے کسی نے تاک کر نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔چہرے کے پرخچے اُڑ گئے۔ہنٹر صاحب صرف تیس برس اس دنیا میں رہ پائے تھے۔

ایک اور باغی نے پستول داغا اور گولی مسز ہنٹر کو زخمی کرگئی۔جیل کے مسلمان محافظ نے یہ دیکھا تو دوڑ کر اُن کے پاس آیا اور تلوار سے اُن کی گردن کاٹ دی۔پھر اُن کے بچے کا سر قلم کیا۔

ہنٹر صاحب کا ملازم بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔وہ سیدھا محمد اسماعیل کے پاس پہنچا۔جب اسماعیل زور زور سے رویا تو ملازم نے کہا۔"صاحب، ذرا آہستہ۔آپ کی جان بھی خطرے میں ہے۔"

شائد اُسی روز

راجپوت عبدالرزّاق راٹھور نے، جو کچھ عرصہ پہلے کشمیر سے سیالکوٹ آکر انگریزی فوج میں ملازم ہوئے تھے، میجر سانڈرز اور اُس کے ساتھی پندرہ انگریز مرد اور عورتوں کو کہیں لے جا کر چھپا دیا۔

باغی عبدالرزّاق کو پکڑ کر لے گئے مگر بات مشہور ہے کہ راجپوت جس کی ملازمت کرتا ہے اُس کے خلاف کبھی تلوار نہیں اُٹھاتا۔ پھر یہ تو مانے ہوئے پہلوان بھی تھے۔

اگلے روز انگریزوں کو محفوظ مقام پر پہنچانے کا بندوبست ہو گیا۔ میجر سانڈرز نے عبدالرزّاق کی خدمات کے اعتراف میں ایک چٹھی لکھ دی۔

دس گیارہ دن بعد

سیالکوٹ میں امن قائم ہو گیا۔ محمد اسماعیل مضافات سے واپس آ گیا۔ مشن ہاؤس میں سوائے پھٹی ہوئی کتابوں کے اور کچھ نہ تھا۔

امریکی مشن والے لاہور سے آ گئے۔ انہوں نے اسماعیل کی کچھ مالی امداد کی۔

انگریزوں نے انصاف کرنا شروع کیا۔

۱۹ فوجی اور ۳ سول ملازمین کو سرِ عام پھانسی دی گئی۔

۱۴۱ فوجی ملازمین اور ۱۳ دوسرے افراد کو گولیوں کی باڑھ کے سامنے کھڑا کر کے ہلاک کیا گیا۔

۱۱ سرکاری ملازمین کو زندان میں ڈالا گیا۔

۹۲۸ عام شہریوں کو کوڑوں کی سزا دی گئی۔

جو ہندوستانی انگریزوں کے وفادار رہے تھے اُنہیں نوازا گیا۔ عبدالرزّاق راٹھور پہلے چھ روپیہ ماہوار کے ملازم تھے۔ اب اُنہیں کام پر آنے سے مستثنیٰ قرار دے کر پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا اور معلوم ہوا کہ یہ وظیفہ اُن کے بیٹے کو بھی ملے گا۔

ہنٹر صاحب کی یاد میں ایک چرچ اور ایک محلّہ آباد کرنے کا فیصلہ ہوا۔

ملکہ وکٹوریہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی ختم کرتے ہوئے ہندوستان کو تاجِ برطانیہ کے مقبوضات میں شامل کرنے کا اعلان کیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ کسی ہندوستانی کو تبدیلیٔ مذہب پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے ساتھ ہی سزا اور تشدد کا وہ سلسلہ بھی ختم ہوا جو پچھلے سال کے غدر کی وجہ

سے انگریزوں کی طرف سے اہلِ ہند کے خلاف جاری تھا۔

تیسرا حصّہ

19

۱۸۵۹ء میں نور محمد اور امام بی بی کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ شیخ عطا محمد نام رکھا گیا۔ (۵)

20

سید میر حسن اپنے خاندان کے باغی تھے۔

یہ امام جعفر صادقؒ کے لڑکے ابراہیم کی نسل میں سے تھے۔

کسی زمانے میں ان کا خاندان پنجاب میں آباد ہو گیا تھا۔ اس کے بزرگوں کے مزار پنجاب کے کئی بڑے شہروں میں اہل عقیدت کی زیارت گاہیں تھے۔

سیّد میر حسن کے خاندان کے بعض لوگ شیعہ تھے اور بعض اُن کے والدین کی طرح سُنّی عقیدے کے پیرو ہو گئے تھے۔ عام طور پر اِن کا پیشہ طب ہوتا تھا۔

میر حسن جب سترہ سال کے ہوئے تو اُنھوں نے طّب پڑھنے کے بعد اسے ایک پیشے کے طور پر اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ انہیں تھوک اور پیشاب سے گھِن آتی تھی۔ گھر والوں نے کسی مسجد میں پیش امام لگوا دیا کیونکہ عربی میں شروع ہی سے بہت تیز تھے۔ مگر پہلی شام محلّے کا ایک فرد روٹی لے کر اِن کے پاس آیا تو غیرت کے مارے ہاتھ کپکپانے لگے اور بے ہوش ہو گئے۔

اس واقعے کے بعد انھوں نے اعلان کیا کہ وہ خیرات پر گزارہ کر کے نماز پڑھانے سے انگریز کی ملازمت کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ضِلع اسکول والوں نے اُن کی قابلیت کے متعلق اچھی رائے قائم کی اور پندرہ روپے پر ملازم رکھ لیا۔ مگر جب یہ وہاں سے چلنے لگے تو ایک پادری نے دریافت کر لیا کہ پہلے بھی کہیں پڑھایا ہے یا نہیں۔ ان کے سچ بولنے پر تنخواہ ۱۵ روپے کے بجائے ۹ روپے مہینہ ہو گئی۔ (۶)

21

احمد شفیع کی مادری زبان اُردو تھی، مگر غدر کے حادثہ نے اُنھیں سیالکوٹ پہنچادیا تھا۔ روزی کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ ناچار، یہ بھی انگریز کے اسکول میں داخل ہو گئے۔

احمد شفیع کے مزاج میں اِتنی نفاست تھی کہ اُسے رحمدلی کے بجائے کمزوری سے تعبیر کیا جاسکتا تھا۔ پھر بھلا میر حسن سے گہری دوستی کیوں نہ ہوجاتی جنھوں نے خود اس قسم کی کمزوریوں کی وجہ سے خاندانی پیشہ ٹھکرادیا تھا۔ اِس دوستی کا میر حسن پر یہ اثر ہُوا کہ اُنہیں اردو میں بات کرنے کا شوق ہوگیا۔ سیالکوٹ میں اُردو زبان وادب سے واقفیت تو پہلے سے عام تھی مگر میر حسن روزمرہ عام بول چال بھی اِسی زبان میں کرنے لگے۔ طلبہ سے کہہ دیا کہ کمرۂ جماعت میں پنجابی نہیں، اُردو بولی جائیگی۔

22

محمد رفیق کے دُوسرے لڑکے غلام محمد کو بھی تصوف سے دلچسپی تھی، مگر نور محمد کی طرح نہیں کہ دُنیا کے کام کے نہ رہیں۔ تھوڑی بہت تعلیم بھی حاصل کررکھی تھی۔ محکمۂ نہر میں ملازم ہوئے اور روپڑ (ضلع انبالہ) چلے گئے۔

23

۱۸۶۱ء میں محمد رفیق نے محلّہ کھٹیکاں چھوڑ دیا۔ مسجد دودروازہ کے قریب ڈیڑھ سو روپے میں ایک مکان خریدا جو ایک طرف سے کشمیری محلّہ اور دوسری طرف سے چوڑی گراں میں کُھلتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ایک منزلہ مکان تھا۔

24

میر حسن کی شادی سعید بیگم سے ہُوئی جو حاجی پورہ (سیالکوٹ) کی رہنے والی تھیں اور عُمر میں اُن سے تین برس چھوٹی تھیں۔

25

اسکاچ مشن والے سیالکوٹ میں دوبارہ اسکول کھول چکے تھا۔ اِس دفعہ یہ ادارہ پہلے سے زیادہ پختہ بنیادوں پر قائم ہُوا تھا اور حکومت سے بھی مالی امداد مل رہی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں ایک نیا اسکول وزیر آباد میں کھولنے کا فیصلہ ہوا۔ عربی فارسی اور اُردو کے اساتذہ کی بھرتی شروع ہوئی۔

سید میر حسن اسکاچ مشن اسکول کو ضلع اسکول سے بہتر سمجھتے تھے۔ تنخواہ زیادہ تھی، ماحول بہتر تھا۔ انہوں نے بھی درخواست پیش کی اور منتخب ہوگئے۔ گھر والوں پر قیامت گزر گئی۔ اماموں کی اولاد عیسائی تبلیغیوں کی خدمت کرے گی!

اُس رات گھر میں دِیا نہ جلا۔

26

وزیر آباد سیالکوٹ سے پچیس میل دُور تھا۔ سیالکوٹ سے وہاں جانے کے لئے عام طور پر لوگ بیل گاڑی استعمال کرتے تھے۔ میر حسن مہینے میں ایک آدھ مرتبہ واپس آتے تھے اور عموماً پیدل ہی آجاتے تھے۔ راستے میں منزلیں مقرر کر رکھی تھیں جہاں بیٹھ کر سستا لیتے تھے۔

اسکاچ مشن کی ملازمت نے اُن کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کو اظہار کا ذریعہ بخش دیا تھا۔ بہت جلد سب نے یہ بات محسوس کرلی کہ وہ دوسرے استادوں سے مختلف ہیں۔

حاکم رائے ایک ہندو طالبعلم تھا، جو مدرسہ چھوڑ چکا تھا۔ میر حسن نے اُسے بُلایا اور اسکول میں داخل ہونے پر آمادہ کیا۔ وہ کچھ ہی عرصہ میں اسکول کے لائق طلبہ میں شمار ہونے لگا۔

دوسری طرف وہ اگر کسی مسلمان طالبعلم کو عیسائیت کی طرف مائل دیکھتے تو اُس پر خاص توجہ دے کر اسلامی عقائد کی طرف واپس لے آتے تھے۔

وزیر آباد سے چار فرلانگ کے فاصلے پر سیّد مٹھا شاہ کا مزار تھا جو داتا گنج بخش کے مریدوں میں سے ہو گزرے تھے۔ سیّد میر حسن اکثر وہاں جا کر فاتحہ پڑھتے تھے۔

27

میر حسن بھی ایک ہی آوارہ گرد تھے۔

غالبؔ کے دیوان میں اُنہیں کوئی ایسی بات نظر آئی (شائد وہی سماج سے بغاوت کی رُوح) کہ اُن سے ملنے کا شوق دل میں سما گیا۔ بس پھر کیا تھا، ایک روز دامن جھاڑ کر اُٹھے اور دہلی روانہ ہو گئے۔ سفر کا کوئی وسیلہ پاس نہیں تھا۔ کہیں گھوڑا ملا تو اُس پر سوار ہوئے، نہ ملا تو پیدل چلتے گئے۔ انگریز کی عملداری تھی، ٹھگوں اور ڈاکوؤں کا خوف باقی نہ رہا تھا۔ غرض شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی سڑک پر اپنے قدموں کے نشان ثبت کرتے اُس شہر میں داخل ہوئے جہاں مغلوں کی عظمت کی قبر ابھی کچی تھی۔ (۷)

۱۸۶۳ء میں جب میر حسن غالبؔ سے ملے تو زمانے کے سب سے بڑے شاعر کی عُمر ۶۶ برس تھی گویا زندگی کے آخری ۶ برس گزار رہا تھا۔ زمانے کی ناقدری، بیماری اور کبھی کبھی شراب نہ ملنا اُس کی ظرافت کا کچھ نہ بگاڑ سکے تھے البتہ جسم لاغر ہو چکا تھا۔ مگر اپنے چوڑے چکلے ڈھانچے، کشیدہ قامت اور زبردست ہاتھ پاؤں کے ساتھ وہ اِس حال میں بھی کوئی نووارد تورانی معلوم ہوتا تھا۔

میر حسن غالبؔ کے سامنے کھڑے تھے۔

۱۹ برس کی عمر میں وہ یہ نہیں جان سکتے تھے کہ آگے چل کر وہ خود اُس کے اُستاد بنیں گے جس سے ملنے لوگ یونہی دور دور سے آیا کریں گے۔ اور نہ غالبؔ کو یہ معلوم تھا کہ اُردو کے گیسواُن کے بعد جس کے شانے پر بکھریں گے اُس عاشقِ صادق کو عشق کا پہلا سبق یہی لڑکا سکھائے گا جو ابھی اُن کے سامنے کھڑا ہے

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غالبؔ کو میر حسن کی صاف اُردو سُن کر خوشی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو مگر اُنہوں نے یہ بات ضرور دلچسپی سے سنی ہو گی کہ میر حسن سیّد زادے ہو کر مشن اسکول میں پڑھاتے ہیں

کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

بات برائے بیت نہ تھی۔ مرزا غالب غدر سے پہلے ہی سے کہہ رہے تھے کہ انگریزوں کو دیکھو اور اُن کے آئینِ جہاں بانی سیکھو۔ اُن سے بیس سال چھوٹا ایک عزیز دوست سید احمد اِس بات پر اُن سے ناراض بھی ہوا تھا۔ معلوم نہیں غالبؔ نے میر حسن کو اُس دوست کا قصہ سنایا، یا نہیں، مگر تقدیر نے شائد اُسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ دس سال بعد میر حسن کو غالبؔ کے عزیز دوست سے اُس وقت ملوائے گی جب وہ شاعر کی دکھائی ہُوئی راہ اختیار کر کے علی گڑھ تحریک کی بُنیاد ڈال رہا ہو گا۔

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مِرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مِرے آگے
اِک کھیل ہے اورنگِ سُلیماں مِرے نزدیک
اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مِرے آگے
مت پُوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تُو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مِرے آگے
ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالبؔ کو بُرا کیوں۔ کہو اچھا مِرے آگے

28

قادیان (ضلع گورداس پور) سے ایک صاحب آکر کشمیری محلّے میں شیخ نُور محمد کے پڑوس میں آباد ہوئے۔ اُنتیس برس عُمر تھی اور ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم تھے مگر دینی علوم سے دلچسپی تھی۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ بند کمرے میں دِیا جلا کر عملیات بھی کرتے ہیں۔

یہ مرزا غلام احمد تھے۔

ایک روایت کے مطابق نُور محمد کی اِن سے خاص دوستی ہوگئی۔

میر حسن جب وزیرآباد سے سیالکوٹ آتے تو اُن کی بھی مرزا غلام احمد سے ملاقات ہوتی۔ ایک طرح سے راہ ورسم بھی پیدا ہوئی مگر انہیں مرزا صاحب سے کوئی خاص اُنس پیدا نہ ہو سکا۔

29

سردیوں کی اندھیری رات تھی۔ میر حسن اور اُن کے دوست اللہ داد یکّے پر بیٹھے وزیرآباد تحصیل کے کسی گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ اچانک اللہ داد نے یکّہ رکوایا، نیچے اُتر کر زمین سُونگھی اور اعلان کیا کہ گاؤں آگیا ہے، کسی کو آواز دو۔

یہ لوگ اِس گاؤں میں سائیں کیسر شاہ سے ملنے آئے تھے جن کے اللہ داد بہت معتقد تھے۔ اگلی صبح سائیں صاحب نے پوچھا۔ ''اللہ داد کیا کھاؤ گے؟'' اللہ داد نے گھیا توری کی فرمائش کردی حالانکہ یہ موسم

نہ تھا۔ سائیں صاحب نے کہا۔ ''اچھا، چل کر دیکھتے ہیں۔'' اور گئے تو کھیت میں گھیا توری نظر آ گئی۔

سائیں صاحب کی اکثر باتیں عجیب ہُوا کرتی تھیں۔ ایک سُور پال رکھا تھا جس کی وجہ سے علاقے کے مولوی صاحبان پہلے پہل ناراض بھی ہوئے تھے۔

میر حسن نہ جانے کیا سوچ کر ایک دفعہ کسی حافظ صاحب کو اِن کے پاس لے آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک مُرید نے آکر سائیں کے سامنے سجدہ کر دیا۔ حافظ صاحب کو اپنا اسلام یاد آیا تو سائیں صاحب نے کہا۔

''مولوی صاحب! آپ حیران نہ ہوں۔ جیسے یہ لوگ ہیں، اِن کا خدا بھی میرے جیسا ہوتا ہے۔'' (۸)

ایک دیوان صاحب عُمر بھر کی کمائی اپنے لڑکے کی شادی پر لُٹا کر سائیں کے پاس آئے اور اپنے نام و نمود کا نقشہ اُتارنا شروع کیا۔ اِتنے میں کھانے کا وقت ہُوا اور سائیں صاحب نے دیوان سے کہا۔

''ذرا بازار سے جا کر ایک مُولی تو لے آؤ۔ ہمیں یہی سالن کا کام دے گی۔''

دیوان صاحب کی جیب میں اُس وقت کوئی پیسہ نہیں تھا۔ اُن کی پریشانی دیکھتے ہُوئے سائیں نے کہا۔ ''بیٹے کی شادی پر تم نے جو نام و نمود حاصل کیا ہے وہ دے کر ایک مُولی لے آؤ۔''

دیوان صاحب نے معذوری ظاہر کی تو سائیں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''بھائی! جس نمود و نمائش کی قیمت ایک مُولی بھی نہیں پڑتی اُس کے حصول سے فائدہ ہی کیا؟'' (۹)

30

میر حسن کی شیخ نور محمد سے دوستی ہوگئی تھی۔ میر حسن کی عادت تھی کہ ہمیشہ لوگوں کو اُن کے صحیح نام سے پُکارتے تھے لہٰذا سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ شیخ نور محمد کو بھی دوسروں کی طرح نتھو پکارنے کی بجائے نُور محمد یا شیخ صاحب ہی کہتے ہوں گے۔

شیخ نُور محمد نے تعلیم حاصل نہ کی تھی مگر حروف کی پہچان رکھتے تھے۔ دوستوں کی محفلوں میں جو کُچھ سُنا تھا اُس پر ہمیشہ غور کرنے کی عادت سے تصوف کے مسائل پر رائے دینے کے اہل بھی ہو گئے تھے۔ میر حسن نے اُنہیں ''اَن پڑھ فلسفی'' کا خطاب دے دیا، جس کی وجہ سے ہم چشموں میں اُن کا اعتبار اور

بڑھ گیا۔

ان دونوں کی دوستی کا آغاز کب ہُوا، یہ معلوم نہیں۔ مگر یہ ضرور معلوم ہے کہ ایک وقت آیا جب یہ دونوں ہر کام باہمی مشورے سے کرنے لگے۔

31

اس دفعہ نور محمد اور امام بی بی کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ فاطمہ بی نام رکھا گیا۔

32

۱۸۶۸ء میں حکومت نے ضلع اسکول بھی اسکاچ مشن کی تحویل میں دے دیا۔ اسکاچ مشن اب ایک معتبر ادارہ بن چکا تھا اور پھیل رہا تھا۔ مگر مشرقی مضامین کا شعبہ بہت پیچھے تھا۔ ۱۸۶۸ء میں اسکاچ مشن سیالکوٹ نے میر حسن کو وزیر آباد سے بلوالیا کیونکہ اُن کی موجودگی سے ادارے میں عربی اور فارسی کی تعلیم کا معیار بلند ہونے کی توقع تھی۔ بیس رُوپے تنخواہ مقرر رہوئی۔

33

سیالکوٹ کے ڈپٹی وزیر علی بلگرامی، جو ۱۸۶۵ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بن کر آئے تھے، اِس لحاظ سے ذرا مختلف تھے کہ سیّد تھے اور درویش طبعیت کے آدمی تھے۔ شیخ نُور محمد سے دوستی ہوئی تو سنگر سلائی مشین خریدی اور نُور محمد کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا تاکہ ایک شخص ہمہ اوست کے قصّے سننے کے لئے ہر وقت موجود ہوا کرے۔ نور محمد کے دل میں خیال آیا کہ یہ روزی حلال نہیں کیونکہ بغیر محنت کئے حاصل ہو رہی ہے۔ ڈپٹی صاحب نے سُنا تو کام چھوڑنے کی اجازت دے دی اور سلائی مشین بھی ان کے حوالے کر دی کہ اب وہ بھلا اور کس کام کی!

سیالکوٹ والوں کے لئے یہ مشین عجوبے سے کم نہ تھی۔ نور محمد کا مکان اِس کی زیارت کرنے والوں سے آباد رہنے لگا۔ اِس دوران شائد اُن میں چھپا ہوا تخلیقی رجحان اُبھر آیا، اور اُنہوں نے ایک نئی قسم کی ٹوپی ایجاد کر ڈالی۔ عورتیں اِسے بُرقعے کا حصّہ بنا سکتی تھیں اور مرد اپنے سروں پر رکھ کے گھر سے باہر نکل سکتے تھے۔

یہ کاروبار چل نکلا اور ''نتھُو ٹوپیاں والے'' سیالکوٹ کی مشہور شخصیت بن گئے۔ عورتوں میں اُن کا گھرانہ ''ٹوپیاں والاں دا گھرانہ'' کہلانے لگا۔

34

مرزا غلام احمد ۱۸۶۸ء میں سیالکوٹ سے چلے گئے۔

35

۶ ستمبر ۱۸۷۰ء کو امام بی بی اور نور محمد کے یہاں ایک اور لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام طالع بی رکھا گیا۔

36

شیخ غلام محمد کے یہاں ایک بیٹی تھی، گلاب بی۔ جب وہ اپنے بھائی نور محمد کے لڑکے عطا کو دیکھتے تو اُنہیں اور اُن کی بیوی کو خواہش ہوتی کہ اُن کے یہاں بھی لڑکا ہوتا۔ شائد اِسی وجہ سے اُنہیں عطا محمد سے بڑی محبت تھی۔ ایک دفعہ نور محمد نے عطا محمد کو کافی عرصہ کے لیے اُن کے پاس رہنے بھیج دیا۔

37

غلام محمد کی بیوی نے ایک دفعہ پھر لڑکی کو جنم دیا تھا۔ امام بی بی کے یہاں ایک اور لڑکا ہُوا تھا۔ اُنہوں نے دیورانی کو اپنا لڑکا دے دیا اور اُن کی لڑکی لے لی۔ اُس کا نام مہتاب رکھا گیا۔

38

''اپنی مشرقی مضامین کی جماعتوں پر ہمیں جو فخر ہے وہ میرے خیال میں بالکل جائز ہے۔'' اسکاچ مشن کے سیکرٹری جے پی لینگ نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔ ''آج تک میں نے جتنے بھی اُستاد دیکھے ہیں۔ وہ اُن میں سب سے بہتر اور اپنے پیشے سے زیادہ گہری شخصیت رکھنے والا اُستاد ہے۔ عربی فلسفہ اور فارسی شاعری کے لیے جو بے پناہ جوش اُس میں ہے اُسے طالبعلم میں منتقل ہوتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔''

۱۸۷۳ء میں میر حسن ہیڈ اورینٹل ٹیچر کے عُہدے پر ترقی کر چکے تھے۔ اُن کی تنخواہ اب پچیس

روپے ماہانہ تھی۔

39

دیورانی کی گود میں چندروز زندہ رہنے کے بعد لڑکا مر گیا۔ امام بی بی نے اُنہیں لڑکی واپس کر دی۔

40

میر حسن نے یہ خبر نہایت دلچسپی سے سُنی ہو گی کہ سر سیّد احمد خاں لاہور آنے والے ہیں۔
سر سیّد کے ۱۸۷۳ء کے دورۂ پنجاب میں میر حسن کی اُن سے ملاقات ہوئی۔ میر حسن اُنتیس (۲۹) برس کے تھے۔ سر سیّد کی عُمر چھپن (۵۶) سال تھی۔ مُلاقات کی کوئی تفصیل معلوم نہیں مگر اندازہ ہوتا ہے کہ میر حسن کو جس رہنما کی تلاش تھی وہ اُنہیں مل گیا۔ سر سیّد احمد خاں وہی مقصد لے کر اُٹھے تھے جِسے حاصل کرنے میں اُن کا ہم نام تیس پینتیس برس پہلے ناکام ہو چُکا تھا۔ مگر اِن کی تحریک اور اُس تحریک میں دو بنیادی فرق تھے۔ پہلا یہ تھا کہ تلوار کی جگہ تعلیم کو ہتھیار بنایا گیا تھا۔ دوسرا فرق زیادہ گہرا تھا۔ اُن کی علمی تحریک، اسلامی فِکر کو جدید خیالات سے ہم آہنگ کرنے میں وہی کام کر رہی تھی، جسے ہندو طبقے میں بہت پہلے رام موہن رائے شروع کر چکے تھے۔
''ہماری قوم کے لئے ہماری قوم میں تعلیم و تربیت کا کُچھ بھی سامان ہندوستان میں موجود نہیں ہے۔'' سر سیّد نے لاہور میں لیکچر دیتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے چھوٹے مکتب جو لوگوں نے تھوڑے ماہواری یا ششماہی چندہ سے قائم کیے ہیں۔ جن میں ایک بے ترتیب اور غیر مفید تعلیم ہوتی ہے اور بوڑھے شخص اس میں کافیہ اور مُنیہ قدوری پڑھتے ہیں اور مسجدوں میں سے یا لوگوں کے گھروں میں سے روٹی پاتے ہیں۔ کیا یہ سامان ہماری قومی تعلیم و تربیت و قومی عزت کے لئے کافی ہیں؟
''میں قبول کرتا ہوں کہ جس قدر (دینی علوم) پڑھائے جاتے ہیں وہ فائدے سے خالی نہیں مگر اور دُنیاوی علوم جو ہماری زندگی کے لئے مثل غذا کے ضروری ہیں۔ اُن کا کیا بندوبست ہے اور اُن کی کیا تعلیم ہے؟'' (۱۰)

41

انبالے میں ہیضے کی وبا پھوٹ نکلی۔

غلام محمد تو بیمار ہُوئے ہی، محمد رفیق بھی، جو اُن سے ملنے آئے ہُوئے تھے، بستر کے ہو گئے۔

دونوں میں سے کوئی نہ بچ سکا۔

خاندانی روایت نے بڑے بھائی سے پہلے چھوٹے بھائی کا جنازہ طلب کر لیا تھا۔

نُور محمد کو خبر ہُوئی تو وہ رو پڑ چلے آئے۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ باپ اور بھائی کے اکٹھے جنازوں میں شرکت کرنے کے مقابلے میں اُنہوں نے وبا کا اندیشہ بھی نہ کیا ہوگا۔

42

کنبے کا دوگنا ہو جانا معمولی بات نہ تھی۔

نُور محمد کے گھر میں اپنی بیوی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا پہلے سے موجود تھے۔ راتوں رات ایک عورت اور دو لڑکیوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ دوسری طرف دو کمانے والے چل بسے تھے اور یہ سارا بوجھ اُن کندھوں پر آ گیا تھا، جس پر وہ اُس رومال کے سوا کوئی اور بوجھ برداشت کرنے کے شوقین نہیں تھے، جسے گھر سے نکلتے ہوئے وہ عادتاً ڈال لیتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ٹوپیاں بنانے سے جو کاروبار چمکا تھا، وہ بھی ماند پڑ چکا تھا۔ کیونکہ ایک چیز ایجاد کرنے کے بعد اُس میں دلچسپی برقرار رکھنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔

عطا محمد نے کوئی خاص تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور روپے پیسے کے معاملے میں بھی وہ محتاط نہ تھے۔ اگر یہ واقعہ ۱۸۷۳ء ہی کا ہے تو پھر وہ یُوں بھی تیرہ چودہ برس کے رہے ہوں گے۔

شائد اِسی موقع پر ٹوپیوں والوں کے گھرانے کی عورتوں نے کاروباری سرگرمی میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ گھر کے دوسرے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد عورتیں اور بچیاں ازار بند بُننے بیٹھ جاتی تھیں اور رات گئے تک اِس کام میں مصروف رہتی تھیں۔ یہ ازار بند نور محمد اپنی دکان پر بیچ دیتے تھے۔

43

میر حسن کی بڑی بہن جنہیں خاندان والے ''بزرگ بی بی'' کہتے تھے، سخت بیمار تھیں۔ وہ عُمر میں اِن سے بہت بڑی تھیں اور یہ اُن سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔

بزرگ بی بی ایک روز کہنے لگیں۔

''میں مر جاؤں گی اور قبر میں اکیلی رہوں گی۔کوئی دُعا کے لئے بھی وہاں نہیں جائے گا۔''

میر حسن نے کہا۔

''میں عہد کرتا ہوں کہ جب تک مُجھ میں چلنے بھرنے کی طاقت رہے گی، روزانہ تُمہاری قبر پر آؤں گا۔''

۷ دسمبر ۱۸۷۶ء کو بزرگ بی بی فوت ہو گئیں۔

44

میر حسن کے چچا سیّد فیض اللہ مرحوم بڑی شہرت کے حکیم تھے۔

اُن کے بیٹے سیّد میر حسام الدین تھے۔ بڑے کھرے مگر سخت مزاج آدمی تھے۔جس بات کی ٹھان لیتے تھے پھر اُس سے مشکل ہی سے ہٹتے۔

۱۸۷۶ء میں انہوں نے اپنے محلے میں مسجد بنائی جس کا نام مسجد حسام الدین رکھا۔

45

۸ جنوری ۱۸۷۷ء کی دوپہر تھی۔

وائسرائے لارڈ لٹن، لیڈی صاحبہ اور اُن کے حاشیہ بردار عالی شان بگھیّوں سے اُترے۔ سر سیّد احمد خاں نے خود اُن کا استقبال کیا اور اُنہیں ہمراہ لے کر شامیانے میں داخل ہُوئے۔

شامیانے میں بہت سے مسلمان روسا اور معززین موجود تھے۔ وہ سب احتراما کھڑے ہو گئے۔

آج ایک عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا. سر سیّد اِس موقعہ پر میر حسن کو دعوت نامہ بھیجنا نہیں بھُولے تھے، چنانچہ وہ بھی موجُود تھے۔

سر سیّد کے فرزند بیرسٹر سیّد محمود انگریزی میں خطاب کر رہے تھے۔

''ہندوستان کے محمڈنز (مسلمانوں) کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ ایک کالج قائم ہوا ہے جس کے قیام کی وجہ کسی ایک فرد کی فراخ دلی یا علم دوستی نہیں، کسی بادشاہ کی شاہانہ مہربانی نہیں بلکہ ایک پوری برادری کی مشترکہ خواہشات اور متحدہ کاوشیں ہیں۔ اس کی بُنیاد بعض ایسے اسباب پر ہے جو اِس ملک کی

تاریخ میں پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔

''ہندوستان پر برطانوی حکومت وہ سب سے اچھی چیز ہے جو اس دُنیا نے آج تک دیکھی ہے۔''

عزت مآب وائسرائے سلامت (جوابی تقریر کرنے کے بعد) شامیانے کے اختتام تک تشریف لے گئے اور رسمی طور پر سنگِ بنیاد رکھا جسے مسٹر نوایز، ایگزیکٹیو انجینئر کی نگرانی میں اُس کے صحیح مقام پر اُتارا گیا تھا۔ بُنیاد کے ایک خلاء میں ایک بوتل رکھی گئی جس میں خطوط اور سکّے ڈالے گئے تھے اور ان سب کے اوپر دھات کی ایک پلیٹ رکھ دی گئی جس پر مناسب عبارت کندہ تھی۔ جب یہ ثابت ہو چکا کہ پتھر ٹھیک طرح سے رکھا گیا ہے تو جناب وائسرائے نے اِسے تین مرتبہ لکڑی کی ہتھوڑی سے بجایا اور فرمایا ''میں اس پتھر کو خوب درست طریقے سے رکھا ہوا قرار دیتا ہوں۔'' (۱۱)

46

رات کے کھانے پر سرسیّد نے وائسرائے کے ساتھ کوئی ساٹھ مہمانوں کو دعوت دی تھی جن میں مسلمانوں اور انگریز تقریباً برابر تعداد میں شامل تھے۔ کھانے کا اہتمام خالص انگریزی طرز پر کیا گیا تھا۔ سرسیّد نے میر حسن سے شریک ہونے کے لئے کہا تو اُنہوں نے معذرت پیش کر دی۔ ''میں ایسی دعوتوں میں نہیں جا سکتا۔''

سرسیّد نے دعوت سے پہلے اُن کے کھانے کا علیٰحدہ انتظام کر دیا۔

''علی گڑھ میں سرسیّد کے مکان پر ہم بھی قیام رکھتے تھے اور اتفاقاً ایک ہی کمرے میں شب باش تھے۔'' میر حسن کا بیان ہے۔ ''آدھی رات کو جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ سرسیّد اپنے پلنگ پر موجود نہ تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھا، نظر نہ آئے۔ آخر دیکھا کہ برآمدے کے ایک گوشے میں اندھیرے میں ٹہل رہے تھے اور رو رہے تھے۔ دریافت کیا تو... جواب دیا۔ 'قوم کی خستہ حالت پر غور کرتے ہوئے کوئی... مؤثر نسخہ نظر نہیں آتا... رو رہا ہوں کہ یا اللہ! اس ہندوستانی قوم کا ہندوستان میں کیا انجام ہوگا۔ صرف تیری رحمت کا آسرا ہے... مولوی صاحب! آپ بھی میرے ساتھ شامل ہو جایئے۔''' (۱۲)

47

اُس چرچ میں جو ہنٹر صاحب کی یاد میں قائم کیا گیا تھا، ۲۷ فروری ۱۸۷۷ء کو اسکاچ مشن اسکول کا

ایک طالبعلم امام الدّین عیسائی ہوگیا۔

''اُس کا باپ شہر میں سب سے بڑا محمڈن صراف ہے' اور بہت مالدار بتایا جاتا ہے۔'' پادری ہار پر نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔''...اِس خبر نے سارے شہر کو ہلا کر رکھ دیا۔ اگلے روز صبح ہی صبح اُس کے بھائیوں میں سے تین اُس سے بات کرنے پہنچ گئے اور اس کے بعد جو منظر پیش آیا، اُسے بآسانی بیان نہیں کیا جاسکتا۔

''جیسے ہی وہ نمودار ہوا ایک بھائی کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ بڑے بھائی نے، جو اُس کے باپ کی نمائندگی کررہا تھا' اُس سے بحث کی۔ اُس نے اُسے منہ مانگے روپے کی پیشکش کی اور بدکاری کی کھلی اجازت دے دی... جب ہر حیلہ ناکام ہُوا تو بڑے بھائی نے مُٹھی بھر خاک اُٹھائی اور اُس پر ڈال دی، جو گویا تدفین کی علامت تھی۔ اور کہا کہ اس کے بعد وہ اُن کے لئے اور اپنے خاندان کے لئے مُردہ ہے۔ اِس پر ایک اور بھائی جو تمام وقت اُونچی آواز میں روتا رہا تھا، ایک ناقابلِ برداشت جوش سے مجبور ہوکر آگے بڑھا اور اُسے قتل کردینا چاہا۔ تاہم مَیں نوجوان کو وہاں سے ہٹا کر ایک طرف لے گیا...''

شہر کے مسلمانوں کے ایک گروہ نے ڈپٹی وزیر علیؔ کے ساتھ مل کر فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسا اسکول کھولنا چاہیے جو مشنریوں کے اثرات سے پاک ہو۔ دس سال تک اس فیصلے پر عمل نہ ہوسکا۔

اُسی مہینے ایک ہندو طالبعلم عیسائی ہوا اور ہندوؤں نے فوراً اپنا علیحدہ اسکول کھول لیا۔

48

میر حسن کے ایک ہندو دوست بھیم سین وکیل تھے۔ میر حسن اِن کے ساتھ اکثر شطرنج کھیلتے تھے۔

۱۸۷۷ء میں مرزا غلام احمد دوبارہ سیالکوٹ آئے اور بھیم سین کے مکان پر ٹھہرے۔ حکیم حسام الدّین کو ان سے عقیدت ہوگئی تھی اور انہوں نے ایک روز مرزا صاحب کو دعوت دے کر اپنے گھر بھی بُلایا۔

سیالکوٹ کے مسلمانوں میں مشنریوں کے خلاف غم و غصّے کا زمانہ تھا۔ مرزا صاحب نے مشنریوں سے مناظرے کا اعلان کیا تو بہت لوگ اُن کے ہمدرد ہوگئے۔

مناظرے میں کسی کو حَکم بنانا تھا۔ ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جس پر عیسائی اور مُسلمان دونوں بھروسہ کرتے ہوں۔

ایسی شخصیت میر حسن تھے۔

49

''میں نے دیکھا ایک بڑے میدان میں بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔'' نور محمد نے بتایا۔'' فضا میں ایک نہایت خوبصورت رنگا رنگ پروں والا پرندہ اُڑ رہا ہے۔ اُس کی دل کشی و دل فریبی کا یہ عالم ہے کہ لوگ دیوانہ وار اپنے بازو اُٹھا اُٹھا کر اُس کو حاصل کرنے کے لئے جدو جہد کر رہے ہیں۔ آخر وہ سراپا جمال پرندہ ایک دم فضا سے اُترا اور میری گود میں آن گرا۔''

امام بی بی اُن دنوں پھر اُمید سے تھیں۔ نُور محمد کے ذہن میں اپنے خواب کی جو تعبیر آئی' وہ یہ تھی۔

''میرے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوگا جو خدمتِ اسلام میں ناموری حاصل کرے گا۔'' (۱۳)

50

لڑکا جُمعے کے دن پیدا ہوا۔

اُس روز ۳ ذی قعد تھی...۱۲۹۴ ہجری۔ انگریزی تاریخ ۹ نومبر تھی (۱۴)۔

محمد اقبال!

یہ نام نہیں معلوم امام بی بی کے اَن پڑھ ذہن میں آیا تھا یا شیخ نُور محمد کے بے پڑھے فلسفی ذہن میں۔ یا پھر کسی نے تجویز کیا تھا (۱۵)۔

51

''زمانہ کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پُرانی شاعری سے دل بیزار ہو گیا تھا...قوم کے ایک سچّے خیر خواہ نے آ کر غیرت دلائی کہ...قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چُکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پُکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دُہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ اُمرأ جو قوم کو بہت کُچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پروا ہیں۔ عُلمأ جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کُچھ بن آئے تو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں جس کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کُچھ لکھ چکے

ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے قوم کے بیدار کرنے کے لئے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔''

الطاف حسین حالی

دیباچہ مسدس مدوجزر اسلام

۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء)

52

''مخدومی مکرمی۔

''جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہُوئی ہاتھ سے نہ چھوڑی اور جب ختم ہُوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی... حق ہے۔ جو بات، دل سے نکلتی ہے وہ دل میں بیٹھتی ہے۔ بے شک مَیں اس کا محرک ہُوں اور اِس کو میں اپنے اُن اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خُدا پُوچھے گا کہ تُو کیا لایا۔ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدّس لکھوا کر لایا ہوں۔

سیّد احمد

علی گڑھ''

53

جونک مشرقی طِبّ میں ایک خاص مقام رکھتی تھی۔ اِس کی مدد سے جسم کا فاسد لہُو خارج کیا جا سکتا تھا۔

ٹھیک اُنہی دنوں جب مسدسِ حالی کے اولین نسخے کتب فروشوں کے پاس پہنچ رہے تھے، دوسالہ اقبال کے گھر والوں نے اُنہیں جونکیں لگوائیں جنھوں نے داہنی آنکھ کے قریب سے کُچھ خون چُوس لیا۔ اُس وقت شائد کسی کو یہ بات معلوم نہ ہوسکی ہو کہ ضرورت سے کُچھ زیادہ خون نکل گیا ہے اور اِس کی وجہ سے بچہ اپنی داہنی آنکھ کی بینائی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا ہے۔ (۱۶)

باب ۲

ماں کی آغوش کی وسعت

۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۳ء

1

''مجھے اپنے ہوش میں مطلق یاد نہیں کہ میری (داہنی) آنکھ کبھی ٹھیک تھی بھی یا نہیں...تاہم میں نے اس آنکھ کی کمی کبھی محسوس نہیں کی۔ایک آنکھ سے دن کو تارے دیکھ لیا کرتا تھا!'' اقبال نے کہا۔(۱)

2

سب سے اہم علامت نُور تھی۔

میاں جی (باپ) کا نام نُور محمد تھا۔

بے جی (ماں) کہتی تھیں کہ اُن کی موجودگی میں بے چراغ کمرے میں تاریک شب میں عجیب قسم کا نُور ظاہر ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سُورج نکل آیا ہو۔(۲)

3

بہن پیدا ہوئی۔کریم بی نام رکھا گیا۔یہ تین برس کے تھے۔

''میرے والد ایک روز گھر آ رہے تھے،'' اقبال نے کہا۔ ''ہاتھ میں رومال تھا... رومال میں تھوڑی سی مٹھائی... کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کتا بھوک کے مارے دم توڑ رہا ہے... مٹھائی سمیت رومال اُس کے آگے ڈال دیا... اُسے کسی نہ کسی طرح پانی بھی پلا دیا... رات کو سوئے تو خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مکان ہے جس میں مٹھائی کے طبق ہی طبق رکھے ہیں... صبح آنکھ کھلی تو اِس احساس کے ساتھ کہ... ہمارے دن پھرنے والے ہیں...'' (۳)

''(ہمارے والد کے دادا یا پڑدادا شیخ اکبر نے سادات کے جس خاندان کی خدمت کی)... اُسی خاندان کا ایک فرد والد ماجد کے پاس آیا اور کہنے لگا آپ دُھسوں کی تجارت کیوں نہیں کرتے؟... کافی روپیہ جمع ہوگیا۔ بس یہ ابتدا تھی ہمارے دِن پھرنے کی''

4

عطا محمد اکیس برس کے ہو چکے تھے۔

''بڑے جابر آدمی تھے'' ۔ ایک رشتہ دار نے بتایا۔ ''ایک دفعہ بازی بد کر تاش کھیل رہے تھے کہ پولیس آگئی۔ اِنہوں نے اطمینان سے دروازہ کھولا اور پولیس والے کو دھکا دے کر صاف نکل گئے۔'' (۴)

5

''میری پیدائش کے بعد ۱۸ سال تک والدین کے ہاں کوئی لڑکا پیدا نہ ہُوا سوائے ایک کے جو شیر خواری کے ایّام میں ہی فوت ہوگیا'' ۔ عطا محمد کہتے تھے ''لڑکپن میں ایک چھوٹے بھائی کی کمی شدت سے محسوس کرتا تھا۔ اقبال پیدا ہوا تو مجھے اِس سرخ و سفید گول مٹول بچّے سے بڑی محبت ہوگئی۔'' یہ حقیقت ہے کہ عطا محمد اور اقبال کے باہمی تعلقات میں بھائیوں کی محبت سے زیادہ باپ کی شفقت اور بیٹے کی سعادت مندی کی جھلک نظر آتی تھی۔ (۵)

6

امام بی بی کی چچیری بہن کی شادی عبدالرزّاق راٹھور کے لڑکے خواجہ رحیم بخش سے ہُوئی تھی۔ اُنھوں نے عطا محمد کے لئے عبدالرزّاق کی لڑکی کا رشتہ مانگ لیا۔

شادی کے وقت عطا محمد کی عُمر اکیس (۲۱) برس کے قریب رہی ہوگی۔ اقبال کے ذہن میں اس شادی کے دھندلے نقوش اولین یادوں کی صورت میں باقی رہے ہوں گے کیونکہ وہ خود اُس وقت تین برس کے تھے۔

7

عبدالرزاق نے اپنے اثر و رسوخ سے عطا محمد کو رسالے میں سپاہی بھرتی کروادیا۔
۹ جون ۱۸۸۰ء کو اُن کی ملازمت کا آغاز ہُوا۔ (۶)

8

تین چار برس کی عُمر میں اقبال کے ذہن پر ماں، باپ اور بھائی کے تعلقات کے حوالے سے کیا اثرات مرتب ہوئے ہوں گے، ان کے متعلق ایک دلچسپ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
یہ ظاہر ہے کہ عطا محمد اور اقبال میں سے بڑے بھائی اپنی والدہ پر گئے تھے اور اقبال اپنے والد پر۔ پھر عطا محمد چونکہ عُمر میں بھی اُن سے اٹھارہ سال بڑے تھے اور جب اقبال نے ہوش سنبھالنے کے بعد اُنہیں دیکھا تو وہ نہ صرف اُن کے باپ کی طرح شادی شدہ تھے بلکہ باپ سے بہتر نوکری بھی کر رہے تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ گھر کے مسائل پر بے جی کے ساتھ کافی ذمہ داری کے ساتھ گفتگو کرتے نظر آتے ہوں گے۔ تین چار سال کی عُمر میں بچّہ اپنی ماں کی محبت میں کمی محسوس کرتا ہے اور اُسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اقبال کے لاشعور میں یہ خیال کرم فرما نظر آتا ہے کہ یہ محبت اُن کے بھائی کو اُن سے زیادہ ملی ہے۔
بعد میں اقبال نے ایک ایسے حُسن کا تصور پیش کیا جس کی طرف بڑھ کر عشق خود حسین ہوجاتا ہے۔ نیز اُن کے تصورِ حُسن میں جو طاقت اور رُعب کا امتزاج نظر آتا ہے اُس کی داغ بیل بہت ممکن ہے کہ اُس روز پڑ گئی ہو جب قابلِ محبت بے جی نے ہاتھ میں ڈنڈا لے کر پہلی دفعہ اُن کی پٹائی کی ہوگی۔
بچّہ عام طور پر اپنی ماں کی محبت حاصل کرنے کے لئے خود کو اپنے باپ کے ساتھ شناخت کرنے لگتا ہے مگر اقبال کے سامنے اپنے باپ کے علاوہ بڑا بھائی بھی تقریباً باپ کے کردار ہی میں موجود تھا۔ اگر اُنہوں نے اپنے آپ کو ان دونوں سے شناخت کیا تو پھر اُن کے وجود میں جو بے خودی اور کیف و مستی کی

خودی اور قوتِ عمل کے ساتھ ایک مستقل کشمکش نظر آتی ہے اُس کی وجہ بھی سمجھی جا سکتی ہے۔ بے خودی اور کیف و مستی کی وجہ نور محمد تھے اور قوتِ عمل اور طاقت کی عطا محمد۔ اقبال لاشعوری طور پر یہ دونوں آئیڈیل حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ اُس حسن کو متوجہ کر سکیں جو ماں کی صورت میں اُن کے سامنے موجود تھا۔ یہ حُسن مہربان بھی تھا اور قاہر بھی، اور خُدا ترسی کے ساتھ ساتھ دُنیاوی عزّت و حیثیت کو ایک خاص اہمیت دیتا تھا۔

''میرے لیے دنیا کے معاملات میں دلچسپی لینا اور دنیا میں بڑھنے کی خواہش کرنا صرف (والدہ) کے دم سے وابستہ تھا۔'' بڑے ہو کر اقبال نے کہا۔(۷)

9

سرسیّد کی تفسیرِ قرآن کی پہلی جلد ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی۔ غالباً سیّد میر حسن سب سے پہلے خریدنے والوں میں رہے ہونگے۔

10

اور اُسی برس مرزا غلام احمد نے قادیان سے اپنی کتاب براہین احمدیہ کی پہلی جلد شائع کی۔ اس میں اسلام کی سچائی کے ثبوت پیش کیے گئے تھے مگر یہ دعویٰ موجود تھا کہ مصنف کو الہام ہوتا ہے۔

11

''والد مکرّم مجھے (صرف) علوم دین پڑھانا چاہتے تھے۔'' اقبال نے کہا۔

میر حسن کے چچا فیض اللہ کی بیٹی یعنی حکیم حسام الدین کی بہن مہتاب بی بی، مولوی عُمر شاہ سے بیاہی ہُوئی تھیں جو اُن کے تایا کے بیٹے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے حکیم حسامُ الدّین نے جو مسجد تعمیر کروائی تھی وہیں یہ عمر شاہ لڑکوں اور لڑکیوں کو قرآن مجید ناظرہ پڑھاتے تھے۔

غالباً ۱۸۸۲ء کے اوائل میں نور محمد نے اقبال کو مولوی عمر شاہ کے مکتب میں لیجا کر بٹھا دیا۔(۸)

مگر اصل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی تعلیم تو سیّد میر حسن بھی دیتے تھے۔ اور جبکہ وہ اور نور محمد ایسے گہرے دوست تھے کہ نُور محمد بغیر اُن کے مشورے کے کوئی کام نہیں کرتے تھے تو پھر نُور محمد نے اپنے بیٹے کو پہلے ہی میر حسن کے مکتب میں کیوں نہ داخل کروا دیا؟

اِس کا یہی جواب درست سمجھ میں آتا ہے کہ نُور محمد صُوفی تھے۔ اپنے بیٹے کو، جسے اسلام کی یا دوسرے الفاظ میں تصوّف کی خدمت کرنی تھی، وہ ایک ایسے شخص کے حوالے نہیں کر سکتے تھے جو سر سیّد احمد جیسے کُھلے وہابی اور نیچری کی تقلید کرتا ہو۔

12

جس روز اقبال نے قاعدے میں پہلے الف پر اُنگلی رکھی ہو گی اُن کی زندگی میں وہ دن اُتنا ہی اہم رہا ہو گا جتنا کائنات کی تاریخ میں وہ دن جب سُورج وجود میں آیا تھا۔ یا وہ دن جب ایک زبردست بھونچال کے ساتھ زمین کے سپاٹ سینے پر ہمالیہ پہاڑ نمودار ہوا تھا۔ عقل کے ساتھ وہ مضبوط تعلق جِسے اقبال کبھی نہ توڑ سکے، علم کی شراب کا وہ نشہ جو کبھی اُن کے سر سے اُتر نہیں سکا، اور کتابوں کے اوراق سے وہ محبت جس نے بالآخر اُنہیں دُنیا کے کسی کام کے لائق نہ رکھا، سب اُسی پہلے الف کے ساتھ شروع ہوئی تھیں جو اقبال نے اُس وقت سیکھا تھا جب اُن کی عمر شائد چار سال چار ماہ رہی ہو گی۔

''اقبال بڑا شریر تھا،'' اُن کی ہم سبق کرم بی بی کا بیان ہے۔ ''طرح طرح کی شرارتیں کرتا۔ خود ہنستا، ہمیں ہنساتا۔ پڑھنے لکھنے میں بلا کا تیز۔ معلوم ہوتا تھا اُسے پہلے ہی سے سب کچھ یاد ہے۔''

ایک روز اقبال نے غلط کو ''غلت'' لکھ دیا۔ اُستاد نے کہا، اِسے صحیح کر دو۔ اقبال نے جواب دیا۔ ''غلط تو غلط ہی رہے گا۔'' (۹)

13

عبدالرزّاق راٹھور اپنے داماد کو خوش حال دیکھنا چاہتے ہوں گے۔

اُسی برس عطا محمد نقشہ نویسی کی ٹریننگ کے لئے منتخب ہو گئے۔ ماں، باپ، بھائی، بہنوں اور بیوی سے رُخصت ہو کر وہ روانہ ہوئے تاکہ رُڑکی میں واقع تھامسن کالج سے نقشہ نویسی کی سند حاصل کریں اور ترقی پائیں۔

14

۱۸۸۲ء میں سر ولیم ہنٹر نے اپنی تعلیمی رپورٹ شائع کی۔ سر سیّد احمد خان پہلے دیسی زبان کو ذریعۂ

تعلیم بنانے کے حق میں رہے تھے مگر اب اُن کے خیالات میں انقلاب آیا اور اُنہوں نے کہا کہ اگر مسلمانوں کو ترقی کرنی ہے تو اُنہیں انگریزی میں تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔

شائد یہی موقع رہا ہو جب مولوی میر حسن نے انگریزی سیکھنے کی کوشش کا آغاز کیا۔ اگرچہ اُن کی عمر چالیس کے قریب تھی، مگر اُن کے باطن کا طالبعلم ابھی جوان تھا۔

15

نور محمد کے گھر میں ابنِ عربی کی فُصُوصُ الحِکَم کے درس شروع ہوئے (۱۰):

''بعد حمد و ثناٗ کے معلوم ہو کہ میں نے رسول اللہؐ کو محروسۂ دمشق میں خواب میں دیکھا۔ اور یہ خواب ۶۲۷ھ کو اخیر عشرۂ محرّم میں دکھلایا گیا۔

''آنحضرتؐ کے دستِ مبارک میں ایک کتاب تھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ فُصُوصُ الحِکَم ہے۔ تُم اِس کو لے کر لوگوں کے پاس جاؤ... پس میں نے نیّت کو خالص کر کے اس کتاب کو بغیر کمی اور بیشی کے ظاہر کرنے کا ارادہ اور ہمّت باندھی... اور میں نے اللہ سے چاہا کہ مجھ کو اُن سب چیزوں میں جن کو میری اُنگلیاں لکھتی ہیں اور میری زبان بیان کرتی ہے اور میرا دل ان پر محتوی ہے، اپنی طرف سے القأ سبوحی... عطا کرے تاکہ میں ترجمہ کرنے والا بنوں نہ کہ اپنی طرف سے لکھنے والا۔ مَیں اُمید کرتا ہوں کہ مَیں اِس کتاب میں وہی لکھ رہا ہوں جو مجھ پر خدا کی طرف سے القا کیا گیا ہے۔''

(ابن عربی: فُصُوصُ الحِکَم)

16

۱۸۸۳ء میں عمر شاہ نے پڑھانا بند کر دیا۔

نور محمد اقبال کو لے کر شوالہ تیجہ سِنگھ کی مسجد چلے آئے جہاں مَولوی غُلام حَسن پڑھاتے تھے۔ (۱۱)

نور محمد نے اقبال کو اسکاچ مشن اسکول کی پہلی کچی جماعت میں داخل کروایا یا نہیں، اس کے بارے میں شواہد خاموش ہیں۔ مگر معلوم یہی ہوتا ہے کہ بڑے لڑکے کے فوج میں بھرتی ہونے کے بعد نُور محمد اپنے گھرانے کی مادّی ضروریات کے بارے میں مطمئن ہو چکے تھے اور چھوٹے لڑکے کو اپنے خواب کی تکمیل کے لئے وقف کرنا چاہتے تھے۔ ممکن ہے اِس موقع پر امام بی نے اُن سے اختلاف بھی کیا ہو اور کہا ہو کہ

اقبال ذہین ہے اِس لئے اُسے دُنیاوی تعلیم دلوانی چاہیئے۔

17

نوُر محمد کے گھر ایک اور لڑکی پیدا ہوئی۔ اُس کا نام زینب بی رکھا گیا۔ یہ اُن کی آخری اولاد تھی۔

18

چھ سالہ اقبال اگر پڑھنے میں تیز تھے، تو اپنی بہن کریم بی کی گڑیاں توڑنا، محلّے میں پتنگ اُڑانا اور ہر طرح سے دُوسروں کی توجہ حاصل کرنا بھی اُن کا معمول تھا۔ ممکن ہے کہ اُنہوں نے اپنے بڑوں کو یہ کہتے سنا ہو کہ 'لڑکا بہت ذہین ہے' اور اب اِس مفروضے کو ہر حال میں صحیح ثابت کرنے کے لئے ہر اچھی بُری طرح اپنی ذات کا اظہار کر رہے ہوں۔ اِس سلسلے میں جہاں گھر والوں کی طرف سے اُن کی حوصلہ افزائی ہوئی ہو گی وہیں بے جی (امام بی بی) کی سخت گیری اور عطا محمد کا فوجی ڈسپلن بھی اُن کے آڑے آیا ہو گا۔ اُن کے بچپن کے اُن دنوں کا تصور کرنا زیادہ دُشوار نہیں جب وہ اپنی ذہانت کے کسی غیر معمولی مظاہرے کے بعد بے جی یا رُڑکی سے چھٹیوں پر آئے ہوئے عطا محمد سے ڈر کر میاں جی (نور محمد) کے عفوِ بندہ نواز کی پناہ ڈھونڈتے ہوں۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ جب وہ خود باپ بنے تو اولاد کے معاملے میں اپنی عام فطرت کے برعکس میاں جی سے زیادہ بے جی اور عطا محمد کے قائم کئے ہوئے نمونوں پر عمل کیا۔

19

سیّد میر حسن شوالہ تیجہ سنگھ کی مسجد میں آئے ہُوئے تھے۔ غلام حسن بچّوں کو سبق یاد کرنے کا کہہ کر اُن سے گفتگو میں مصروف رہے ہوں گے جب میر حسن کی نظر اقبال پر ٹھہر گئی۔ نہیں معلوم اقبال اُس وقت شرارت کر رہے تھے یا دانائی کا ثبوت دے رہے تھے، مگر کوئی بات ایسی تھی کہ انہوں نے پوچھ لیا۔ ''کس کے لڑکے ہو؟''

سوانح نگار بتاتے ہیں کہ اِس کے بعد میر حسن، سید نوُر محمد کے پاس پہنچ گئے۔ (۱۳)

اور پھر جس وقت وہ اور نور محمد اِس بات پر بحث کر رہے ہوں گے کہ اِقبال کو میر حسن کے مدرسے میں داخل ہونا چاہیئے یا نہیں تو شائد اُن دونوں میں سے کسی کو بھی اِس بات کا پوری طرح اندازہ نہ رہا ہو کہ

اُن کے اُس روز کے فیصلے کا آنے والے وقتوں پر کیا اثر ہوگا۔ زمانے میں ایسے لمحات بہت کم آئے ہوں گے جب ایک قصبے کے اسکول ماسٹر اور نیم پڑھے درزی کے نجی فیصلے نے کسی برِّصغیر میں بولی جانے والی ایک اہم زبان کے مستقبل، ایک قوم کی آنے والی نسلوں کے خیالات اور خود اُس برصغیر کے آئندہ جُغرافیے کا فیصلہ کیا ہو۔

بہرحال، میر حسن اپنے دوست کو یقین دلانے میں کامیاب ہوگئے کہ چھ سالہ اقبال کے لئے اُن کا مکتب کوئی بُری جگہ نہیں ہے۔

باب ۳

خاندانِ مرتضیٰ کی بارگاہ

۱۸۸۴ء تا ۱۸۹۳ء

پہلا حصہ

1

سیّد میر حسن صبح اسکول جانے سے پہلے درس دیتے تھے۔

بیٹھک میں بہت سے بوریے رکھے ہوئے تھے۔ اقبال اور دوسرے چھوٹے بچے انہی بوریوں پر بیٹھ جاتے۔ کوئی قواعدِ بغدادی پڑھتا کوئی قرآن شریف۔ کوئی سعدی کی فارسی کی نظمیں اور کوئی اُردو شاعری۔

میر حسن باری باری ہر ایک کو اپنے پاس بلاتے کہ وہ اپنی کتاب کا کوئی حصہ انہیں پڑھ کر سنائے۔ جب وہ پڑھ رہا ہوتا تو یہ اُسے مشکل الفاظ کے معنی بتاتے رہتے۔ پُورا حصہ ختم ہو جاتا تو پوچھتے۔

''اِس ساری بات کا کیا مطلب ہوا؟''

بعض اوقات کسی شعر کا مطلب واضح کرنے کے لئے اُس کے ہم معنی اُردو، فارسی اور پنجابی کے اشعار سُناتے تھے۔ (۱)

2

یکم جنوری ۱۸۸۴ء کو ریل گاڑی کا دھواں اُڑاتا ہوا انجن سیالکوٹ میں پہلی دفعہ داخل ہوا۔ یہ وزیر آباد، سیالکوٹ راستے کا افتتاح تھا، جس پر بعد میں اقبال نے کئی دفعہ سفر کیا۔

ریل گاڑی، انگریزوں کی سائنسی ترقی کی سب سے بڑی علامت تھی۔ اس کی سیٹی، اِس کا دھواں، اِس کی رفتار، اِس کے فائدے، ان سب کا پیغام بہت واضح تھا: دُنیا آگے بڑھ رہی ہے۔

3

نور محمد اپنے گھرانے کی مادّی ضروریات کی طرف سے مطمئن ہوگئے تھے۔ اب وہ اقبال سے اُس تقدیر کی تکمیل کروانا چاہتے تھے جو ایک خوبصورت پرندے کی شکل میں اُنہیں نظر آئی تھی۔ اور اِس کا مطلب یہ تھا کہ اُنہیں صرف دینی تعلیم دلوائی جائے۔

میر حسن اِس بات سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے نور محمد کو سمجھایا۔ اس کے لئے دلائل تلاش کرنے میں اُنہیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی ہوگی کیونکہ سرسیّد کے گزٹ کے غالباً سبھی شمارے اُن کے مطالعے میں آچکے تھے۔ نُور محمد کو قائل ہونا پڑا اور اقبال کو قلعہ پر واقع اسکاچ مشن اسکول کی شاخ میں داخل کروادیا گیا۔ ماہانہ فیس ایک آنہ تھی۔

نور محمد جانتے تھے کہ مشن اسکول میں تعلیم پانے کے خطرات کیا ہیں۔ تقریباً یقینی بات ہے کہ اُنہوں نے اقبال کو عیسائیت سے محفوظ رکھنے کے لئے بہت سی ایسی باتیں بتائی ہوں گی جو اِس اجنبی مذہب سے اُن کا فاصلہ بڑھادیں۔ یا پھر اُن کے سابقہ استاد غلام حسن کے درس میں اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے جہاں عیسائیت کی طرف مائل طلبہ کا ذہنی علاج کیا جاتا تھا۔ بہر حال، یہ حقیقت ہے کہ مشن اسکول کے ماحول نے اقبال کی مذہبی نشوونما پر بالکل متضاد اثر ثبت کیا۔ اُنہیں مسیحیت سے غیر معمولی نفرت ہوگئی اور بعد میں یہی نفرت اُن کی فکر کی عمارت کا ایک بنیادی ستون بنی۔

4

رُڑ کالج نے مارچ میں شیخ عطا محمد کو نقشہ نویسی کی سند دے دی۔ وہ اپنی کلاس میں اوّل آئے تھے۔ اگلے مہینے اُنہیں فوج کے پبلک ورکس کے شعبے میں سَب اوورسیئر (sub-overseer) کا عہدہ

مل گیا۔ (۲)

عطا محمد کو روپیہ سنبھالنے کا سلیقہ کبھی نہ آیا۔ وہ سارا روپیہ یا تو اپنے گھر والوں پر خرچ کر دیا کرتے تھے یا اپنے لئے اچھے اچھے کپڑے سلوا لیتے تھے۔ اگر بعض لوگوں کی جیب میں سوراخ ہوتا ہے تو پھر عطا محمد کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اُن کی جیب ہی نہ تھی۔ سارا روپیہ ہاتھوں سے نکل جاتا تھا۔ اگر امام بی بی کی دُنیاوی سمجھ وقتاً فوقتاً اِس روپے کو محفوظ کرنے کی کوئی صُورت نہ نکالتی رہتی تو گھر کی حالت کبھی نہ بدلتی۔ مگر گھر کی حالت اب بدل رہی تھی۔ (۳)

فاطمہ بی جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکی تھیں۔ اُن کی شادی ایک نوجوان کرم الٰہی سے کر دی گئی جس کی کھیلوں کے سامان کی دوکان تھی۔ غالباً اِس دکان پر ریکٹ وغیرہ فروخت ہوتے ہوں گے جو یورپ اور انگلستان سے درآمد کئے جاتے تھے اور ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کے کام آتے تھے۔

5

جُملے کے درمیان وقفہ دینا ہو تو نشان (۔) لگاتے ہیں اور جملہ ختم کریں تو چار نقطے ⁘ ہی کے نیچے زیر ہو تو ''ہی'' پڑھیں گے زبر ہو تو ''ہے''۔

پہلی جماعت کا امتحان یکم اپریل ۱۸۸۵ء کو ہونے والا تھا۔

اس امتحان کی تیاری کے لئے اقبال نے محمد حسین آزاد کی اردو کی پہلی کتاب یاد کی ہوگی جس کا پہلا سبق تھا:

بڑا نیک بچہ ہِی ⁘
نازکا پلا ہُوا ہَی ⁘
بہت شوخ بھی نہیں ⁘
اِس کو بڑا شوق ہَی ⁘
ایک بار میں بھی لُوں؟ دُود پیو ⁘

6

امتحان لینے لاہور سرکل کے اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز رائے گوپال سنگھ سیالکوٹ تشریف لائے۔

اُنہوں نے تین دن میں اپنی کاروائی مکمل کی اور ۱۸ اپریل کو تحریری رپوٹ پیش کردی۔

اسکاچ مشن کے برانچ اسکول میں پہلی جماعت کے جو ۴۰ طلبہ تھے، اُن میں سے ۱۰ فیل ہوئے۔ ۶ بچّوں کو رعائتی نمبر ملے تھے اور ۲۴ باقاعدہ پاس ہُوئے تھے۔ جس بچّے نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے تھے اُس کا نام سب سے اُوپر درج تھا:

اقبال

7

برانچ اسکول میں تیسری جماعت نہیں تھی۔

خیال یہ ہے کہ اقبال نے دوسری اور تیسری جماعتیں اکٹھی پڑھی ہوں گی یعنی اپریل ۱۸۸۵ء سے شروع ہونے والے تعلیمی سال میں اُن کی یہ دونوں جماعتیں مکمل ہوگئی ہوں گی۔

اُردو کی دوسری کتاب

تیسری جماعت میں اُردو کی تیسری اور چوتھی کتاب میں سے اِملا کروائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب۔ حساب (سُود مرکّب)۔ پنجاب اور ہندوستان کا نقشہ۔

اُردو زبان کی حقیقت

ہے زبان ایک اور چار مزی۔ اُسکی ہر بات میں ہزار مزی

ہندوؤں کی راج میں ہندوستان کی مختلف صُوبوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اور اس وجہ سی کہ سنسکرت سی نکلی تھیں پراکرت کہلاتی تھیں کیونکہ اُس زبان میں اِس لفظ کی معنیٰ نکلی ہوئی کی ہیں۔ وہ زبان جو متھرا اور آگرہ کی نواح میں بولی جاتی تھی اُسکا نام... بھاشا تھا۔ ۱۱۹۱ء میں جب دہلی کی اندر مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی تو بادشاہی دفتر فارسی ہوگیا مگر رِعایا کی زبان وُہی پراکرت رہی۔ اور مسلمانوں نی اُسکا نام ہندی رکھ دیا۔

صفحہ ۱

اُردو کی تیسری کتاب

مرتبہ ماسٹر پیارے لال

کیوریٹر سنٹرل بک ڈپو گورنمنٹ پنجاب

حسب الحکم
جناب میجر بالرائڈ صاحب بہادر
ڈائریکٹر مدراس ممالک پنجاب وغیرہ

8

''اب ہم لڑکوں کی ذہن کی تیزی کی لئی کُچھ پہیلیاں اور نسبتیں اور اشعار لکھتی ہیں''

اصل میں لڑکوں کے ذہن کی تیزی محض بہانہ تھی۔ پیارے لال نے پہیلیاں بھی حسبُ الحکم کرنل بالرائڈ صاحب ہی لکھی ہوں گی کیونکہ ہر پہیلی سے پہلے جلی قلم کے ساتھ اُس کا حل لکھا ہوا تھا، جس کے بعد ذہن کی تیزی کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی تھی۔

ڈھال

ایک نار بھنورا سی۔ کالی
کان نہیں۔ وہ پہنی بالی
ناک نہیں۔ وہ سُونگھے پھول
جِتنا عرض۔ وِتنا ہی طُول

ارگجا

آدھا ارنا ۔ سارا ہاتھی
جِن دیکھا اُن لایا چھاتی

9

دسمبر میں بمبئی کے اجلاس میں ستر (۷۰) کے قریب مندوبین نے ایک سیاسی جماعت کو جنم دیا جس کے تین مقاصد تھے۔

ا۔ ہندوستانی آبادی کے اُن تمام مختلف عناصر کو جو حالیہ زمانے تک ایک دوسرے کے ناموافق تھے، متحد کر کے ایک سالم قوم بنانا۔

۲۔ اِس طرح وجود میں آنے والی قوم کا ذہنی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی خطوط پر احیا کرنا۔

۳۔ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان تعلّق کے سبب ہندوستان کی جو حق تلفی ہوتی ہو یا اِس ملک کو جو نقصان پہنچتا ہو، اُس کا سدِّ باب کرنا۔

اِس سیاسی جماعت کا نام انڈین نیشنل کانگریس رکھا گیا۔

اگر چہ کانگریس کا بانی ایک ریٹائر انگریز سول سرونٹ تھا مگر سرسیّد احمد خاں کے نزدیک اس جماعت کے قیام میں بھی ہندوؤں کا مفاد پنہاں تھا۔ ''کیا یہ تصوّر کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں ایک نیشن ہے؟''

10

''زمیندار یہ ماجرا دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ لیکن جب اُسنے موتی کو پہچانا کہ۔ اُس مردہ بھیڑیے کی چھاتی پر کود رہا تھا۔ تو اور بھی اُسکی حیرانی دو چند ہُوئی۔ چرواہی کو پکار کر بولا کہ سُن! اب میری دلپر یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ۔ جو اپنی زندگی کاہلی۔ اور سستی میں کاٹتی ہیں اُن سی دلیری کا بھروسا رکھنا محض خطاہی۔ اور محنت اور کثرت۔ اور تادیب۔ اور تربیت سی ناچیز۔ اور بی حقیقت بھی اکثر اچھی اور کام کی بنجاتی ہیں۔''

اِس کے بعد پیارے لال نے کہانی کا مآخذ درج کیا تھا اور تمّت لِکھ کر اُردو کی تیسری کتاب ختم کر دی تھی۔

11

اقبال نے مارچ یا اپریل ۱۸۸۶ء میں دُوسری اور تیسری جماعتیں پاس کر لیں۔ اِس امتحان کو ''لوئر اسکول اگزامینیشن'' کہتے تھے۔

اگلی جماعت میں وہ انگریزی پڑھنے والے تھے مگر شائد اسکول سے پہلے ہی اِس زبان کے کچھ درس لے چکے تھے کیونکہ بعد میں یہی مشہور ہُوا کہ اُنہوں نے انگریزی کا پہلا سبق میر حسن کے چچازاد بھائی میر حسام الدّین کے لڑکے میر حامد شاہ سے پڑھا تھا۔ (۴)

12

اَپر پرائمری میں چوتھی اور پانچویں جماعتیں ہوتی تھیں۔

اسکاچ مشن کی اَپر پرائمری میں انگریزی پڑھائی جاتی تھی مگر اُردو میں:

اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ ای۔ ایف۔ جی۔ ایچ۔ آئی۔ جے۔ کے۔ ایل... پہلا سبق تھا ''نام حروفِ تہجی۔''

دوسرے سبق میں شائد کچھ انگریزی الفاظ پڑھائے جاتے ہوں کیونکہ کتاب میں لکھا تھا۔ جا۔ نہیں۔ ایسا۔ کر۔ کو یا پاس۔ تم۔ یا تمکو۔ کل پینتالیس (۴۵) اسباق تھے۔ قیمت پانچ آنے چھ پائی۔

یہ تھا ''انگلش پرائمری کا بامحاورہ اُردو میں ترجمہ جسکو غلام حیدر سیکنڈ ماسٹر مدرسہ پنڈ دادن خان ضلع جہلم نے برائے افادہ طلباء چہارم پرائمری جماعت انگریزی مدارس پنجاب حسب ایمائے منشی گلاب سنگھ صاحب مالک مطبع مفید عام لاہور کے تالیف کیا۔'' (بے اجازت کوئی نہیں چھاپ سکتا)

13

میر حسن کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔ اور اُنتالیس سالہ سعید بیگم ایک دفعہ پھر ماں بننے والی تھیں۔

۱۸ جُون کو اُن کے گھر ایک اور لڑکا پیدا ہوا مگر سعید بیگم کی حالت بگڑ گئی۔

چند گھنٹوں میں وہ چل بسیں۔

بچّے کا نام مظہر رکھا گیا۔

''آپ کے اہلِ خانہ کی خبر سے سخت افسوس ہوا...خدا آپ کا مددگار رہو...دنیا میں...اِس قسم کے رنج والم پیش آجاتے ہیں۔ دوست تسلّی دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں' صبر کرو۔ مگر...صبر کرنا بھی مجبوری ہے۔ صبر نہ کرے تو کیا کرے۔ سُورۂ اَنفال کی تفسیر چھپ رہی ہے۔ اور بہت جلد اس کے اوراق تقسیم ہونے شروع ہوں گے...والسلام۔ خاکسار سیّد احمد۔ علی گڑھ۔ ۱۳۱ گست ۱۸۸۶ء۔''

14

اُس برس سرسیّد نے اپنے اِس خیال کے تحت کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں' محمڈن ایجوکیشنل

کانگریس کی داغ بیل رکھی اور علی گڑھ میں اِس کا پہلا اِجلاس دسمبر کے مہینے میں بلا کر گویا اِنڈین نیشنل کانگریس کی دکان سے مسلمانوں کو ہٹانے کا بندوبست کرلیا۔

''اِس وقت تک ہمارا یہ حال ہے کہ گو ہم ایک مسلمان قوم کہلاتے ہیں مگر ایک جگہ کے رہنے والے دُوسری جگہ کے رہنے والوں سے ایسے ناواقف ہیں جیسے کوئی اجنبی قوم...''

مُسلم ایجوکیشنل کانگریس کے دس مقاصد قرار پائے۔

۱۔ مسلمانوں میں یورپین سائنس ولٹریچر کی اشاعت اوراعلیٰ تعلیم کی کوشش کرنا
۲۔ مسلمانوں کے قدیم علوم کے متعلق تحقیقات کرنا اور اُردو اور انگریزی میں رسالے لکھوانا
۳۔ مشہور علما اور مصنفین اسلامک کے سوانح حیات اُردو اور انگریزی میں مرتب کرنا
۴۔ مُسلم مصنفین کی قدیم تصانیف کی فراہمی
۵۔ زمانہ ءِ قدیم کے تاریخی واقعات کی تحقیق واشاعت
۶۔ دُنیاوی علوم کے مسائل کی تحقیق واشاعت
۷۔ شاہی فرامین کو جمع کر کے ایک کتاب انشا مرتب کرنا
۸۔ مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کی درس گاہوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا
۹۔ علومِ مشرقی اور دینیات کے علما سے ربط قائم کرنا اور اُن کی تعلیم میں ترقی کی کوشش
۱۰۔ قدیم مکاتب کی اصلاح وترقی (۵)

15

عطا محمد کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ اُس کا نام برکت بی بی رکھا گیا۔

جس شادی کے نتیجے میں عطا محمد کو ملازمت ملی تھی اُس کے ثمر کو یہی کہلانا چاہیے تھا۔ مگر پھر یہ ہُوا کہ عبدالرزاق راٹھور کی بیٹی کو افیون کھانے کی عادت پڑگئی۔

بظاہر اِس کی وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ اُس زمانے میں شیرخوار بچّوں کو افیون کھِلا کر سُلانے کا رواج تھا۔ ممکن ہے برکت بی بی کی ماں نے بھی اپنی بچّی پر یہ طریقہ آزمایا ہو اور کسی موقع پر تھوڑی سی خود چکھنے کے بعد اُنہیں باقاعدگی سے استعمال کرنے کی عادت پڑگئی ہو۔ مگر عطا محمد نے اُنہیں طلاق دے دی۔

اقبال کی سوانح کے حوالے سے یہ واقعہ قابلِ غور ہے۔

نو دس برس کی عُمر کے لڑکے پر اس طلاق کا کیا اثر پڑا ہوگا؟ جب اُس نے پوچھا ہوگا کہ بھابھی اپنے شوہر کو چھوڑ کر کہاں چلی گئی، تو بزرگوں نے اُسے طلاق کا مفہوم کس طرح سمجھایا ہوگا؟ اِس طلاق کے حوالے سے گھر کے بزرگوں کے درمیان جو بحث ہوئی ہوگی، نو دس سال کے بچے نے اُس کا کیا مطلب سمجھا ہوگا؟ جب عطا محمد کی پہلی شادی اور اقبال کی آئندہ چل کر ہونے والی پہلی شادی کے درمیان مُماثلتوں پر غور کرتے ہیں تو اِس واقعے کی اہمیت اور بڑھتی نظر آتی ہے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ اِس کچی عمر میں اقبال کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ جس بیوی کی طرف سے شکایت پیدا ہوا ُسے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ یا کم از کم پہلی بیوی کو علیحدہ کرنا پہلی شادی کا قدرتی انجام ہے؟

ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ نور محمد اور امام بی بی کی اولاد میں سے اکثر کی شادیاں ناکام رہیں۔ مثلاً آگے چل کر اقبال کی بعض بہنوں کی بھی اپنے شوہروں سے ناچاقی ہوئی۔

عطا محمد کی پہلی بیوی کے متعلق ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر اُن کی اپنی شخصیت اور بالخصوص امام بی بی کے ساتھ اُن کے تعلقات کا حال معلوم ہوتا تو شائد اقبال کے ذہن کا کوئی اور گوشہ بھی روشنی میں آسکتا تھا۔

16

میر حسن نے عطا محمد سے کہا۔

''تم نے ظلم کیا۔ اگر خود تمہیں افیون کی عادت پڑ جائے، تو...؟''(٦)

17

جو ظلم شیخ عطا محمد نے کیا تھا، وہی میر حسن کے چھوٹے بھائی عبدالغنی کر چکے تھے۔ پہلی بیگم کو طلاق دے کر ایک برکت بی بی سے شادی کی تھی۔ مگر اب برکت بی بی اُن سے ناخوش تھیں اور طلاق مانگ رہی تھیں۔ آخر عبدالغنی نے اُنہیں بھی طلاق دے دی۔

میر حسن کی والدہ بہو کو گھر سے نکالنا نہیں چاہتی تھیں۔ اُنہوں نے میر حسن سے کہا کہ وہ برکت بی بی سے نکاح پڑھوا لیں۔ اگر میر حسن کی پہلی بیوی زندہ ہوتیں تو شائد وہ ایک دفعہ پھر خاندان سے بغاوت

کرتے کیونکہ سرسیّد کی تہذیبِ اخلاق میں ایک بیوی تک محدود رہنے کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ چونکہ سعید بیگم وفات پا چکی تھیں شائد اسی لئے میر حسن برکت بی بی سے شادی کرنے پر راضی ہو گئے اور وہ اپنے سات برس کے لڑکے احسان کے ساتھ میر حسن کے پاس آ گئیں۔

18

۱۸۸۷ء کے ابتدائی مہینوں میں کسی وقت چوتھی جماعت کا امتحان ہُوا اور اقبال پانچویں میں آ گئے۔ اُن کی عُمر دس سال تھی۔

انگریزی۔ فرسٹ ریڈر

اُردو کی پانچویں کتاب

قواعدِ اُردو مرتبہ پیارے لال آشوب

حساب (مشق کرنا۔ رول آف تھری۔ مربع کی پیمائش۔ سُود)

فارسی کا انتخاب

فارسی گرامر (ترکیب نحوی۔ ترجمہ)

مفتاح الارض (دنیا کے ملکوں کے نام، دارالحکومت، قدرتی تقسیم، نیز پچھلے اسباق کا اعادہ)

19

میر حسن اور سعید بیگم کا سب سے چھوٹا بچہ مظہر ساڑھے آٹھ ماہ کی عُمر پا کر چل بسا۔ ۳ مارچ ۱۸۸۷ء

20

عطا محمد کی دوسری شادی ہو گئی۔

طلاق کی وجہ سے اگر گھر کی فضا پر کوئی بوجھل پن طاری ہوا تھا تو وہ مہتاب بیگم کے آنے سے دور ہو گیا ہو گا۔ وہ گھر کی عورتوں میں گھل مل گئیں۔ نور محمد نے، جنہیں اب گھر میں میاں جی کہا جانے لگا تھا، اُنہیں بتایا کہ وہ کس قسم کا حقہ پینا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ مہتاب بیگم تمبا کو کوئی دن تک دھوپ میں سکھانے کے بعد اوکھلی میں کُوٹ کر اُس میں ایک خاص تناسب سے راب (گنے کا رس) ملاتی تھیں۔ یہ کام، جو

پہلے میاں جی کو خود کرنا پڑتا تھا، مہتاب بیگم نے اپنے ذمے لے لیا۔ میاں جی کو اُن کے ہاتھ کی بھری ہوئی چلم کی ایسی عادت پڑی کہ پھر زندگی بھر کسی اور شخص کو چلم نہ بھرنے دی۔

رات ہوتی تو مہتاب بیگم بے جی (امام بی بی) کی نگرانی میں گھر کی دوسری عورتوں کے ساتھ دیر تک ازار بند بنتی رہتیں۔ اقبال، جو انہیں بھابھی جی کہا کرتے تھے، اُن سے، ایک خاص اُنس محسوس کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ مہتاب بیگم کو سب بھابھی جی کہنے لگے اور گھر میں یہی اُن کا نام ہوگیا۔

جہاں تک بھابھی جی کا تعلق تھا، اُن کا دس سالہ دیور اُن تمام بچوں سے مختلف تھا جو اُنہیں آج تک نظر آئے تھے۔ وہ رات کو نیند میں اُٹھ اُٹھ کر پڑھتا رہتا اور امام بی بی سونے کو کہتیں تو جواب دیتا۔ ''بے جی! سویا ہوا ہی تو ہوں۔'' اور پھر بھابھی جی اُسے بستر پر لٹا دیتیں۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ریاضی کے جو سوالات وہ سوتے ہوئے حل کرتا تھا وہ بالکل درست ہوتے تھے۔ (۷)

''مجھے تعلیم کے لئے سکول جانے کا اتنا شوق تھا کہ رات کو نیند میں بھی سکول کے ہی خواب دیکھتا ہوں گا''۔ اقبال نے کہا: ''ایک رات خواب ہی دیکھا ہوگا کہ سکول جانے کا وقت ہوگیا ہے۔ اُٹھ کر نیند میں ہی بستہ بغل میں داب گھر کے بند دروازے پر پہنچ گیا۔ اِتنے میں بھابھی جی کی آنکھ کھل گئی۔ اُنہوں نے آکر مجھے پکڑ لیا اور پوچھا اِس وقت کہاں جارہے ہو؟ میں نے کہا، سکول۔ اُنہوں نے کہا، آنکھیں کھول کر دیکھو۔ ابھی تو آدھی رات ہے۔ پھر مجھے بستر پر لا کر سلا دیا۔ اُس دن سے میری چارپائی کے ایک طرف بے جی کی چارپائی بچھتی اور دُوسری طرف بھابھی جی کی تاکہ میں پھر کبھی رات کو سکول جانے کے لئے باہر نہ نکل کھڑا ہوں۔'' (۸)

21

پرنسپل نے کلاس میں شور سنا تو سمجھا کہ یہاں کوئی اُستاد نہیں مگر کلاس میں جھانکنے پر معلوم ہوا کہ میر حسن بیٹھے ہیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

''کچھ نہیں،'' میر حسن نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''بچّوں کو پڑھا رہا ہوں۔'' (۹)

22

شیخ گلاب دین بارہ تیرہ برس کا لڑکا تھا۔ بلا کا ذہین مگر شرارتی۔ چونکہ ہر اُستاد میر حسن نہیں ہوتا لہٰذا گلاب دین کو اسکاچ مشن اسکول سے نکال دیا گیا۔ اُس کا ذہن یوں ہی دوسرے معاملات میں خاصا تیز تھا، اُس نے ماچسیں خریدیں اور بازار میں پھیری لگانی شروع کر دی۔ (۱۰)

23

محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں ۸ مئی کو منعقد ہوا۔ اِس کی سب سے خاص بات ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' کے عُنوان سے پڑھا جانے والا تحقیقی مقالہ تھا جسے علی گڑھ کے عربی کے نوجوان اُستاد محمد شبلی نے تحریر کیا تھا۔ شبلی، جو امام ابو حنیفہ سے عقیدت میں اپنے نام کے ساتھ نعمانی کا اضافہ کرتے تھے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز سال میں اعظم گڑھ (لکھنؤ) میں پیدا ہوئے تھے۔ والدہ کا رجحان مشرقی علوم کی طرف تھا مگر والد صاحب انگریزی کی تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ چونکہ یہ اپنی والدہ کے طرف دار تھے لہٰذا گھر سے بھاگ نکلے اور مولانا فاروق چریاکوٹی سے عربی کی تعلیم حاصل کی جو حالی اور سرسیّد کے بہت بڑے مخالف تھے۔ شبلی نے باپ کا دل رکھنے کو وکالت کا امتحان بھی پاس کر لیا مگر خود کبھی وکالت کی طرف مائل نہ ہوئے۔ کعبہ اور کلیسا کی یہ کشمکش علی گڑھ لے آئی جس کے وسیع کتب خانے سے متاثر ہو کر اُنہوں نے چالیس روپے ماہوار کی نوکری منظور کر لی۔

مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم والا مقالہ سرسیّد کی فرمائش پر ایک سال کے عرصہ میں لکھا گیا۔ اِس کی خاص بات یہ تھی کہ اِس میں کثرت سے مغربی اور مشرقی اہلِ قلم کے حوالے دیئے گئے تھے اور عربی کی جن کُتب سے شبلی نے استفادہ کیا تھا اُن میں سے بہت ایسی تھیں جن سے قدیم عربی مدرسے واقف نہ تھے۔ یہ کتب اکثر یورپ میں چھپ کے سرسیّد کے ذاتی کتب خانے یا علی گڑھ کالج کی لائبریری میں پہنچی تھیں۔

مغرب کی یلغار نے ہندوستان کے مسلمان معاشرے کو جس اضطراب سے آشنا کیا تھا شبلی نعمانی علمی سطح پر اُس کی پہلی نمائندہ تخلیق تھے۔

اُن کی آئندہ کتاب کا موضوع عباسی خلیفہ المامون تھا جس کی کسی اور خصوصیات سے زیادہ وہ اس بات سے متاثر تھے کہ اُس نے پرانے زمانے میں اسلام کا دامن مغربی علوم سے بھرا تھا۔

24

اسکاچ مشن اسکول میں ایک درویش داخل ہوا اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر اندر گھستا چلا گیا۔ پھر وہ اُستاد کی پرواہ کئے بغیر ایک کمرۂ جماعت میں گیا اور بڑی شفقت سے ایک بچے کے سر پر ہاتھ پھیر کر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اِس سے پہلے کہ اُستاد صاحب کچھ سمجھ پاتے، درویش وہاں سے جا چکا تھا۔

یہ بچہ اقبال تھے۔ اُستاد نے اُن سے درویش کے متعلق دریافت کیا مگر اقبال کچھ نہ بتا سکے۔

کہتے ہیں کہ وہ درویش اِس کے بعد بھی اقبال کو نظر آتا رہا۔ (۱۱)

25

نو دس سالہ اقبال کا موسیقی کی طرف کیسے رجحان ہوا، یہ معلوم نہیں۔

اُس زمانے میں عام طور پر شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں طوائفوں کا مجرا کروایا جاتا تھا مگر بچوں کو اُسے دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

اِس کے علاوہ قوّالی تھی جو مزاروں یا مخصوص تہواروں پر ہوا کرتی تھی اور اِس بات کا خاصا امکان ہے کہ میاں جی اپنے لڑکے کو ایسی جگہوں پر لے گئے ہوں۔

ان کے علاوہ میلے ٹھیلے تھے۔ جہاں ناچ گانا ہوتا تھا۔ پھر ہندوؤں کے بھجن تھے۔ عیسائیوں کی مذہبی موسیقی تھی۔ گلیوں اور محلّوں میں صدا لگانے والے فقیر تھے جو اکثر گاتے ہوئے سُنائی دیتے تھے۔ اقبال نے ان سب کا مشاہدہ کیا ہوگا۔

ایک رات جب بے جی، بھابھی جی اور دوسری عورتیں ازار بند بُننے بیٹھیں تو اقبال کسی منظوم قصّے کی کتاب لے کر پہنچ گئے اور گا کر سنانے لگے۔ پھر یہ اُن کا مشغلہ بن گیا۔ اِسی طرح گاتے گاتے کبھی اُن کے ذہن میں آئی تو اپنی طرف سے ایک آدھ مصرعہ بڑھا دیا (۱۲)۔ عورتوں سے اس کی داد ملی ہوگی...اور یوں اُس عمل کی ابتدا ہوئی جس نے آگے چل کر شکوہ اور بالِ جبریل تخلیق کئے۔

نو دس سال کے اقبال جو مصرعے جوڑتے تھے وہ کیسے ہوتے ہوں گے؟ اگر اُن کی بذلہ سنج طبیعت پر غور کیا جائے اور بعد کے واقعات کو سامنے رکھا جائے تو اِس کا یہی جواب ملتا ہے کہ کہیں کسی کردار کی جگہ گھر کے کسی فرد کا نام ٹھونس دیا ہوگا، کہیں محلّے کے کسی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہوگا۔ کہیں موقع پر موجود

کسی خاتون یا کسی رشتہ دار کا مذاق اُڑا دیا ہوگا۔ غرض جب بھی دیکھا کہ شمع یا لالٹین کی ملگجی روشنی میں کوئی پلک بوجھل ہونے لگی ہے تو کوئی ایسی پھلجڑی چھوڑ دی کہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور دوبارہ کام کرنے کے قابل ہو جائیں۔ کچھ عجب نہیں کہ یہی سوئی ہوئی قوم کو جگانے کا اوّلین تصور رہا ہو۔

26

''جب میری عمر کوئی گیارہ برس تھی، ایک رات مَیں اپنے گھر میں کسی کی آہٹ کے باعث سوتے سے بیدار ہو گیا۔'' اقبال نے بتایا۔''...بے جی کمرے کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہی تھیں۔ (۱۴)

''میں...بے جی کے پیچھے چلتے چلتے سامنے دروازے کے پاس پہنچا جو آدھ کھلا ہوا تھا اور اُس میں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ بے جی اس دروازے میں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ میاں جی صحن میں بیٹھے ہیں اور ایک نور کا حلقہ اُن کے گرد ہے۔

''میں نے میاں جی کے پاس جانا چاہا تھا لیکن بے جی نے مجھے روکا اور سمجھا بجھا کر پھر سُلا دیا۔

''صبح ہُوئی تو میں سب سے پہلے میاں جی کے پاس پہنچا تاکہ اُن سے رات کا ماجرا دریافت کروں۔ بے جی پہلے ہی سے وہاں موجود تھیں...

''میاں جی بتا رہے تھے کہ رات اُنہیں ایک قافلے کے بارے میں کشف ہوا ہے جو کابل سے آتے ہوئے سیالکوٹ سے پچیس میل کے فاصلے پر ٹھہر گیا ہے۔ اُنہیں اُس کی مدد کرنی ہے۔''

پھر شیخ نور محمد نے کوئی چیز اُٹھائی اور اقبال کو ساتھ لے کر تانگے میں بیٹھے۔ چند گھنٹوں میں تانگہ وہاں پہنچ گیا جہاں قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اُنہوں نے قافلہ سالار سے کہا کہ وہ اُنہیں فوراً مریض کے پاس لے جائے۔ وہ سخت حیران ہوا کہ اس اجنبی کو مریض کے بارے میں کس طرح معلوم ہوا۔

مریض کے جسم کے بعض حصے گل چکے تھے اور اُس کی حالت ایسی تھی کہ وہ قافلے کے ساتھ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ انہوں نے کوئی راکھ جیسی چیز اُس کے بدن کے متاثرہ حصوں پر لگائی اور رشتہ داروں کو اللہ پر بھروسہ کرنے کا مشورہ دیا۔

قافلے والوں اور خود اقبال کو اُس وقت یقین آیا جب ۲۴ گھنٹے بعد وہ مریض بہتر ہونے لگا۔

اِس کے بعد میاں جی نے علاج کے بدلے میں رقم لینے سے انکار کر دیا اور واپس آ گئے۔

اِس واقعے نے اقبال کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے۔ اپنی زندگی میں اُنہوں نے متعدد مرتبہ

اپنے قریبی دوستوں کو سنایا۔ اِس میں کتنا اصل تھا، اور کتنا اُن کی یاداشت کا دھوکہ، یہ بات اہم نہیں ہے۔ اہم وہ نفسیاتی اثر ہے جواُن کے دل و دماغ پر ہمیشہ باقی رہا۔

27

ایک دن میر حسن نے بازار میں گلاب دین کو دیکھا۔ وہ ماچسیں بیچ رہا تھا۔

''کل سکول آنا۔'' انہوں نے کہا۔''ہم سفارش کر کے تمہیں دوبارہ داخل کروا دیں گے۔''

اس حکم کو گلاب دین نے خوشخبری سمجھا یا سزا، بہر حال وہ اگلے روز اسکول میں موجود تھا۔

میر حسن نے اُسے دوبارہ داخل کروا دیا مگر گلاب دین کو اپنی ماچسیں یاد آ رہی تھیں۔ یہ بھی اُس کی طبعیت کو سمجھتے تھے، چنانچہ اپنے دوست لالہ بھیم سین سے بات کر کے گلاب دین کو دو روپے ماہوار پر اُن کے لڑکے کی ٹیوشن پر رکھوا دیا۔

''ٹیوشن کا روپیہ میرے پاس جمع کرواتے رہو۔''

28

۱۸۸۸ء کے ابتدائی مہینوں میں اقبال نے اپر پرائمری کا امتحان دیا۔ اس میں پاس ہونے پر پنجاب یُونیورسٹی کی جانب سے حلقہ کا انسپکٹر آف اسکولز باقاعدہ سند جاری کرتا تھا اور کامیاب اُمیدوار کو سرکاری ملازمت مل جاتی تھی۔

اقبال بھی کامیاب ہوئے اور خیال ہے کہ وظیفہ حاصل کیا۔ اُن کی ذہانت اور اُن کے رُجحان کو دیکھتے ہوئے نور محمد نے اُنہیں چھٹی جماعت میں داخلہ دلوا دیا جو مڈل کی پہلی کلاس تھی۔

دوسرا حصّہ

29

اقبال کے لئے چھٹی جماعت کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہ جماعت اسکاچ مشن ہائی اسکول میں تھی اور خود میر حسن عربی، فارسی اور حساب پڑھاتے تھے۔

میر حسن روز صبح اپنے گھر پر درس ختم کرنے کے بعد اسکول روانہ ہوتے تھے۔ پہلے اپنی مرحوم بہن کی قبر پر جاتے اور پھر اسکول۔ راستے میں کئی شاگرد اُن کے ساتھ چلتے اور سبق لیتے جاتے۔

اگر اقبال کا میر حسن کے صبح والے درسوں کا سلسلہ جاری تھا، تو اب وہ اُن کے ساتھ ہی اسکول جاتے ہوں گے۔

30

انگریزی، اُردو، ریاضی اور تاریخ وجغرافیہ لازمی مضامین تھے۔عربی اور فارسی میں سے کسی ایک مضمون کا انتخاب کرنا ہوتا تھا۔یقین سے تو نہیں کہہ سکتے مگر اندازہ یہی ہے کہ فارسی کے ساتھ ذاتی دلچسپی کے باوجود اقبال کو عربی لینی پڑی ہوگی کیونکہ میر حسن اِس زبان کو ترجیح دیتے تھے اور نور محمد کا خواب بھی یہی تھا کہ اُن کا بیٹا اسلام کی خدمت کرے گا۔

31

میر حسن کی برکت بی بی کے ساتھ اچھی نہیں نبھ رہی تھی۔ وہ مزاج کی تیز تھیں اور انہیں برداشت کرنا پڑتا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ یہ اپنے سوتیلے بیٹے یعنی بھتیجے احسان کی کفالت بھی کر رہے تھے۔

اُن کی جوانی اگر معاشرے سے بغاوت اور بے پناہ توانائی کا مظہر رہی تھی تو اب ادھیڑ عُمر (۱۸۸۸ء میں اُن کی عمر ۴۲ برس تھی) مستقل مزاجی سے عبارت ہوگئی تھی۔ بہن سے کیا ہوا وعدہ برقرار تھا۔مجال تھی جو کسی صبح قبرستان کا ناغہ ہو جائے۔

اِس کے علاوہ بعض مشاغل جو اختیار کئے ان میں بھی مذہب جیسی پابندی کا ثبوت دیا۔عربی، فارسی، اُردو، ہندی، گرمکھی اور پنجابی کتابیں جمع کرتے کرتے ایک اچھا کُتب خانہ بن گیا تھا۔بعض کتابوں پر اپنے ہاتھ سے مفید اضافے بھی کرتے تھے۔قرآن مجید کا ایک نسخہ کانپور کا چھپا ہوا تھا۔اس میں آیت نمبر نہیں تھے۔ چنانچہ خود لگائے۔اسی طرح شاہ ولی اللہ دہلوی کا فارسی ترجمہ والا قرآن شریف بھی کانپور کا چھپا ہوا اُن کے پاس تھا۔اس میں مطبوعہ اوراق کے درمیان میر حسن نے سفید کاغذ چسپاں کیا اور اُس پر سُرخ روشنائی سے حاشیہ کھینچا۔پھر سرسیّد کی تفسیر سے نکال نکال کر اُردو ترجمہ اس طرح لکھتے گئے کہ ہر آیت کا پہلا عربی لفظ سُرخ روشنائی سے لکھنے کے بعد اُردو ترجمہ سیاہ روشنائی سے لکھتے تھے۔

اقبال اگر اپنے اُستاد کی مستقل مزاجی اور محنت کی عادت سے واقف تھے، تو ممکن ہے یہ اُن کیلئے ایک آئیڈیل بن گئی ہو جسے لڑکپن میں چند روز اُنہوں نے اپنانے کی کوشش کی ہو، اور آگے چل کر اس پر

پُورے نہ اُتر سکے ہوں۔

32

اقبال کے بچپن کے دوستوں میں سے جن کے حالات معلوم ہوئے ہیں وہ خوشیا، جھنڈے خان اور محمد تقی ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے ہم جماعتوں کے نام معلوم ہیں مگر اقبال سے اُن کے تعلقات کی تفصیل دستیاب نہیں۔

خوشیا اسکول میں نہیں پڑھتا تھا۔ اقبال اُس کے مکان کے تھڑے پر بیٹھ کر شطرنج کھیلتے تھے۔ (۱۴)

جھنڈے خان اُن کا ہم جماعت تھا۔

محمد تقی، میر حسن کے منجھلے لڑکے تھے۔ مرحومہ سعید بیگم کی سات نشانیوں میں سے ایک۔ اقبال سے یہ چند سال بڑے تھے مگر شائد ان کے سب سے بے تکلف دوست بھی، کیونکہ بعد میں اقبال نے انہیں اپنے معاشقوں میں شریکِ راز رکھا۔ عمروں کے فرق کے باوجود اس گہری بے تکلفی کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اقبال اپنی ذہانت کے لحاظ سے خود اپنی عمر سے بہت آگے تھے۔

محمد تقی کے چھوٹے بھائی زکی تھے جو قریب قریب اقبال کے ہم عمر تھے۔ اقبال کا کچھ وقت ان کے ساتھ بھی گذرا تھا۔

ان سب دوستوں میں اقبال اپنے مختصر نام ''بالا'' سے پکارے جاتے تھے۔

33

اگر اقبال کسی روز اسکول نہ آتے تو میر حسن بے چین رہتے۔

''اقبال نہیں آیا؟'' وہ بار بار پوچھتے۔

اُس زمانے کے دوسرے اساتذہ کے برعکس میر حسن کو اپنے شاگردوں سے نجی کام کروانے کی عادت نہ تھی۔ صرف ایک دو مخصوص شاگردوں کو وہ کبھی کوئی زحمت دیتے تھے۔ اور اقبال انہی میں سے ایک تھے۔

ایک شام اقبال اُن کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ احسان علی بھی تھا۔ وہ غالباً تھک گیا ہوگا کیونکہ میر حسن نے اقبال سے کہا کہ اُسے اُٹھالیں۔ مگر احسان علی آٹھ نو برس کا تگڑا بچہ تھا۔ اقبال سے صرف تین

سال چھوٹا۔ جلد ہی اقبال خود تھک گئے اور اُسے ایک دُکان کے تختے پر بٹھا کر ستانے لگے۔ میر حسن چلتے چلتے پلٹ آئے اور اقبال کا نام لے کر کہا۔

''اِس کی برداشت بھی دُشواری ہے؟''

اقبال بازاری قصوں میں مصرعے چُست کرنے کے عادی تھے۔ بے اختیار زبان سے نکل گیا۔

''تیرا احسان بہت بھاری ہے!''

میر حسن نے ذو معنی مصرعے کی داد دی یا شوخ چشمی کی سزا، یہ معلوم نہیں۔ مگر اقبال خود اتنے شرمندہ ہوئے کہ زندگی بھر''شاہ جی'' کے سامنے اپنا کوئی مصرعہ نہ کہنے کا ارادہ کرلیا۔ (۱۵)

شاہ جی کے سامنے اور بات تھی، مگر اسکول میں اقبال گونگے طالبعلم نہ تھے۔ بائبل پڑھانے والوں سے اکثر اُلجھتے اور کبھی کبھار کسی اُستاد کے سامنے بڑی شوخی سے اپنی ذہانت کا ثبوت دے جاتے۔

وقت کی پابندی کرنا ایک ایسی خوبی تھی جس سے اقبال گویا فطری طور پر معذور تھے۔ ایک مرتبہ کسی اُستاد نے دیر سے آنے کا سبب پوچھا تو اِن کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

''اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔'' (۱۶)

34

تقی کو ایک نیا شوق ہوا۔ اور اقبال نے اس پر چند مصرعے چُست کر دیئے۔ (۱۷)

یہ اقبال کے اوّلین مصرعے ہیں جو ہمیں دستیاب ہوئے ہیں۔

دل میں آئی جو تقی کے تو کبوتر پالے
جمع لالا کے کیے لال، ہرے، مٹیالے
ان میں ایسے ہیں جو ہیں پہروں کے اُڑنے والے

...

اب یہ حال کہ آنکھیں ہیں کہیں پاؤں کہیں
پاؤں کے نیچے نہ معلوم زمیں ہے کہ نہیں

کچھ عجب نہیں کہ پہلی دفعہ اِن مصرعوں کو لکھ کر اقبال نے سب دوستوں کو جمع کیا ہو اور منظوم بازاری

قصوں کی پیروڈی کرتے ہوئے کوئی ''قصہ محمد تقی'' بنا کر گایا ہو۔

35

''خوشیا! کبوتروں کو نیلی فضا میں اڑتے دیکھ کر میں محسوس کرتا ہوں جیسے میں خود بھی آسمان کی بلندیوں میں پرواز کر رہا ہوں۔ میرے دل میں عجیب سا احساس پیدا ہوتا ہے۔'' (۱۸)

اقبال کا شوق دیکھتے ہوئے میاں جی نے بھی گھر میں کبوتر رکھنے کی اجازت دے دی۔

36

اقبال پتنگ بھی اُڑاتے تھے۔ رات کے وقت چاند ستاروں کا مشاہدہ بھی یقیناً دلچسپ لگتا ہو گا۔ آسمان کی طرف دیکھنے کا یہ رویہ اُن کی نفسیات کا ایک مستقل حصہ بن گیا اور بڑے ہونے کے بعد بھی اُن کی نظموں میں جھلکتا رہا۔

37

پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بوڑھا کسان سڑک کے کنارے پھیلے ہوئے گندم کے کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔ اقبال سیّد زکی اور دوسرے دوستوں کے ساتھ وہاں سے گزرے تو کسان کے پاس ٹھہر گئے اور اُس سے پوچھا۔ ''بابا! گندم کے یہ کھیت کس کے ہیں؟''

کسان نے جواب دیا۔ ''یہ کھیت تو میرے ہیں لیکن ...گندم نہ جانے کس کی ہے!'' (۱۸)

38

''بالے سے میری لڑائی زندگی میں صرف ایک بار ہوئی۔'' خوشیا کا بیان ہے۔

یہ دونوں امام صاحب کا میلہ دیکھنے گئے تھے۔ اقبال نے پیسوں کو احتیاط سے رکھنے کی جبلت اپنی ماں سے ورثے میں حاصل کی تھی اور اس معاملے میں بڑے بھائی کی ضد تھے۔ چنانچہ خوشیا نے اپنی اَٹھنی بھی اقبال کی دوانّی کے ساتھ رکھوا دی۔ کھانے کا وقت آنے پر معلوم ہوا کہ اقبال وہ سارے پیسے ایک اندھے فقیر کی نذر کر چکے ہیں جو رو رو کر بھیک مانگ رہا تھا۔

''تم نے بددیانتی کی ہے!'' خوشیا نے سخت لہجے میں کہا۔ اقبال کوئی جواب دیئے بغیر ہجوم میں گم ہو گئے اور پھر بہت دنوں تک خوشیا کو دکھائی نہ دیئے۔

پورے دو مہینے بعد ایک دن اُس کی ماں نے اُسے بتایا کہ اُس کی غیر موجودگی میں بالا آیا تھا اور ایک اٹھنی دے کر چلا گیا ہے۔ خوشیا اُسی وقت میر حسن کے یہاں پہنچا۔ اقبال اُسے دیکھ کر فوراً کمرے سے باہر نکل آئے۔

''تمہاری اٹھنی تمہیں واپس مل گئی ہے۔ اب ہم پھر دوست ہیں۔'' (۱۹)

39

مولوی میر حسن کے دوستوں میں سے ایک حکیم نوالدین تھے۔ یہ حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد میں سے تھے اور قرآن و حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ طبّ میں ان کی مہارت کے پیشِ نظر مہاراجہ کشمیر نے انہیں اپنا طبیب مقرر کیا تھا چنانچہ قیام جموں میں تھا۔ کبھی کبھی اپنے آبائی گاؤں بھیرہ آتے ہوئے سیالکوٹ میں قیام کرتے اور دوستوں سے ملتے۔

ایک دفعہ میر حسن اپنے شاگرد محمد دین بھٹی کے ساتھ حکیم نورالدین کو اسٹیشن چھوڑنے جا رہے تھے۔ راستے میں حکیم صاحب کو نہ جانے کیوں وہ واقعہ یاد آ گیا جب بسترِ علالت پر رسول کریمؐ نے فرمایا تھا کہ لاؤ میں وہ چیز لکھ دوں جس سے اُمت کبھی گمراہ نہ ہوگی اور حضرت عمر فاروقؓ نے جواب دیا تھا کہ نہیں، قرآن ہمارے لئے کافی ہے۔ یہ بات یاد کر کے وہ میر حسن سے بولے۔

''دیکھا! ہمارے جدِ امجد نے کہا 'حسبنا کتاب اللّٰہ' ''

میر حسن اگرچہ سُنّی تھے مگر حضرت علیؓ کی اولاد میں سے تھے۔ انہوں نے فوراً جواب دیا۔

''...آپ کے جدِ امجد نے یہ بھی فرمایا تھا۔ '**لولا علی لھلک عمر**'... (اگر علی نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا)'' (۲۰)

بظاہر تو یہ حاضر جوابی کا شگوفہ ہے مگر دیکھا جائے تو اس میں تفضیلِ علی کا ایک پہلو نکلتا ہے۔ یعنی جس ہستی نے کتاب اللہ کو مسلمانوں کے لئے کافی سمجھا اسے بھی قرآن کے بعد حضرت علیؓ کی ضرورت محسوس ہو کر رہی۔

میر حسن کی وہابیت اپنی جگہ مگر اس دلچسپ جواب سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ اقبال کے

ناقدین کو اُن کی طبیعت میں جو ذرا سا تشیع نظر آتا تھا اُس میں کسی نہ کسی حد تک میر حسن صاحب کا اثر بھی کارفرما رہا ہوگا۔

40

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا تیسرا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء کو لاہور میں منعقد ہوا اور چار دن جاری رہا۔ خان بہادر سردار محمد حیات خاں صدارت کر رہے تھے اور شرکت کیلئے لاہور آنے والوں میں خود سرسیّد شامل تھے۔

لاہور اسٹیشن کی سرخ عمارت اُس روز کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ سرسید کی خوش قسمتی سے ڈبہ وہیں رکا جہاں میر حسن اپنے لڑکے ذکی اور ایک پہلوان علی بخش منہار کے ساتھ کھڑے تھے۔ پہلوان نے دیکھا کہ سفید داڑھی والے بزرگ کو اُترنا دشوار ہو رہا ہے تو اپنے دونوں بازو پھیلا کر اُن کی مشکل آسان کر دی۔

اِس اجلاس میں مرأۃ العروس والے ڈپٹی نذیر احمد پہلی دفعہ تشریف لائے تھے۔ اُن کی باغ و بہار طبیعت کی وجہ سے اُن کا لیکچر خاصا مقبول ہوا۔

ایجوکیشنل کانگریس کے آخری روز طلبہ نے سرسیّد کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا، جس میں قوم کی تعلیمی حالت اور اُردو زبان کے سلسلے میں ان کی خدمات کو سراہا گیا۔

غالباً یہ واقعہ بھی اسی موقع کا ہے کہ سرسیّد نے اسکاچ مشن کالج (سیالکوٹ) کے طلبہ سے کہا۔ ''یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم مسلمان ہو کر عیسائیوں کے کالج میں پڑھتے ہو۔ تمہیں اپنے مذہب کے حقائق کا علم نہیں۔ تم پادریوں کے زیرِ اثر آ جاؤ گے۔''

اس پر میر حسن نے کہا۔ ''یہ قصور میرا ہے۔ مجھ سے پڑھنے کے لیے یہ وہاں داخل ہوئے ہیں۔''

سرسیّد نے طلبہ کو دوبارہ مخاطب کیا اور کہا۔ ''اگر ایسا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ پھر تو سب مسلمان بچوں کو اسکاچ مشن کالج میں داخل ہونا چاہیئے۔'' (۲۱)

اُس وقت اقبال کی عمر بارہ سال سے کم تھی۔ اگر وہ اپنے شاہ جی کے ساتھ جلسہ میں شریک ہونے آئے تھے تو یہ غالباً واحد موقع ہوگا جب انہیں سرسید کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ میر حسن کے ساتھ نہیں آئے تھے کیونکہ محمد ذکی نے اپنے انٹرویو میں اس موقعے کا ذکر کرتے ہوئے ان کا کہیں نام نہیں لیا۔

41

گلاب دین نے میٹرک پاس کرلیا تھا۔

میر حسن نے اُس کے جمع کیے ہوئے روپے اُس کے حوالے کیے اور کہا۔ ''لاہور جا کر تعلیم حاصل کرو۔ بی اے کرو، مختاری کا امتحان بھی دینا۔ بھوکے بھی مرنے لگو تو لاہور مت چھوڑنا۔''

گلاب دین لاہور روانہ ہو گیا۔

42

اُردو ہندی کا جھگڑا معاشرے کی فضا پر اثر ڈال رہا تھا۔ میر حسن کے دوست لالہ بھیم سین خود فارسی کے عالم تھے مگر آریہ سماج تحریک سے متاثر ہو کر اپنے لڑکے کنور سین کو مڈل میں عربی پڑھنے سے روک دیا۔

مگر وہ میر حسن کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔

اُس کا رجحان دیکھتے ہوئے میر حسن نے اپنے دوست کو مشورہ دیا کہ کنور کے لئے عربی پڑھنا بہتر رہے گا۔ اور پھر یہ ہوا کہ دونوں دوستوں نے شطرنج بھول کر کنور سین پر شرط لگا دی۔

کنور، گھر پر اب پنڈت جی سے سنسکرت پڑھنے لگا اور میر حسن کے پاس جا کر اُن سے عربی۔ دیکھنا تھا کہ کس مضمون میں اُس کے زیادہ نمبر آتے ہیں۔

43

۲۳ مارچ ۱۸۸۹ء کو مرزا غلام احمد نے لدھیانہ (پنجاب) میں اپنے ایک مرید کے گھر سے یہ اعلان کیا کہ خدا نے مسلمانوں کو اُن کی بیعت کا حکم دیا ہے۔ سب سے پہلے جس نے بیعت کی وہ حکیم نورالدین تھے۔

یہ اُس متنازعہ تحریک کی چھوٹی سی ابتدا تھی جو آگے چل کر اس خطے کی سیاست میں کئی ہنگاموں کا بہانہ بنی۔

44

۱۸۸۹ء کے اوائل میں اقبال نے چھٹی جماعت پاس کی اور کنور سین نے مڈل۔ اُس کے سنسکرت

سے عربی میں نمبر زیادہ آئے تھے۔

لالہ جی شرط ہار گئے اور اُسے انٹرنس میں عربی پڑھنے کی اجازت دے دی۔

45

ساتویں جماعت میں بھی وہی مضامین تھے جو چھٹی میں ہوتے تھے مگر ریاضی میں جبر ومقابلہ کا اضافہ ہوگیا تھا جس کی نصابی کتاب ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب نے شائع کی تھی۔ ۱۶۳ صفحات ۴ آنے ۶ پائی۔

46

۱۳ مارچ ۱۸۹۰ء کو سیالکوٹ سے جموں تک ریل گاڑی کا افتتاح ہوا۔ ۲۴ میل کے سفر کا پانچ آنے کرایہ مقرر ہوا تھا مگر پہلے دو دن ہر شخص کو مفت سفر کرنے کی اجازت تھی۔ یہ معلوم نہیں کہ اقبال اور اُن کے دوستوں نے اِس تفریح میں حصہ لیا یا نہیں مگر اسی مہینے ساتویں جماعت کے امتحان ہوئے جن میں اقبال پاس ہوگئے۔

47

اپریل میں اقبال آٹھویں جماعت یعنی تھرڈ مڈل میں آگئے۔

اختیاری مضامین میں وہ عربی اور فارسی ایک ساتھ لے سکتے تھے۔ اِن کے علاوہ سنسکرت، ایلیمنٹری سائنس، اصول اقلیدس اور الجبرا تھے جنہیں چھوڑتے ہوئے اقبال کو بہت خوشی ہوئی ہوگی۔ ہیڈ ماسٹر نرنجن داس جنرل نالج پڑھاتے تھے جس کی نصابی کتاب مختصر تاریخ ہند بارہ آنے کی ملتی تھی۔ یہ کتاب مطبع مفید عام (لاہور) میں چھپی تھی اور لیتھ برج کی انگریزی تاریخ کا ترجمہ تھی۔

ماسٹر ہرنام سنگھ انگریزی، ریاضی، علم مساحت، حفظانِ صحت اور جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ انگریزی کی ریڈر پیارے پرن سرکار کی مرتب کی ہوئی تھی جبکہ حفظانِ صحت کی نصابی کتاب کا نام تھا

Cunningham's Sanitary Primer

شاہ جی عربی، فارسی اور اُردو پڑھاتے رہے۔

عالی جناب حضرت ملکہء معظمہ وکٹوریا قیصرہ ہند کی سوانح عمری میں سے بعض حالات۔ مرتبہ میرزا بیگ خان....

۲۴ مئی ۱۸۱۹ء کی صبح کو کہ سہانا وقت اور موسم بہار تھا۔ ہر طرف سبزہ اور ہر سمت گلزار تھا۔ جارج سوم شاہ انگلستان کے چوتھے فرزند ارجمند شہزادہ ایڈورڈ ڈیوک آف کنٹ کے مشکوے دولت میں بمقام قصر کنسنگٹن ایک دختر بلند اختر تولد ہوئی...

سلسہ تعلیم پنجاب اُردو کورس

مرتبہٗ لالہ رام کشن صاحب۔ منشی امیر چند صاحب اور مولوی مرزا بیگ خاں صاحب

مطبع عام لاہور

عربی کی کتاب تحفتہ الادب تھی ''یعنی الف لیلہ، اخوان الصفا، کلیلہ دمنہ اور تحفہ ناصریہ کا انتخاب جو اپر اسکولوں کی ادنیٰ جماعت کے واسطے تیار ہوا''۔ یہ بھی مفید عام لاہور سے چھپی تھی اور قیمت گیارہ آنے تھی۔

48

۱۸۹۰ء کے اواخر میں مرزا غلام احمد کا ایک اور دعویٰ منظر عام پر آیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام زندہ سلامت آسمان پر نہیں اُٹھائے گئے تھے بلکہ صلیب سے اُتر کر صحت یاب ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے وادیٔ کشمیر پہنچ کر طبعی موت پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی مرزا غلام احمد نے بتایا کہ وہ مسیح موعود جس کے آنے کا تذکرہ احادیث میں آیا ہے وہ یہ خود ہیں۔

اِس دعوے کے بعد احمدی تحریک نے بہت سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ پنجاب میں انگریز مشنریوں کی تقاریر سے زخم کھائے ہوئے مسلمان بہتیرے تھے۔ اُن میں سے بعضوں نے ایک زندہ نبی کے سہارے کو خوش آمدید کہا اور تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ دوسروں نے اس قسم کی باتوں کو اپنے عقائد پر حملہ قرار دیا اور مرزا غلام احمد کی مخالفت پر کمر بستہ ہوئے۔

49

جمشید علی راٹھور مسجد حسام الدین میں بیٹھے تھے۔ وہ امام بی کے ایک غریب عم زاد کے لڑکے تھے۔ وہ بھی سیالکوٹ میں رہتے تھے اور مولوی میر حسن سے پڑھتے تھے۔
اُس وقت اقبال تلاوت کر رہے تھے اور سننے والے محو تھے کیونکہ اُن کی آواز میں بڑا سوز تھا۔ میر حسن مسجد میں داخل ہوئے اور اُنہیں دیکھ کر اقبال نے رکنا چاہا۔ میر حسن نے اسے جاری رکھنے کا اشارہ کیا اور اقبال نے تلاوت پوری کر لی۔ شائد میر حسن کو بھی اُن کی آواز پسند آئی کیونکہ اُنہوں نے اقبال ہی سے اذان دینے کے لئے کہا۔ (۲۲)

50

''آنحضرتؐ اُس نوع انسانی میں موجود یعنی فردِ کامل ہیں'' ۔۔۔ ابن عربی نے فصوص الحکم میں لکھا تھا'' ۔۔۔ اور اسی لئے وجود کے حکم کا آپ سے آغاز ہوا اور آپ ہی پر انجام ہوا۔''
''آپؐ اُس وقت بھی نبی تھے جب آدمؑ پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔ پھر آپؐ ہی اپنی دنیاوی صورت میں خاتم النبین ہوئے اور اپنے پروردگار پر پہلی دلیل ہوئے...
محبت جو کائنات میں وجود کا اصل ہے، اُس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا۔ ''احبَ الیّ من دنیاکم ثلث... یعنی مجھکو تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں محبوب بنائی گئی ہیں۔ عورتیں اور خوشبو اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

51

''بچپن میں فصوص الحکم کا درس میرے گھر پر ہوتا تھا...'' اقبال کا بیان ہے (۲۳)، ''گو بچپن کے دنوں میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہ تھی تاہم محفلِ درس میں روز شریک ہوتا۔ بعد میں جب عربی سیکھی تو کچھ کچھ خود پڑھنے لگا اور جوں جوں علم اور تجربہ بڑھتا گیا میرا شوق اور واقفیت زیادہ ہوتی گئی۔''

52

ابن عربی نے لکھا تھا...'' اِس حدیث میں آنحضرتؐ نے عورت کا ذکر نماز سے پہلے کیا۔ کیونکہ مرد

عورت کا حصہ ہے چنانچہ مرد کے لئے عورت اپنے آپ کو پہچاننے کا ذریعہ ہے جس طرح نماز خدا کو پہچاننے کا۔ مگر اپنے آپ کو پہچاننا خدا کو پہچاننے سے پہلے ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔
'جس نے اپنے آپ کو پہچانا اُس نے خدا کو پہچانا'

''اور جب آپ کو عورتیں محبوب ہوئیں تو آپ نے اُن کی طرف ویسی ہی شفقت فرمائی جیسی کل کو اپنے جزو سے ہوتی ہے۔ خدا نے اپنی روح آدم میں پھونکی تھی۔ آدمی خدا کا جزو ہے لہٰذا خدا اُس سے محبت کرتا ہے۔ اسی طرح آدم کے پہلو سے عورت کو نکالا۔ عورت آدمی کا جزو ہے لہٰذا آدمی عورت سے محبت کرتا ہے۔

''خدا کی آدمی سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگاؤ کہ خدا اُس سے ملنے کا آرزومند ہے اور موت کے ذریعے اپنے بندے کو اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ دوسری طرف آدم نے عورت سے اس طرح محبت کی جس طرح کوئی اپنے نفس سے محبت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضورؐ کو عورتیں محبوب ہوئیں۔

''پس خدا کا محبوب آدم کی صورت میں پیدا ہوا۔ اور آدم کا جوڑا عورت کی صورت میں۔ یوں تین انفرادیتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ حق تعالیٰ۔ آدم۔ عورت۔

''پھر انسان نے حق تعالیٰ سے ویسی محبت کی جیسی جزو کو اپنے کل سے ہوتی ہے۔ اور عورت نے مرد سے ویسی جیسی جزو کو اپنے کل سے ہوتی ہے۔

''دیکھنا یہ چاہیے کہ مرد کی محبت عورت سے اس لئے ہے کہ وہ خود اُس کی اپنی صورت میں پیدا ہوئی ہے۔ اور وہ خود خدا کی صورت میں پیدا ہوا ہے۔ غور کرو کہ رسول اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھے عورتوں سے محبت ہے بلکہ یہ کہا کہ وہ (خدا کی طرف سے) میرے لئے محبوب بنائی گئی ہیں۔

''پھر جب مرد کو عورت سے محبت ہوئی تو وہ اُس سے وصال کا خواہشمند ہوا۔ جنسی خواہش تمام بدن میں پھیلتی ہے یہی وجہ ہے کہ اختلاط کے بعد نہانے کا حکم آیا۔ عورت سے وصال میں بھی مرد کے لئے ایک طرح کی فنا ہے۔ جس طرح خدا سے وصال میں فنا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد غسل کرنا اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ بندہ جو خدا کا محبوب ہے وہ اُس کے غیر سے لذّت اُٹھانے کے بعد جب اپنے اصل عاشق (یعنی خدا) کی طرف دوبارہ متوجہ ہو تو غیر کے ساتھ وصال سے پہلے والی کیفیت میں واپس پہنچ چکا ہو۔

''عورت کے بعد خدا کی طرف پلٹنا اور نظر کے ساتھ پلٹنا ضروری ہے۔ جب بندے نے خدا کو عورت میں دیکھا تو اُس نے خدا کا مشاہدہ اُس میں کیا جو مفعول ہے۔ جو خود مرد کی اپنی ذات سے ظاہر

ہوئی ہے۔ مگر جب بندے نے خود اپنے آپ میں خدا کو دیکھا... جب خدا کو دیکھتے ہوئے مرد کے ذہن میں عورت حاضر نہ ہو تو یہ گویا براہ راست خدا کا دیدار ہے۔

''لیکن خدا کا مکمل اور بہترین دیدار عورت ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مرد جب خدا کو عورت میں دیکھتا ہے تو اُس وقت وہ بیک وقت فاعل کے اعتبار سے بھی مشاہدہ کرتا ہے اور مفعول کے اعتبار سے بھی۔ کل کے اعتبار سے بھی مشاہدہ کرتا ہے اور جزو کے اعتبار سے بھی۔ فاعل اور کل تو وہ عورت کے مقابلے میں خود ہے۔ اور مفعول یا جزو عورت اس کے مقابلے میں ہے۔ یہ دیدار بہت بہتر ہے اس سے کہ مرد عورت کے تصور کے بغیر اپنے آپ میں خدا کو دیکھے...''

53

''پس جس نے عورتوں کو اس علم سے اور اِس حد تک محبوب رکھا تو اُس نے خدا سے محبت کی...'' (ابن عربی نے لکھا تھا) ''اور جس نے اُن کو اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے محبوب رکھا اُسے گویا اُس کی ہوس نے اصل علم سے دور رکھا ہوا ہے۔ اُس کے سامنے محض عورت کا جسم ہے، روح نہیں ہے۔

''وہ لوگ بھی جو اپنی بیویوں اور شرعی باندیوں تک محدود رہتے ہیں مگر اُن کے پاس صرف لذت لینے جاتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ یہ لذت لینے والا کون ہے اور کس سے لذت لے رہا ہے۔ نہ یہ جانتے ہیں کہ ان کے نفس نے انہیں بھی اُسی چیز سے بے خبر رکھا ہوا ہے جس سے غیر بے خبر ہے۔ انہوں نے اُس چیز کو تو محبوب رکھا ہے جو لذت کا ذریعہ ہے مگر اُس کی روح سے بے خبر ہیں۔''

54

جس حدیث کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اُس میں تینوں ناموں کی ترتیب قابل غور ہے۔

عورت مؤنث حقیقی ہے۔ اس کا ذکر پہلے آیا۔

خوشبو عربی میں مذکر ہے۔ اس کا ذکر درمیان میں ہوا۔

نماز عربی میں لفظی طور پر مؤنث ہے۔ اس کا ذکر آخر میں ہوا۔

اس طرح ایک مذکر لفظ دو مؤنثوں کے درمیان ہے۔ کائنات میں مرد کی یہی کیفیت ہے۔ وہ خدا اور عورت کے درمیان ہے۔ خدا مؤنثِ لفظی ہے کیونکہ اُس نے مرد کو تخلیق کیا اور تخلیق ایک نسوانی

خصوصیت ہے۔

مرد کے سامنے عورت ہے جو مؤنثِ حقیقی ہے۔

عورت، خوشبو، نماز--- خدا، مرد، عورت۔

ابن عربی، فصوص الحکم

55

اقبال بارہ تیرہ برس کے تھے۔

یہ دور عام طور پر لڑکپن کا ایک اہم دور ہوتا ہے۔ ایک طرف بلوغت کا آغاز اور نفسانی خواہشات کا اولین احساس۔ دوسری طرف کچھ پڑھنے اور سیکھنے کے دیرپا تجربے بھی عام طور پر اسی عمر میں حاصل ہوتے ہیں۔

اقبال اپنے دن کا زیادہ تر حصہ میر حسن کے گھر گزارتے تھے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مطالعے میں اُن کی سب سے زیادہ رہنمائی شاہ جی نے کی ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ اس دور کے بارے میں زیادہ معلومات ہمیں دستیاب نہیں ہیں۔ نصاب کے علاوہ کون سی کتب اُنہوں نے پڑھیں، اس کا صرف اندازہ ہی اندازہ ہے۔

بیدلؔ اور غالبؔ میر حسن کے پسندیدہ شعراء میں سے تھے۔ ان کے علاوہ فارسی، عربی اور اُردو کے دیگر کلاسیکی شعراء سے اقبال کا تعارف بھی میر حسن نے کروایا ہوگا۔ یہ بات معلوم ہے کہ اقبال نے علم عروض باقاعدہ سبق لے کر پڑھا تھا۔ ممکن ہے میر حسن سے پڑھا ہو۔ اس کے علاوہ ابجد اور تاریخ گوئی تو قریب قریب یقینی طور پر میر حسن سے سیکھی تھی۔

عمر کے اس حصے میں پہنچ کر ان کا وہ جذبہ ضرور توانا ہوا ہوگا جس نے بچپن میں اُن سے بازاری قصوں میں مصرعے لگوائے تھے۔ مگر دشواری یہ تھی کہ میر حسن کے سبق شاعری پر ختم نہیں ہوتے تھے۔

یہ بات قریب قریب یقینی ہے کہ شاہ جی نے تہذیب الاخلاق کے پرانے پرچے اپنے ہونہار شاگرد کے ہاتھوں میں تھمائے ہوں گے۔

''پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو!''

سر سیّد احمد اِن پرچوں کے مردہ کاغذوں سے نکل کر خطاب کرتے تھے...

''اور اے میری قوم کے بچو، اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تا کہ اخیر وقت میں اُس بڑھے کی

طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی جوان اُٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔''

مگر یہ قوم کی بھلائی کیا تھی؟ سرسیّد خاموش تھے۔ اُن کی اپنی زندگی سے معلوم ہوتا تھا کہ گلیوں گلیوں گھوم کر چندہ اکٹھا کرنا اور پھر اُس چندے سے ایک بڑا کالج کھولنا قومی بھلائی ہے۔ میاں جی کہتے ہوں گے کہ دنیاداری ترک کر کے اسلام کا مطالعہ کرنا اور خدا کی ذات میں فنا ہو جانا سب سے بڑی بھلائی ہے۔ میر حسن نے نہ جانے کیا بتایا ہوگا۔ شائد کہا ہو کہ انگریزی علوم حاصل کرنا۔

مگر ایک بات پر سب متفق نظر آتے تھے۔ شاعری کرنا قومی بھلائی نہیں ہے!!

56

اقبال کی نظر سے حالی کی مسدس کا یہ بند ضرور گزرا ہوگا، جس میں شعراء سے متعلق کہا گیا ہے۔

طوائف کو ازبر ہیں دیوان اُن کے
گویوں پہ بیحد ہیں احسان اُن کے
نکلتے ہیں تکیوں میں ارمان اُن کے
ثناخواں ہیں ابلیس و شیطان اُن کے
کہ عقلوں پہ پردے دیئے ڈال اُنہوں نے
ہمیں کردیا فارغ البال اُنہوں نے

اس کشمکش میں اقبال کی شخصیت کے اُس بہت بڑے تضاد کی پرورش ہوتی نظر آتی ہے جس نے اُن کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالا۔

اُن کا دل ہمیشہ سکون کا طلب گار رہا مگر وہ اُسے ہنگاموں کی طرف لے جانا اپنا فرض سمجھتے رہے۔ اُن کی روح شعر اور نغمے میں زندگی ڈھونڈتی رہی اور وہ اسے کتابوں کے مُردہ اوراق سے بہلاتے رہے۔ اس شکست و ریخت نے اُن کی شخصیت پر بہت سے اثرات مرتب کئے ہوں گے مگر جو بات سب سے واضح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کے کسی ابتدائی مرحلے میں ہی اُن کے لئے اپنی اندرونی کشمکش اتنی دلچسپ ہوگئی کہ دوسروں کو عمل کرنے میں جو لطف ملتا تھا وہ اُنہیں صرف سوچنے میں حاصل ہو جاتا تھا۔ یہی ایک فلسفی کی نفسیات ہوتی ہے۔

اقبال کی شخصیت کی اندرونی کشمکش کے نتیجے میں یہ سوال ہر قدم پر اُن کے سامنے ابھرتا نظر آتا ہے:
میں کون ہوں؟
اقبال کے آباؤ اجداد برہمن تھے۔ اُنہوں نے یہ سوچنے میں عمریں صرف کر دی تھیں کہ خدا کیا ہے۔ اقبال کو یہ سوچنا تھا کہ انسان کیا ہے۔ جیسے جیسے یہ سوال لاشعور سے شعور میں آتا گیا، اُن کی سوچ نکھرتی چلی گئی۔

57

زمانہ طالبعلمی میں اقبال پانچ زبانوں میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔
پہلی زبان پنجابی تھی، جسے وہ اپنی ماں سے سیکھے ہوئے مخصوص سیالکوٹی لہجے میں بولتے تھے۔
دوسری زبان اُردو تھی اور میر حسن کے کمرۂ جماعت میں واحد ذریعہ تعلیم کیونکہ وہاں پنجابی بولنا منع تھا۔ غالباً یہ سرسیّد کا اثر تھا جن کی تحریک میں اُردو زبان مسلمانوں کے اجتماعی وقار کی علامت بن گئی تھی۔
تیسری زبان عربی تھی، جس کا ایسا ذوق اقبال میں میر حسن نے پیدا کر دیا کہ اس زبان پر زیادہ توجہ نہ دینے کے باوجود یہ زندگی کے ہر قدم پر اُن کی مہارت کا ثبوت بن کر سامنے آتی رہی۔
چوتھی فارسی تھی، جو اقبال کا عشق تھی۔ ''لوگوں کو... معلوم نہیں کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل کے لئے سکول ہی کے زمانے میں کس قدر محنت اُٹھائی اور کتنے اساتذہ سے استفادہ کیا۔'' اقبال نے بعد میں کہا (۲۴)۔
اور آخری زبان انگریزی تھی، جو ترقی کا زینہ تھی اور اُنہیں اس زبان کے شعراء سے محبت بھی ہو چلی تھی۔

58

اسکول میں دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے میر حسن نے اقبال سے پانی منگوایا۔
پانی اتنا گرم تھا کہ پیا نہ جا سکا۔
''اقبال! سچ بتانا کہاں سے لائے ہو، باہر کے مَٹ سے؟''
اقبال نے معصومیت سے اقرار کر لیا۔

''تم دنیا کے کام کے نہیں ہو۔'' میر حسن نے کہا (۲۵)

59

مڈل کے امتحان کے لئے داخلہ فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۵ نومبر ۱۸۹۰ء تھی۔ فیس پانچ روپے اور کیریکٹر سٹرفکیٹ لازمی۔ امتحانی زبان انگریزی، اُردو، ہندی یا گرمکھی (پنجابی) ہوسکتی تھی۔ اقبال نے فارم پُر کرتے ہوئے اپنی عمر ۱۵ برس تحریر کی جبکہ حقیقت میں وہ تیرہ برس کے تھے۔ اس کی وجہ معلوم نہیں ہوسکی۔

امتحانی فارم کے جس کالم میں اُمید وار کو جاٹ یا راجپوت ہونے کی صورت میں نشاندہی کرنی تھی وہ اُس زمانے کی فضا سے ہم آہنگ تھا جب زندگی کا ہر اہم فیصلہ برادری کے تعلق سے بندھا ہوا تھا۔ فارم بھرتے ہوئے اقبال کے ذہن میں یہ تصور دوبارہ تازہ ہوا ہوگا کہ وہ سیالکوٹ کی کشمیری برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

اُنہی دنوں پنجاب میں عام بخار کی بیماری پھیل گئی۔ بچے خاص طور پر اس کا شکار ہوئے۔ اخبارات میں اپیلیں چھپنے لگیں کہ امتحانات جنوری ۱۸۹۱ء کی بجائے ایک مہینہ موخر کر دیئے جائیں۔

حکومت نے یہ درخواست مسترد کر دی۔

امتحان شروع ہونے کی تاریخ ۵ جنوری ۱۸۹۱ء تھی۔ اسکاچ مشن کے لڑکوں کے لئے اُن کا اسکول ہی امتحانی مرکز تھا۔

اقبال کا رول نمبر ۷۹۹ تھا۔

60

۲۸ دسمبر ۱۸۹۰ء کو الہ باد میں پانچواں اجلاس شروع ہوا جس میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے نام میں کانگریس کا لفظ کانفرنس سے تبدیل کیا گیا۔ علی گڑھ کالج کے طلبہ کی ایک کھیپ تیار ہوکر منظر عام پر آ چکی تھی۔ اِن میں سے بعض نے ''ڈیوٹی سوسائٹی'' بنائی تھی جس کا مقصد تحریک کے لئے چندہ اکٹھا کرنا تھا۔

''اس سوسائٹی کے ممبر ہماری قوم کے معزز اور قابل ادب خاندانوں کے لڑکے... چائے کی دکان لے کر یہاں آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ سخت دل جن کا دل پتھر سے بھی سخت ہے وہ ان کا تمسخر کریں...'' سرسیّد

نے اپنی تقریر میں کہا۔ مگر خدا نے کہا تھا کہ بعض پتھروں میں سے چشمے بھی نکلتے ہیں اور بعض خدا کے خوف سے پھسل بھی پڑتے ہیں۔ چنانچہ بوڑھے رہنما نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔ ''پس جو دل اس قسم کے پتھر کے بھی ہوں گے تو وہ دل بھی ضرور ان لڑکوں کو باعث افتخارِ قوم سمجھیں گے اور عمدہ علامت قومی ترقی کی خیال کریں گے۔''

میر حسن عام طور پر اِن اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔ لہٰذا خیال یہی ہے کہ وہ الہٰ باد ضرور گئے ہوں گے اور ایجوکیشنل کانفرس میں اُس نئے کارکن کا خیر مقدم بھی دیکھا ہوگا جسے آگے چل کر تحریک کے لئے بہت بڑے کام سرانجام دینے تھے۔ حیدر آباد (دکن) کے ہوم سیکرٹری مہدی علی خاں، جن کا خطاب نواب محسن الملک تھا، پہلی دفعہ کانفرس میں شریک ہوئے تھے۔

اجلاس ۳۰ دسمبر کو ختم ہوا۔

اور وہ طالب علم جسے چالیس سال بعد ٹھیک اِسی تاریخ کو اسی شہر میں اسی پلیٹ فارم سے قوم کی سیاسی تاریخ کا سب سے مشہور خطاب کرنا تھا، اُس وقت مڈل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، جس میں اب ۶ دن رہ گئے تھے۔

61

جنوری ۱۸۹۱ء

تین پرچے انگریزی کے، دو گھنٹے، دو گھنٹے، اور پندرہ منٹ کے

دو پرچے اُردو کے،

ایک پرچہ ریاضی، ایک مساحت کا

تین پرچے جنرل نالج کے۔ دو گھنٹے میں تاریخ، دو گھنٹے میں جغرافیہ، دو گھنٹے میں ابتدائی حفظانِ صحت۔

دو پرچے عربی کے، آدھا آدھا گھنٹہ،

تین فارسی کے۔ آدھا گھنٹہ۔ آدھا گھنٹہ۔ ایک گھنٹہ

اور اس کے بعد آزادی۔ کبوتر اُڑانے کی، پتنگ اُڑانے کی، خواب بنانے کی۔

62

۲۶ فروری

رول نمبر ۱۷۹۹ کے نمبر ۵۷۹ کل ۸۵۰ میں سے۔

سیالکوٹ میں سب سے زیادہ نمبر رول نمبر ۱۸۱۷ کے، ۶۵۹۔ اُس کا نام گنپت رائے۔

سیالکوٹ کے چار تمغوں میں سے کوئی تمغہ بھی رول نمبر ۱۷۹۹ کو نہیں ملا۔ مگر نمبر بُرے نہیں تھے۔

63

اپریل میں اقبال نویں جماعت میں داخل ہوئے جسے فورتھ ہائی کہتے تھے۔ لازمی مضامین میں سے حفظانِ صحت اور علم مساحت خارج ہو گئے۔ نرنجن داس کی جگہ لالہ نرسنگھ داس ہیڈ ماسٹر بن گئے اور بدستور انگریزی پڑھاتے رہے۔

Reading in Poetry (The Royal Reader)

سیکنڈ ہیڈ ماسٹر ہرنام سنگھ اب ریاضی اور جغرافیہ کے ساتھ ساتھ تاریخ بھی پڑھانے لگے جو پہلے نرنجن داس پڑھایا کرتے تھے۔ یہ تمام مضامین انگریزی میں تھے۔ تاریخ و جغرافیہ کا نصاب انگلستان اور ہندوستان کی تواریخ عام جغرافیہ اور ہندوستان کے جغرافیائی حالات پر مبنی تھا۔

عربی، فارسی اور اُردو شاہ جی پڑھاتے تھے۔

فارسی کا نصاب۔ اخلاق جلالی کے حصہ سیاست مدن، احسن القواعد اور انتخاب پر مبنی تھا۔

عربی کے نصاب میں مسلم الادب مرتبہ کرنل ہالرائڈ، مقدمۃ الصرف اور مفتاح الادب شامل تھیں۔

اقبال کی اُس زمانے کی انگریزی کتابیں موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی کتابوں پر دستخط کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔

This book now belongs to Mohammad Iqbal student of 9th class S. M. City Sialkot.

Mohammad Iqbal Student of 9th class of Scotch Mission School, Sialkot City.

64

مئی میں اسکاچ مشن والوں کو اپنا کالج کھولنے کی اجازت مل گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اقبال انٹرنس کے بعد بھی میر حسن سے پڑھ سکتے ہیں۔

65

لالو پہلوان کے بڑے بھائی کی دودھ کی دوکان تھی۔
لالو اقبال کا دوست تھا۔ کبھی کبھی اقبال بھی لنگر لنگوٹ کس کے اکھاڑے میں آ جاتے تھے (۲۶)۔
اگر اُن کا خیال تھا کہ اُن کی ذات میں چھپا ہُوا وہ دیو جو انہیں بار بار عملی دُنیا سے کھینچ کر تخیل کی طرف لے جاتا ہے اُسے وہ کشتی لڑ کر زیر کر لیں گے، تو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اُن کی بھول تھی۔

66

محرم کا مہینہ تھا۔ طلبہ اور اساتذہ جمع تھے۔
اسکاچ مشن کالج میں پرنسپل ینگسن عیسائیت کی تبلیغ کر رہے تھے۔
"یسوع مسیح نے مردے کو زندہ کر دیا مگر مسلمانوں کے رسول نے نہ معجزات دکھائے۔ نہ ہی نواسوں کی شفاعت کی۔"
میر حسن کی رگِ ظرافت پھڑکی۔ انہوں نے پادری صاحب کی بات کاٹتے ہوئے شوشہ چھوڑا۔
"ہمارے رسولؐ شفاعت لے کر گئے تھے مگر خُدا نے کہا کہ انہوں نے تو میرے بیٹے کو صلیب پر لٹکا دیا۔ میں آپ کے نواسے کو کیا کروں!"

67

اقبال نے سُن رکھا ہوگا کہ پہلے جہاں صرف مشن اسکولوں میں پڑھنے والے لڑکے عیسائی ہو رہے تھے۔ وہاں اب مسلمان عورتوں کی بڑی تعداد بھی عیسائیت قبول کرنے لگی ہے۔ اور ابھی تین سال پہلے ایک سیّد زادی نے اپنے بچوں سمیت مذہب تبدیل کیا ہے۔

عیسائیت کے خلاف اقبال کی نفرت جنون کی حد کے قریب پہنچی ہوئی تھی۔ میر حسن تو اس معاملے کو چٹکلے میں سمیٹ سکتے تھے مگر اقبال لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ شائد خدا سے بھی۔

پرنسپل پادری ینگسن سے انجیل کی کلاس میں الجھنا اقبال اور اُن کے دوست قائم الدین کا معمول تھا۔ مگر پادری ینگسن ہمیشہ حضرت عیسیٰؑ کی فضیلت ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ ذہنی میدان میں کسی سے مار کھانا اقبال کو شائد کسی عمر میں بھی گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ پے در پے ذہنی کشتی میں شکستوں نے اُنہیں ایسا زچ کیا کہ ایک دن جب ینگسن نے بحث کے دوران قرآن کی کوئی آیت پڑھی تو اقبال نے اُٹھ کر کہہ دیا۔ ''یہ آیت قرآنی نہیں ہے۔''

آیت قرآن میں موجود تھی۔ اور شائد اقبال جانتے بھی تھے، مگر یہ انکار اُن کی اُس ہیجانی کیفیت کا اظہار تھا جس میں وہ کبھی کبھی اپنے دل و دماغ کی حدود سے آگے نکل جاتے تھے۔ اس رفتار میں کبھی تو اُنہوں نے اُس روز کی طرح ٹھوکر کھائی۔ اور کبھی حور و فرشتہ کو اسیر کر گئے۔

اُس روز کے واقعے کے بارے میں اقبال کے ہم جماعت بشارت نے اپنے محسوسات یوں بیان کیے ہیں۔ ''میں دل میں کڑھتا رہا اور کبھی کبھی نعوذ باللہ خدا تک سے ناراض ہوتا رہا کہ اُس نے ناحق مسیح کو آسمان پر چڑھا کر مسلمانوں کو عیسائیوں کے سامنے ذلیل کروا دیا۔''

بشارت بعد میں احمدی ہو گئے۔

68

اس ذہنی پس منظر میں احمدیت کے ابتدائی پھیلاؤ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ مختلف لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر کسی نئے نظریے کو قبول کرتے ہیں، مگر یہ سوچنا دور از قیاس نہیں ہوگا کہ اُس زمانے میں جب پرجوش مسلمان اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنے کے لئے مذہب کے بنیادی صحیفے سے بھی نظریں چرانے پر تیار ہو سکتے تھے، ایک تازہ وحی پر ایمان لانا اتنا دشوار نہیں تھا۔ خاص طور پر ایک ایسی وحی پر جو یہ کہتی ہو کہ مسیح آسمانوں پر نہیں گئے تھے۔

سیالکوٹ میں جن لوگوں نے سب سے پہلے احمدیت اختیار کی اُن میں مولوی عبدالکریم کا نام بھی شامل ہے۔ یہ صاحب ایسے جذباتی تھے کہ مناظرے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو 'عیسائیوں کا مسیح'' کہہ کر گالیاں دیتے تھے۔ اگر کہیں شیعوں سے بحث ہوتی تو ''شیعوں کا علی'' کہہ کر خلیفۂ چہارم کی شان میں

جو دل چاہتا کہہ جاتے۔ عذر یہ ہوتا کہ میں اپنے حضرت عیسیٰ یا اپنے حضرت علیؓ کے بارے میں تو نہیں کہہ رہا۔ (۲۷ب)

اقبال مولوی عبدالکریم کی زبان درازی شائد حضرت عیسیٰ کے معاملے میں برداشت کرتے ہوں، شائد نہ کرتے ہوں، مگر حضرت علیؓ پر مولوی عبدالکریم سے اُن کا الجھنا مشہور ہے۔

دوسرے صاحب جنہوں نے سیالکوٹ میں احمدیت کو استحکام بخشا، وہ میر حسن کے اپنے چچا فیض اللہ کے تند مزاج بیٹے حکیم حسام الدین تھے۔

یہ بزرگ میر حسن کے برابر والے گھر میں رہتے تھے اور ڈیوڑھی بھی ایک ہی تھی۔ احمدیت قبول کی تو کچھ کتابیں شائد مرزا غلام احمد کی لے کر میر حسن کے پاس آئے اور عبارتیں دکھا کر غصے میں کہا۔ ''کہو مسیح فوت ہو گیا کہ نہیں؟''

میر حسن کے پیر و مرشد سرسید پہلے ہی حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کے نظریئے کی حمائت میں تھے اگرچہ اُن کے دوبارہ آنے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ میر حسن نے بھی آرام سے کہہ دیا۔ ''فوت ہو گیا ہوگا۔''

اب حکیم صاحب بولے۔ ''پھر آئے گا؟''

میر حسن کی رگِ ظرافت پھڑکی۔

''میر فیض اللہ مر کر آئے ہیں؟'' اُنہوں نے برجستہ کہا۔

حکیم حسام الدین کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ ''بے ایمان۔ کافر۔ منکرِ خدا اور سول'' کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

کچھ دن بعد میر حسن اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، جو مشترکہ ڈیوڑھی میں شروع ہوتی تھیں۔ حکیم حسام الدین کی نظر کمزور تھی، لہٰذا آہٹ سن کر پوچھ بیٹھے۔ ''کون ہے؟''

میر حسن نے جواب دیا۔

بے ایمان۔ خدا اور رسول کا منکر۔''

حکیم حسام الدین لپک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

بھیا! تمہاری انہی باتوں نے تو ہمیں مارا ہے۔''

بہرحال مسجد حسام الدین جہاں چند برس پہلے مولوی عمر شاہ سے اقبال نے قرآن سیکھا تھا اب سیالکوٹ میں احمدیت کے فروغ کا مرکز بن گئی۔

میر حسن نے احمدیت کے بارے میں اپنے رہنما سے دریافت کیا تو انہوں نے لکھ کر بھیجا۔

مخدومی مکرمی!

...مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے کیوں لوگ پیچھے پڑے ہیں۔ اگر اُن کے نزدیک اُن کو الہام ہوتا ہے، بہتر۔ ہم کو اس سے کیا فائدہ۔ نہ ہمارے دین کے کام کا ہے نہ دنیا کے۔ اُن کا الہام اُن کو مبارک رہے۔ اگر نہیں ہوتا تو صرف ان کے توہمات اور خلل دماغ کا نتیجہ ہے۔ تو ہم کو اس سے کیا نقصان ہے۔ وہ جو ہوں سو ہوں، اپنے لئے ہیں۔ میں سنتا ہوں کہ آدمی نیک بخت اور نمازی پرہیزگار ہیں۔ تو یہی امر ان کی بزرگداشت کو کافی ہے۔

جھگڑا اور تکرار کس بات کا ہے۔ ان کی تصانیف میں نے دیکھیں۔ وہ اسی قسم کی ہیں جیسا کہ اُن کا الہام۔ یعنی نہ دین کے کام کی نہ دنیا کے کام کی۔

مولوی حکیم نورالدین صاحب کی کوئی تحریر میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ دینیات میں کسی کا الہام جب تک اس کو شارع نہ تسلیم کر لیا جائے، کسی کام کا نہیں۔ تقدیر علم الٰہی کا دوسرا نام ہے۔ ماکان و مایکون۔ علم الٰہی میں یا یوں کہو تقدیر میں کچھ تغیر و تبدیل نہیں کر سکتے۔ پس کسی کے الہام سے کسی کو دنیا میں کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ پس ایسی بے سود بات کہ بالفرض اگر سچ بھی ہو تو بھی کچھ فائدے کی نہیں اور اگر جھوٹ بھی ہو تو بھی ہمارے نقصان کی نہیں، اُس پر متوجہ ہونا اور اوقات ضائع کرنا ایک لغو کام ہے۔

والسلام۔ خاکسار

سید احمد

علی گڑھ ۹ دسمبر ۱۸۹۱ء

سر سیّد نے شائد مولوی نورالدین کی کوئی تحریر نہ دیکھی ہو مگر میر حسن کے پاس ایک پوسٹ کارڈ موجود تھا جو مولوی نورالدین صاحب نے غالباً جموں سے بھیجا تھا۔ اگلی مرتبہ وہ سیالکوٹ آئے اور مرزا صاحب کی بات چھیڑی تو میر حسن نے کہہ دیا۔ ’’وہ قرآن کی غلط تاویلیں پیش کرتے ہیں، حالانکہ یہ کوئی اصولی چیز نہیں۔ دوسرے معاملات میں کیسے اُن کا اعتبار ہو سکتا ہے۔ دیگر، مرزا صاحب کو لکھنا نہیں آتا۔ جس کتاب کو اُٹھاؤ حاشیہ در حاشیہ چلی جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ انکے دماغ میں کوئی مطلب صاف نہیں۔‘‘

مولوی نورالدین نے اپنی تحریروں کے بارے میں دریافت کیا تو میر حسن نے جیب سے پوسٹ کارڈ نکال لیا۔ ''آپ تو سوال کا پورا جواب بھی نہیں دے سکتے۔تشنہ چھوڑ جاتے ہیں...میں نے آپ سے دوا پوچھی (تھی)۔آپ نے دوا لکھ تو بھیجی لیکن یہ نہ بتایا کہ اِسے کھاؤں،سونگھوں،گھس کر لگاؤں یا گھوٹ کر پیوں۔نہ وزن لکھا کہ ماشہ کھاؤں،تولہ کھاؤں یا من کھاؤں۔''

یہ سن کر مولوی نورالدین خاموش ہو گئے (۲۸)۔

69

عطا محمد کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ وہ ابتدا ہی میں احمدی ہو گئے تھے اور احمدیت کے ۳۱۳ ''سابقون الاولون'' میں سے تھے۔

عطا محمد کے بیٹے اعجاز احمد کا بیان ہے کہ شیخ نور محمد بھی شروع شروع میں وابستہ ہوئے اور ۱۹۰۲ء تک رہے۔اُن کے مطابق امام بی کو بھی مرزا غلام احمد سے عقیدت تھی۔

اقبال کے بارے میں یہ بات تو یقینی ہے کہ وہ ابتدا میں تحریک سے ہمدردی رکھتے تھے اور اُسے پنجاب میں اسلام کا ایک طاقتور مظہر جانتے تھے۔مگر اُن کے تحریک سے وابستہ ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے بلکہ حقائق اِس کے برعکس نشاندہی کرتے ہیں۔ممکن ہے یہ سیّد میر حسن کا اثر بھی رہا ہو (۲۹)۔

70

مجمعِ تعلیم کا یہ گو چھٹا اجلاس ہے
ہم مسلماں اور وہی نکبت وہی افلاس ہے

ایجوکیشنل کانفرنس کے جس اجلاس میں مولانا حالی نے یہ نظم سنائی وہ ۲۸ دسمبر تا ۳۰ دسمبر ۱۸۹۱ء علیگڑھ میں منعقد ہوا۔اس میں پہلی دفعہ عورتوں کی تعلیم کے حق میں قرارداد منظور ہوئی۔''اور یہ تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ عورتوں کی مذہبی،علمی اور اخلاقی زندگی میں ترقی ہو۔'' سرسید خود عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔مگر قرارداد منظور ہونے پر خاموش ہو گئے۔

71

اقبال کی دوسری بڑی بہن طالع بی کی شادی غلام محمد سے ہوگئی۔ یہ کافی ہوشیار آدمی تھے۔ میاں جی نے یہ دیکھا تو کاروبار میں ان سے مدد لینا شروع کی۔ اُنہوں نے بڑی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور میاں جی نے خدا کا شکر ادا کیا۔ تھوڑی ہی مدت میں سارا کاروبار ان کے سپرد کر کے خود ہمہ اُوست کی گہرائیوں میں کھو گئے۔

72

اقبال بہت رقیق القلب ثابت ہوئے تھے۔ وہ اپنے سامنے کسی جانور کو ذبح ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکتے تھے۔ ممکن ہے اس میں ان کے برہمن خون کا اثر بھی رہا ہو کیونکہ اب تک ان کے گھرانے میں گائے کا گوشت نہ پکتا تھا (۲۹)۔

میاں جی ایک عرصے تک قربانی کے بکرے اپنے ہاتھ سے ذبح کرتے آئے تھے مگر پھر ایک چھوٹے سے واقعے نے ان کی ہمت بھی ختم کر دی۔ عطا محمد نے بقرعید سے بہت پہلے ایک دنبے کا بچہ بھیجا تھا تا کہ وہ قربانی کے دنوں تک پل کر بڑا ہو جائے۔ وہ میاں جی سے کچھ زیادہ ہی مانوس ہو گیا۔ آخر جب ذبح کا وقت آیا تو اُس نے اس قدر حیرت اور افسوس کے ساتھ میاں جی کی طرف دیکھا کہ وہ بے اختیار وہاں سے ہٹ گئے اور قصاب سے کہہ دیا کہ وہ خود ذبح کرے۔ اس کے بعد وہ کبھی قربانی کے موقع پر کھڑے نہ ہو سکے اور جانور بھی عید سے دو ایک دن قبل خریدا جاتا تھا۔

''مجھے اُس دنبے کی نگاہیں یاد آ جاتی ہیں۔'' وہ اکثر کہتے تھے (۳۰)۔

73

میر حسن اپنے شاگردوں کو سائیں کیسر شاہ کے واقعات سنا رہے تھے۔ محمد دین بھٹی اور اقبال بھی موجود تھے۔

''ہم سائیں کیسر شاہ کے پاس موجود تھے۔ گھر میں شور ہوا۔ سائیں کیسر شاہ اُٹھ کر اندر گئے۔ پوچھا۔ 'بھائی، شور کیوں ہے؟' جواب ملا کہ جو لوٹا کل آپ لائے تھے، نہیں ملتا۔ سائیں کیسر شاہ بولے۔ 'جب میں یہ لوٹا لایا تھا تو کوئی شور نہیں ہوا تھا، آج کیوں شور ہوا؟'''

محمد دین بھٹی نے دیکھا کہ اقبال جھوم رہے تھے۔(۳۱)

تصوف کا ایک مرکزی نکتہ یہ ہے کہ جو شخص نگاہ رکھتا ہے وہ آغاز دیکھ کر ہی انجام سوچ لیتا ہے۔ بچہ اپنی پیدائش پر روتا ہے تو اِسے یوں سمجھنا چاہیئے کہ وہ اپنی موت پر رو رہا ہے کیونکہ جب پیدا ہوا ہے تو موت بھی آئے گی۔ دوست سے بچھڑنے کا غم اُس وقت کر لینا چاہیئے جب دوست سے ملاقات ہو کیونکہ ملاقات کبھی نہ کبھی ختم ضرور ہوگی۔ رومی نے لکھا تھا کہ پرندہ فضا میں اُڑتے ہوئے دانہ دیکھتا ہے اور نیچے اُترتا ہے۔ پھر جال میں پھنس جاتا ہے۔ تب فریاد کرتا ہے۔ اُسے دانہ دیکھتے ہی فریاد کرنی چاہیئے تھی تاکہ جال سے محفوظ رہتا۔ جال نظر آنے کے بعد فریاد کرنا بے کار ہے۔ نگاہ وہی ہے کہ وہ چیز دکھا دے جو نظر نہ آ رہی ہو۔

74

میر حسن نے کوئی سوال پوچھا۔

اقبال کی نگاہیں آسمان پر تھیں جہاں کبوتر محوِ پرواز تھے۔ شائد اُنہیں شاہ جی کی آواز سنائی ہی نہ دی۔

میر حسن نے اُنہیں دوبارہ پکارا اور جب اقبال شرمندہ سے ہو کر اُن کی طرف متوجہ ہوئے تو کہا۔

''علم کتابوں میں تلاش کرو۔'' (۳۲)

باب ۴

گجرات کا قید خانہ

۱۸۹۳ء تا ۱۸۹۶ء

1

سا۔رے۔گا۔ما۔پا۔دھا۔نی۔سا

یہ مشق نویں جماعت کی درسی کتاب *Readings In Poetry* کے ایک صفحے پر لکھی جا رہی تھی (۱)۔
اسی کتاب کے ایک اور صفحے پر اقبال نے راگ کے سُر تحریر کیے:

دھا خرج (خاص) ری گا دھا (خاص)

یا (خاص) گا ری سا ری گا

وہ ستار بجانا سیکھ رہے تھے یا گائیکی؟

بہرحال یہ بات طے ہے کہ موسیقی اور شاعری کو الگ کرنا اُن کے بس میں کبھی نہ ہُوا۔ گزرے ہُوئے دنوں کا وہ بچہ جس نے دو پیسے والے قصے گاتے ہوئے اپنی طرف سے مصرعہ لگایا تھا، آج کا یہ طالبعلم جو شاعری سیکھ رہا تھا اور آنے والے برسوں کا حکیم الامّت جو "طاؤس و رباب آخر" کہنے والا تھا، اصل میں سب ایک تھے۔

2

معلوم ہوتا ہے بحرِ رمل اقبال کو سب سے زیادہ پسند آئی تھی (۲)۔ اِس میں روانی تھی۔ نغمگی تھی۔ غالب کی یہ مشہور غزل بھی اسی بحر میں تھی۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

3

شاعری کا ایک اور علم تاریخ گوئی تھا اور اقبال نے یہ بھی سیکھا۔ اگرچہ ریاضی سے اُن کی دلچسپی مدت ہوئی ختم ہو چکی تھی مگر حروفِ ابجد کا حساب لگانا اُنہیں اب بھی دلچسپ معلوم ہوتا تھا (۳)۔ یہ حقیقت ہے کہ تاریخ گوئی میں جسے مہارت ہو جائے پھر وہ اکثر مصرعوں کو پڑھتے ہوئے اُن کے اعداد پر لاشعوری طور پر توجہ دیتا رہتا ہے اور ممکن ہے کہ اقبال کی بھی یہی کیفیت رہتی ہو۔

ابجد

ا=۱ ب=۲ ج=۳ د=۴

ہوز

ہ=۵ و=۶ ز=۷

حطی

ح=۸ ط=۹ ی=۱۰

کلمن

ک=۲۰ ل=۳۰ م=۴۰ ن=۵۰

سعفص

س=۶۰ ع=۷۰ ف=۸۰ ص=۹۰

قرشت

ق=۱۰۰ ر=۲۰۰ ش=۳۰۰ ت=۴۰۰

ثخذ

ث=۵۰۰ خ=۶۰۰ ذ=۷۰۰

ضظغ

ض=۸۰۰ ظ=۹۰۰ غ=۱۰۰۰

4

اگر چہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا مگر اندازہ ہے کہ شائد انہی دنوں اقبال نے مشاعروں میں حصہ لینا شروع کیا ہوگا۔

سیالکوٹ میں مشاعرے ہوتے تھے۔ عشق پیچہ کے متعلق بعد میں اقبال نے کہا کہ وہ شاعر نہیں تھے، تگ بندی کرتے تھے (۴)۔ جلوہ صاحب کا یہ معاملہ تھا کہ ذات کے قصائی تھے اور ان کے اشعار سن کر ایک دفعہ میر حسن نے کہا تھا۔ ''سچ پوچھو تو تم نے اشعار کا جھٹکا کر دیا ہے۔''

مشاعروں میں عشق پیچہ صاحب کی مخمس کر یلے نامہ مقبول تھی

سچ پوچھو تو ہوتے ہیں مزیدار کریلے

ممکن ہے اقبال نے شروع میں اپنا شوق میر حسن سے چھپایا بھی ہو کیونکہ شاعری میں اقبال کا اوّلین ہیرو غالب یا بیدل نہیں بلکہ... مرزا خاں داغ دہلوی تھے!

داغ کے بارے میں میر حسن کیا رائے رکھتے ہوں گے، اس کا اندازہ یوں لگانا چاہیے کہ مسدسِ حالی میں ''ناپاک شاعری'' کی جتنی خصوصیات گنوائی گئی تھیں داغ کے یہاں بالترتیب وہ سب کی سب موجود تھیں۔ ان کا طرۂ امتیازی ہی یہ تھا کہ طوائفوں کو سب سے زیادہ انہی کے اشعار یاد تھے اور گویوں پہ سب سے زیادہ انہی کے احسان تھے۔

اور ممکن ہے کہ شروع میں داغ کی زبان کا یہی جادو اقبال کو اُن کی طرف لے گیا ہو۔

5

اقبال مارچ ۱۸۹۲ء میں اسکول کا امتحان دے کر دسویں جماعت میں آ گئے جو انٹرنس بھی کہلاتی تھی اور ففتھ ہائی بھی۔

نصاب میں *Learned Men's English* کا اضافہ ہوا جس پر اقبال نے درج کیا:

S. Mohd. Iqbal 637, student of
10th class, Scotch Mission School,
Sialkot.

اس سال لالہ جگن ناتھ اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنے جو کبھی یہیں کے طالبعلم رہ چکے تھے۔ نرسنگھ داس کی جگہ انگریزی کی کلاسیں بھی وہی لینے لگے۔

6

''اقبال حساب میں کمزور تھے''۔ اُن کے ہم جماعت فضل الٰہی کا بیان ہے۔ ''اِس لیے مجھے حساب میں اُن کی مدد کرنے کا شرف حاصل ہے۔ اور فارسی اُن کا محبوب مضمون تھا، اس لئے میں اُن سے استفادہ کرتا تھا۔'' (۵)

7

غالباً اب اقبال نے اپنے مستقبل کے لئے سوچنا شروع کر دیا ہوگا۔

وکالت کا پیشہ ہندوستانی نوجوانوں میں بہت مقبول ہو رہا تھا۔ سر سیّد کے لڑکے سیّد محمود نے تقریباً بیس سال پہلے لندن سے بیرسٹری کی سند حاصل کی تھی۔ خواہ میر حسن نے اقبال کے ذہن میں یہ بات ڈالی ہو یا اقبال نے خود ہی سوچا ہو مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُسی عمر میں وہ وکیل بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اگر سر سیّد کا بیٹا وکیل تھا، تو وکالت میں ضرور قومی خدمت کا کوئی پہلو رہا ہوگا۔ اور ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں مسلمان قانون دانوں کی ضرورت بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

مگر پھر شادی کی بات چل نکلی۔

8

گجرات میں ایک کشمیری نژاد سرجن اقبال کے بڑے بھائی کے ہم نام رہتے تھے۔ حکومت کی طرف سے خطاب یافتہ تھے اور خان بہادر شیخ عطا محمد کہلاتے تھے۔ حال ہی میں ترکی سے لوٹے تھے اور

اب پنجاب میں جنرل ڈیوٹی پر تھے۔ ان کے یہاں ایک لڑکا اور پانچ لڑکیاں تھیں۔ بڑی لڑکی اقبال کی بہن کی ہم نام تھیں یعنی برکت بی بی جو ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء کو پیدا ہوئی تھیں اور اٹھارہ برس کی ہو چکی تھیں (۶)۔ خان بہادر صاحب صوفی طبیعت کے آدمی تھے۔ شیخ نور محمد کے بارے میں سنا تو اُن کے لڑکے کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے پر آمادہ ہو گئے۔

اقبال کو خبر ہوئی تو جان بچانے کیلئے ہاتھ پاؤں مارے مگر میاں جی اور بھائی صاحب دونوں ہی اُس نئی تہذیب سے ناواقف تھے جو ہندوستان کے وکٹورین عہد میں فروغ پا رہی تھی۔ اگلے وقتوں میں شادیاں اس لئے جلدی ہوا کرتی تھیں کہ لڑکا دوڑنے پھرنے کے قابل ہوتے ہی باپ کا پیشہ سنبھال کے بیٹھ جاتا تھا۔ اگر اقبال کو میر حسن نہ ملے ہوتے تو شائد بہت پہلے ہی بے جی انہیں ٹوپیوں کی دکان پر بٹھا چکی ہوتیں یا میاں جی نے کسی مسجد میں پیش امام رکھوا دیا ہوتا۔

مگر یہ زمانہ اور تھا۔ اقبال کے سامنے تو ابھی رسمی تعلیم کے سات سال پڑے تھے۔ اُس کے بعد وکالت کا امتحان دینے کے لئے مزید ایک دو برس۔ پھر چند برس پیشے میں قدم جمانے کے لئے۔ اس کے بعد کہیں جا کر وہ شادی کا تصور کرنے کے قابل ہوتے۔

یہ بات میاں جی سمجھ سکتے تھے نہ بے جی۔ سب سے بڑھ کر بھائی صاحب اس شادی پر بضد نظر آرہے تھے۔ آخر اُنہوں نے بھی تو زندگی میں کوئی اور کام کرنے سے پہلے شادی کی تھی، اور اُن کے بااثر سسرال والوں کی سفارش نے اُن پر مستقبل کے دروازے کھول دیئے تھے۔ ایسے میں وہ یہ بھول گئے ہوں گے کہ اُسی بااثر سسرال کی بیٹی کو انہوں نے طلاق دے کر گھر سے نکالا تھا۔ شائد اُنہوں نے سوچا ہوگا کہ اقبال کے مستقبل کی ضمانت بھی یہی ہے کہ کسی اُونچے گھرانے میں اُن کی شادی ہو جائے۔ لڑکی کی عمر دُلہا سے زیادہ تھی مگر اِسے نظرانداز کیا جا سکتا تھا۔

سماج کے نقطۂ نگاہ سے اقبال اور کریم بی بی کی شادی اقبال اور کریم بی بی کے سوا اور سب کا مسئلہ تھی۔ چنانچہ اقبال نہ نہ کرتے رہ گئے اور دونوں طرف کے بڑوں نے ایک دوسرے کا منہ میٹھا کر دیا۔

شادی کی تیاریوں کے لئے تقریباً ایک سال کا وقت درکار تھا۔

9

سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ گھر میں آنے والی دلہن کی جگہ بنائی جائے۔

فاطمہ بی اور طالع بی کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ مرحوم چچا کی یتیم بچیوں کی شادیاں یا تو ہو چکی تھیں یا پھر اگلے چند برسوں میں ہو گئیں۔ گجری زندہ تھیں یا نہیں، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ نہ ہی یہ معلوم ہے کہ مرحوم چچا کی بیوہ اُس وقت تک حیات تھیں یا نہیں۔ مگر پھر بھی دو کوٹھڑیوں والا مکان اب چھوٹا پڑنے والا تھا۔ سال کے آخر تک عطا محمد نے برابر والا چھوٹا مکان خریدنے کا بندوبست کر لیا۔

وہ مکان دسمبر ۱۸۹۲ء میں شیخ نور محمد کے نام لکھوا دیا گیا (۷)۔

10

انٹرنس کے امتحانی فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ ۴ فروری ۱۸۹۳ء تھی اور فیس دس روپے۔ فارم پر اقبال نے اپنی عمر ۱۷ سال لکھی جو اصل عمر سے دو سال زیادہ تھی۔

11

دسویں جماعت میں ۱۴ لڑکے تھے۔ ایک اُستاد نے امتحان لینا چاہا تو کسی وجہ سے سب نے بائیکاٹ کر دیا۔ ان میں اقبال بھی شامل تھے۔ صرف ایک لڑکے نے امتحان دیا۔ ہیڈ ماسٹر جگن ناتھ نے، جو میر حسن کا پڑھایا ہوا تھا، لڑکوں پر جرمانہ کر دیا اور اس دفعہ میر حسن کی رسوائے زمانہ آزاد خیالی بھی کسی کے کام نہ آئی۔ اُنہوں نے لڑکوں سے کہا۔

''میں ہوتا تو (دوگنی رقم) جرمانہ کرتا۔ اب جا کر جرمانہ دو اور امتحان میں بیٹھو''۔

12

پنجاب میں انٹرنس کے دو امتحانی مراکز تھے۔ دہلی اور گجرات۔ اقبال کو رول نمبر ۸۸۰ ملا تھا اور مرکز گجرات تھا۔

13

۳ مارچ کو پہلا پرچہ ہوا۔

انگریزی میں ترجمہ کرو:

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ شروع میں آریا آفتاب پرست تھے......

انگریزی کا پرچہ اے (ٹرانسلیشن) لالہ جیارام نے ترتیب دیا تھا، جو اُس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے تھے۔ اُن کا نام پرچے کی پیشانی پر درج تھا۔

دوسرے پرچے پر محمد شاہ دین کا نام لکھا تھا، جو لاہور کے سرکردہ میاں خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی عمر صرف پچیس برس تھی مگر بیرسٹر تھے اور جدید طرز کی نظمیں لکھتے تھے۔ ہمایوں تخلص کرتے تھے۔ شمالی ہندوستان میں ان کی علمی قابلیت کے چرچے تھے اور ممکن ہے اقبال نے بھی ان کا نام سن رکھا ہو۔

PUNJAB UNIVERSITY
ENTRANCE EXAMINATION 1893
ENGLISH - PAPER B

EXAMINEE: Muhammad Shah din, B.A. Bar at -Law

1. Define:- Etymology, pronoun, Indefinite Article, Definitive Mood, Irregular Verb, Acce, Hyperbole, Me..... nymy.

II- Give the plural of:- Calf, roof, nero.... me

III-Illustrate by constructing short sentences the uses of *that, but, as* and *since.*

IV- Show by giving examples, the difference between (a) a simple, a complex and...

V- Correct the following sentences...

VI- Pare the italicized words in the following...

VII- (a) Write a short essay on any one of the following subjects:-

1. Town and country life.
2. How to spend a holiday.
3. Object Lessons
4. Improvement of vernacular literature.
5. Education of women.

(b) Write a short letter to your father describing the relatives of yours at Lahore or elsewhere.

انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، عربی اور فارسی کے امتحان دینے کے علاوہ اقبال نے گجرات میں اور کیا

کیا، یہ معلوم نہیں۔ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ وہ خان بہادر صاحب کے گھر نہیں گئے ہوں گے، کیونکہ یہ عمل اُس زمانے کے لحاظ سے معیوب تھا۔ کئی سال بعد جب اُن کی آواز قدرے اہمیت کے ساتھ سنی جانے لگی تو اُنہوں نے اِس رواج پر احتجاج بھی کیا (۸)۔ اگرچہ شادی اُن کی مرضی کے خلاف ہو رہی تھی مگر اُس دوشیزہ کو دیکھنے کی کوئی خواہش تو انہوں نے اپنے دل میں محسوس کی ہوگی جو چند ہفتوں میں اُن کی منکوحہ بننے والی تھی۔ ممکن ہے اپنے محبوب شاعر کے اشعار گنگناتے ہوئے لوٹے ہوں: رہے کیا مصطفیٰ آباد میں داغؔ!

تغافل مرنے والے سے کہاں تک
ہمیں جینا پڑا ہے امتحاں تک
مزے کی ہے ہماری بھی کہانی
کوئی پہنچا دے اُن کے قصہؔ خواں تک

مرزا خاں داغ دہلوی

14

پسرور کی طوائف بیراں دتی کنجنی سیالکوٹ پہنچ گئی تھی۔ اُسکے آنے سے بارات مکمل ہوگئی (۹)۔ اُن دنوں طوائفوں کا مجرا شادیوں کا ایک اہم جزو ہوتا تھا۔

15

غالباً ۲ مئی کو اقبال دُلہا بنے گھوڑے پر سوار تھے جب شاہ جی کے منجھلے بیٹے اور اقبال کے دوست محمد ذکی دوڑتے ہوئے اُن کے پاس آئے۔ اُن کے ہاتھ میں تار تھا، جس میں امتحان پاس کرنے کی مبارکباد تھی (۱۰)۔ یہ تار اُن کے ہونے والے خسر نے بھیجا تھا۔

امتحان پاس کرنے والوں کی فہرست میں اقبال کا نام قابلیت کے لحاظ سے آٹھویں نمبر پر تھا۔

۱۶

''منکہ محمد اقبال ولد نور محمد المعروف شیخ نتھو... اِس وقت عقدِ نکاحِ من مُقر رہمراہ مسمات کریم بی بی دختر شیخ عطا محمد صاحب ڈاکٹر رئیس گجرات بمقابلہ مہر مبلغ دو ہزار... نصفِ آں معجّل و نصفِ آں موجل...''

حافظ غلام احمد نے نکاح پڑھایا، جو شاہ دولہ کے دربار (گجرات) کی مسجد کے امام تھے۔
بارات میں بیس پچیس افراد شامل تھے۔ بہنیں، بہنوئی، شیخ نور محمد، حاجی نور محمد، میر حسن (جو نکاح کے گواہ) تھے، اُن کے لڑکے تقی اور ذکی، حکیم حسام الدین، اُن کے لڑکے حامد شاہ، اقبال کے پہلے اُستاد عمر شاہ، میراں بخش جلوہ وغیرہ (۱۱)۔

پیراں دِتّی کا مجرا ایک بند کمرے میں ہوا جہاں سے بچوں کو باہر رکھا گیا تھا۔
بے جی شائد دُلہن کے استقبال کے لیے سیالکوٹ ہی میں رُکی ہوں۔
نکاح ۴ مئی کو ہوا اور بارات اُسی رات واپس پہنچ گئی۔
اقبال کی نئی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا

دی جان کس خوشی سے تہِ تیغ داغؔ نے
لب پر تبسم اور نظر یار کی طرف

17

اسکاچ مشن ہائی اسکول میں اقبال نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے تھے۔ کھتری ذات کا جگن ناتھ دوسرے نمبر پر تھا۔ میرٹ لسٹ کے پہلے بیس طالبعلموں کو گورنمنٹ اسکالرشپ ملتا تھا۔ اقبال اور جگن ناتھ دونوں کو یہ اسکالرشپ ملا۔
شادی کے اگلے روز ۵ مئی کو اسکاچ مشن کالج میں اقبال کا داخلہ ہوا۔ انگریزی، ریاضی اور عربی لازمی مضامین تھے۔ اِن کے ساتھ ایک اختیاری مضمون لینا تھا۔ اقبال نے ایک ایسے مضمون کا انتخاب کیا جو اُنہوں نے اسکول میں نہیں پڑھا تھا۔
فلسفہ!

18

انگریزی اور فلسفہ ریورنڈ جارج واخ پڑھاتے تھے۔ نصاب میں والٹر اسکاٹ کا ناول Marmon اور ضربُ الامثال کی کتاب *Proverbs and Their Lessons* شامل تھی۔

Lecture I THE FORM AND DEFINITION OF PROVERB
Lecture II: THE GENERATION OF PROVERB
Lecture III: PROVERBS OF DIFFERENT NATIONS COMPARED
Lecture IV: THE POETRY, WIT AND WISDOM OF PROVERBS
Lecture V: THE MORALITY OF PROVERBS
Lecture VI: THE THEOLOGY OF PROVERBS
Appendix: ON THE METRICAL LATIN PROVERBS OF THE MIDDLE AGES

اس کے علاوہ *Longman's School Composition* تھی مگر وہ اگلے برس پڑھائی گئی ہوگی کیونکہ اُس پر اقبال نے اپنے نام کے ساتھ ایف اے کلاس لکھا ہے جبکہ گیارہویں جماعت کو عام طور پر فرسٹ ائر کہا جاتا تھا۔

چارلس ڈکنز کا ناول *A Tale Of Two Cities* اور سر رچرڈ ٹمپل کی لکھی ہوئی لارڈ لارنس کی سوانح بھی نصاب میں شامل تھی۔ فلسفہ منطق، نفسیات اور سیاسی معاشیات پر مشتمل تھا۔ مندرجہ ذیل کتابیں نصاب میں شامل تھیں مگر یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان میں سے کون سی گیارہویں جماعت میں اور کون سی بارہویں میں پڑھائی گئی ہوں گی۔

Ray's Deductive Logic
Jardiner's Elements of Cognition
Fawcett's Political Economy for Beginners
Marshall's Eenonomics of Industry

رے کی کتاب کے باب ۹، حصہ سوم اور ضمیمہ نصاب سے خارج تھے۔ فاسیٹ اور مارشل کی کتابوں میں سے کوئی ایک کافی سمجھی گئی تھی۔ مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان مضامین کی تدریس صرف مجوزہ کتابوں تک محدود نہیں رکھی گئی۔

عربی بدستور مولوی میر حسن پڑھا رہے تھے۔ عربی کے دو سالہ نصاب میں یونیورسٹی کے مجوزہ انتخاب کے علاوہ احمد بن علی کی مرح الا رواح اور ھدایت النحو شامل تھیں۔

فارسی ایک مضمون کی حیثیت میں اقبال کو چھوڑنی پڑی مگر انہوں نے اپنے طور پر اِس زبان اور اس

کے ادب کی جستجو ترک نہیں کی۔

لالہ نرنجن داس، جنہوں نے پہلے ایک جماعت میں بھی اقبال کو پڑھایا تھا، ایک مرتبہ پھر اُن کے استاد تھے۔

ریاضی کا نصاب کچھ اس طرح تھا:

1. The Arithmetic
2. Algebra: Quadratic Equations; Theory of Quadratic Equations, Imaginary Expresssios, Arithmetical, Geometrical and Harmonial Progressions; Permuations and Comtenatios; Binomial and Exponential Theorems.
3. Plane geometry: Euclid (Books I -IV and VI-IX), the more important properties of the parabolas and eclipse
4. Trignometry: Methods of measuring Angles; Trignometrical ratios and the simple relations creating them; relations between trignometrical ratios of angles differing by multiples of right angles; Trignometrical transformation; Solution of triangles; Properties of triangles; Area of a circle

19

شبلی نعمانی تبدیلی آب وہوا چاہتے تھے۔ کشمیر اور الموڑہ میں کچھ روز گزارنے کی سوچ رہے تھے کہ اچانک معلوم ہوا پروفیسر آرنلڈ چھٹیوں پر انگلستان جانے والے ہیں۔ ان کے دل میں ترکی کے سفر کی ہوک اُٹھی اور جب آرنلڈ نے ساتھ لے چلنے کی حامی بھری تو اِنہوں نے سفر کا اعلان کر دیا۔ دوست احباب حیران ہوئے کیونکہ جہاز کی روانگی میں تین چار روز رہ گئے تھے۔ مگر شبلی کی سیمابی طبیعت سے یہ کہاں بعید تھا!

پہلے تو شبلی آرنلڈ کے شاگرد ہوا کرتے تھے کیونکہ اُن سے فرانسیسی پڑھی تھی مگر سفر کے دوران وہ آرنلڈ کے استاد بن گئے جب آرنلڈ ان سے عربی پڑھنے لگے۔ ایک روز جہاز کے انجن خراب ہوئے اور مسافروں کو اپنی جانوں کے لالے پڑے تو شبلی نے دیکھا کہ آرنلڈ نہایت اطمینان سے مطالعے میں مصروف ہیں۔ شبلی نے دریافت کیا تو کہنے لگے۔ ”اگر جہاز کو برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی

قابلِ قدر ہے۔''

قسطنطنیہ میں شبلی نے قدیم اسلامی مخطوطوں اور ایسی کتابوں کا مطالعہ کیا جو ہندوستان میں دستیاب نہیں تھیں۔ ان کی مدد سے وہ آئندہ برسوں میں مسلمان شخصیات عمر فاروقؓ، ابوحنیفہ اور مامون الرشید وغیرہ کے بارے میں بہت تفصیل سے کتابیں لکھ سکتے تھے۔

قسطنطنیہ ہی میں وہ ایک روز عربی لباس پہنے کہیں جارہے تھے کہ ایک ہندوستانی نے انہیں روک کر پوچھا۔''آپ ہندوستانی تو نہیں؟'' جواب میں اِن کے منہ سے ہاں کی بجائے نعم نکل گیا مگر وہ جھپٹ کر گلے لگے اور بولے۔''آپ تو ہماری چیز ہیں۔ ہم سے بچ کر کہاں جارہے تھے!'' معلوم ہوا یہ بمبئی کے حسن آفندی ہیں، مشہور قانون دان بدرالدین طیب جی کے چچازاد بھائی۔ یہ خود قسطنطنیہ کے متمول لوگوں میں سے تھے اور سلطان کے خطاب یافتہ تھے۔ قسطنطنیہ میں اپنی بیگم اور دو بچیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان میں سے چھوٹی لڑکی کی عمر بارہ برس تھی اور اُس کا نام عطیہ فیضی تھا (۱۲)۔

20

شادی کا مطلب تھا لڑکے کا ''بڑوں کی برادری'' میں داخلہ۔ ممکن ہے اب اقبال کو حقہ پینے کی اجازت مل گئی ہو۔

لیکن مشرقی طرزِ رہائش میں شادی شدہ زندگی کا تصور اُس سے بہت مختلف تھا، جو انگریز صاحبوں کے بنگلوں میں رائج تھا اور اُن کے زیرِ اثر دیسی معاشرے کے بالائی طبقے میں آہستہ آہستہ رائج ہو رہا تھا۔ یہاں شوہر اور بیوی کی مشترکہ خواب گاہ کا کوئی سوال نہ تھا اور بیوی دوسری عورتوں کے ساتھ سوتی تھی۔ اِس کے علاوہ بھی میاں بیوی کے درمیان بے تکلفی تو دور کی بات، حد سے بڑھی ہوئی شناسائی کا اظہار بھی کم از کم اُس وقت تک معیوب سمجھا جاتا تھا جب تک اُن کے بزرگ زندہ ہوں یا جب تک میاں بیوی خود بوڑھے نہ ہو جائیں۔

21

''کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا،'' بعد میں اقبال نے یاد کیا (۱۳)۔''میرا معمول تھا ہر روز نمازِ فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اِس دوران والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے

تلاوت کرتا دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے... وہ جیسے کسی خیال سے میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا... کہنے لگے، تم کیا پڑھا کرتے ہو؟ مجھے اُن کے سوال پر بہت تعجب ہوا۔ بہرحال، میں نے مؤدبانہ عرض کیا، قرآن پاک۔ کہنے لگے، تم جو کچھ پڑھتے ہو سمجھتے بھی ہو؟ میں نے کہا کیوں نہیں، تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں، کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ اُنہوں نے میرا جواب نہایت خاموشی سے سنا اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں حیران تھا...

''کچھ دن گزر گئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن اِس واقعے کو چھٹا روز تھا کہ صبح سویرے... والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو اُنہوں نے مجھے بلایا اور پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے۔ ''بیٹا! قرآن مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس پر نزول ہو... کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے یہ تم پر نازل ہورہا ہے۔ ایسا کروگے تو یہ تمہاری رگ و پے میں سرایت کر جائے گی۔''

میاں جی نے جو سوال پوچھنے کے بعد چھ دن کے وقفے سے جواب دیا تھا، یہ روائتی صوفی مرشدوں کا مخصوص انداز تھا۔ اور انہوں نے جو نصیحت کی تھی اُس کا براہ راست مآخذ بھی اُن کا تصوف نظر آتا ہے۔

22

''نظام دکن کا اُستاد ہونے کی وجہ سے (نواب مرزا خان صاحب داغؔ دہلوی) کی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی'' اقبال کے ایک دوست کا بیان ہے (۱۴)۔ ''لوگ جو اُن کے پاس نہیں جاسکتے تھے، خط وکتابت کے ذریعہ دور ہی سے اُن کے پاس جاتی تھیں اور وہ اصلاح کے بعد واپس بھیجتے تھے.... (ڈاک) کی سہولت کی وجہ سے سیکڑوں آدمی اُن سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے اور انہیں اس کام کے لئے ایک عملہ اور محکمہ رکھنا پڑتا تھا۔ شیخ محمد اقبال نے بھی اُنہیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں...''

23

اُن دنوں شاعری کے رسالے، جنہیں گلدستے کہا جاتا تھا، غالباً وہی مقام رکھتے ہوں گے جو آج ایک صدی بعد فلم اور فیشن کے رسالوں کو حاصل ہے۔

گلدستہ ''زبان'' (دہلی) کے ستمبر کے شمارے میں شرکت کے لئے طرح مصرع تھا (۱۵)

میرے آگے شکوۂ بیجا کا دفتر رکھ دیا

اور اِس دفعہ اقبال نے بھی غزل بھیجنے کا ارادہ کرلیا۔

24

غالب نے داغ کی شاعری کے متعلق کہا تھا کہ وہ اُردو زبان کو نہ صرف پال رہے ہیں بلکہ اس کو تعلیم دے رہے ہیں (۱۶)۔

اقبال کے بارے میں یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ شاعری کے ذریعے نہ صرف اپنی زبان کو پال رہے ہیں بلکہ اپنے ذہن کو تعلیم دے رہے ہیں۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس ابتدائی دور میں غزل کہتے ہوئے وہ کس کیفیت سے گزرتے تھے مگر اُن کی اوّلین غزل جو دستیاب ہے اُسے دیکھتے ہوئے اُن کے بارے میں کچھ اندازے ضرور لگائے جاسکتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ ایک نومشق کا کلام ہے۔ ممکن ہے غزل کہنے سے پہلے قوافی اکٹھے کئے گئے ہوں: لکیر۔ کوثر۔ بستر۔ مرمر۔ محشر۔ سکندر۔

شعر کہتے ہوئے جو تصورات اقبال کے ذہن میں آئے وہ اکثر داغ کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ محبوب کی تلوار۔ غیر۔ رخسار۔ نقاب۔ آئینہ۔

مگر اقبال جہاں زبان کی تیزی میں داغ سے متاثر تھے وہیں خیال کی بلندی کے لئے غالب کے سحر سے آزاد ہونا بھی اُن کے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ موت، قبر اور قیامت کے تصورات جنہیں غالب نے اپنے کلام میں جگہ جگہ دلچسپ انداز میں استعمال کیا تھا اور جن کا داغ کے یہاں مشکل ہی سے ذکر ملتا تھا وہ بھی اقبال کے پسندیدہ موضوعات ٹھہرے۔ غالب کے نزدیک عشق میں لطف جب تھا کہ محبوب کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوئے کوئی ایسی بات کہہ دی جائے کہ محبوب کو عاشق سے چھٹکارہ پانے کے بعد بھی سکون نصیب نہ ہو۔ اُن کی آوارگی موت پر ختم نہیں ہوجاتی تھی بلکہ قبر، قیامت اور جنت میں بھی جاری رہتی تھی۔ موت محض عاشق کی ایک ادا اور محبوب کا دل جیتنے کی ایک آخری کوشش کا نام تھا۔ قیامت کا دن ثواب اور گناہ کے فیصلے کا موقع نہیں بلکہ محبوب سے سرِ عام ملاقات کا بہانہ تھا جس میں نہ صرف خدا بلکہ ساری مخلوق عاشق اور محبوب کا معاملہ دیکھنے کے لئے موجود ہوتی۔

داغ نہ کوئی سنجیدہ شاعر تھے اور نہ ہی اُن کے یہاں موت کے بعد کا تصور تھا۔ وہ تو حسن کے سارے جلوے آج ہی سمیٹ لینے کے قائل تھے۔ اُن کے نزدیک تو محبوب کے احترام کی بھی کوئی خاص

ضرورت نہ تھی۔ اقبال نے جہاں اوائل جوانی میں داغ سے متاثر ہو کر یہ رنگ اختیار کیا وہاں غالب کے اِس قسم کے اشعار بھی اُن کے ذہن پر اثر انداز ہوئے:

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اُٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

25

شائد اگست کے کسی ہفتے میں اقبال نے اپنی غزل مکمل کی۔ قیاس یہ ہے کہ اس زمانے میں اُن کی خط و کتابت داغ کے ساتھ شروع ہو چکی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ غزل بھی پہلے اصلاح کیلئے انہی کو بھیجی ہو۔ زبان کے ستمبر کے شمارے میں اقبال کی غزل موجود تھی۔

غزل

آبِ تیغِ یار تھوڑا سا نہ لے کر رکھ دیا
باغِ جنّت میں خُدا نے آبِ کوثر رکھ دیا
ہے یقیں پھر جائے گا، جب دیکھ لے گا وہ صنم
غیر کے گھر آج مَیں نے اپنا بستر رکھ دیا
ہو نہ جائے پردۂ انوارِ حق تیرا نقاب
تُو نے گر اِس کو اُٹھا کر روزِ محشر رکھ دیا
ہاتھ دھو بیٹھ آبِ حَیواں سے، خُدا جانے کہاں
خِضر نے اُس کو چھپا کر، اے سکندر رکھ دیا

گلدستہ زبان (دہلی)
ستمبر ۱۸۹۳ء

26

اگلی دفعہ کا مصرع تھا:

خوب طوطی بولتا ہے اِن دِنوں صیّاد کا

27

خان بہادر صاحب سے اقبال مانوس ہو چلے تھے۔ اُن کے پاس کتابوں کا ذخیرہ تھا، اور اندھا کیا چاہے دو آنکھیں (۱۷)۔ روایت ہے کہ اقبال نے بہت سی کتابیں اُن سے لے کر پڑھیں اگرچہ ان کتابوں کے نام معلوم نہیں۔

کریم بی بی اور اقبال کی طبیعتوں میں اور جو بھی فرق رہے ہوں، مگر گجرات آنے میں ہر بار دونوں کو خوشی ہوتی تھی۔

غزل

کیا مزہ بلبل کو آیا شیوہ بے داد کا
ڈھونڈتی پھرتی ہے اُڑ اُڑ کر، جو گھر صیاد کا

جب دعا بہرِ اثر مانگی تو یہ پایا جواب
غیر رو کر لے گئے حصہ تری فریاد کا

بھول جاتے ہیں مجھے سب یار کے جور و ستم
مَیں تو اے اقبالؔ دیوانہ ہوں تیری یاد کا

گلدستہ زبان (دہلی)

نومبر ۱۸۹۳ء

غزل کے مقطع میں جو بھول اور یاد کے اکٹھے ہونے سے صنعتِ تضاد پیدا ہوئی ہے اُس پر شائد داغؔ سے بھی داد ملی ہو۔

28

شائد انہی دنوں گجرات میں سسرالی رشتہ داروں یا دوستوں نے غزل کہنے کی فرمائش کی ہوگی کیونکہ اقبال کے ابتدائی کلام میں ایک ایسی بے لطف غزل بھی موجود ہے کہ تُک بندی کے معیار پر بھی پوری نہیں اُترتی۔ اِس کا کوئی جواز اِس کے سوا پیش نہیں کیا جاسکتا کہ شاعر سے زبردستی کہلوائی گئی ہو اور شاعر کو سناتے ہوئے یہ خیال نہ ہو کہ سننے والوں میں سے کوئی فن کی باریکیوں کو دیکھنے والا بھی ہوگا۔ پوری غزل میں گیارہ اشعار ہیں اور ہر ایک دوسرے سے زیادہ پست اور بے رنگ

کام بُلبُل نے کِیا ہے مانی و بہزاد کا
برگِ گُل پر اِس نے فوٹو لے لیا صیّاد کا
ہو گیا اقبالؔ قیدی محفلِ گجرات کا
کام کیا اخلاق کرتے ہیں مگر صیّاد کا

29

۲۷ دسمبر کو علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا آٹھواں سالانہ اجلاس شروع ہوا جو تین روز جاری رہا۔ نواب محسن الملک اس دفعہ صدارت کر رہے تھے۔ تقریر کرنے والوں میں سیّد محمود اور میاں شاہ دین شامل تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے استقبالیہ نظم پڑھی۔ اس اجلاس میں علی گڑھ سے بی اے کرنے والے ایک کشمیری طالبعلم نے پہلی دفعہ اپنے اشعار سنائے۔ معلوم ہوتا تھا کہ حالیؔ کی اصلاحی شاعری اور ایک نوجوان کی تخلیقی فطرت کے امتزاج نے ایک نئے خوبصورت لہجے کو جنم دیا ہے

ہر سحر سنتے ہیں اِک آوازِ غیب
لیس للانسان الا ما سعیٰ

شاعر کا نام خوشی محمد ناظرؔ تھا۔

سید محمود کا لڑکا چار سال چار ماہ کا ہوگیا تھا۔ راس مسعود نام تھا۔ گول مٹول سا بچہ تھا۔ اس وقت اسٹیج پر محسن الملک اور اپنے دادا کے دوست راجہ جے کشن کے درمیان بیٹھا تھا۔ آج اُس کی بسم اللہ تھی۔

''یہ بچہ مجھ کو سب سے پیارا ہے۔'' سرسیّد نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتا تو دو چار ہزار روپیہ اِس تقریب میں غریب ہونے کے باوجود خرچ کر سکتا تھا... لیکن میں نے اپنے لڑکے سید حامد اور

اپنے لختِ جگر سید محمد احمد تک کو نہیں بلایا۔''

یہ کہہ کر انہوں نے پانچ سو روپے کی تھیلی نواب محسن الملک کے سامنے رکھی اور راس مسعود سے پوچھا۔''میاں، یہ روپیہ کس کو دیا جائے؟'' بچے نے پہلے سے سکھائے ہوئے جواب کو بڑی بے ساختگی سے دہرایا۔

''مدرسہ کو دے دیجئے۔''

اسکے بعد محسن الملک اور جے کشن نے بھی پانچ پانچ سو روپیہ مدرستہ العلوم (علی گڑھ کالج) کی نذر کیے۔اس طرح یہ تقریب سرسید کی اصلاحِ رسوم کی کوششوں کا حصہ بن گئی۔

اجلاس میں میر حسن نے اپنا مرتب کیا ہوا سیالکوٹ کے مسلمانوں کا تعلیمی جائزہ پیش کیا(۱۶)۔پچھلی مرتبہ جن دو تین سو نمائندوں کو نامزد کیا گیا تھا،اُن میں سے سترہ نے جائزے مکمل کئے تھے۔ ان کی روشنی میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ''مسلمانوں میں ترقی تعلیم کے لئے جمہوری کوشش کی ضرورت ہے۔''میر حسن نے اپنے مخصوص عملی رجحان کے تحت کہا۔

''جب تک عملی کوشش رزولیوشن کی تعمیل کے واسطے نہ کی جاوے گی اُس وقت تک تمام رزولیوشن مثل ردی کاغذ کے سمجھے جاویں گے اور یہ جلسہ تماشہ کا سمجھا جائے گا۔''

جواں سال بیرسٹر میاں شاہ دین نے مسلمان مزارعین میں بنیادی تعلیم کو فروغ دینے کی تجویز پیش کی۔

30

شائد اُسی وقت جب علی گڑھ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا آٹھواں اجلاس ہو رہا تھا،اقبال گجرات یا سیالکوٹ میں بیٹھے اپنی نئی غزل کے لئے قافیے تلاش کر رہے تھے(۱۷)۔طرح مصرع تھا۔

یہ اشارے مجھے پیغامِ قضا دیتے ہیں

غزل

جان دے کر تمہیں جینے کی دُعا دیتے ہیں

پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں

بد گمانی کی بھی کچھ حد ہے کہ ہم قاصد سے
قسمیں سو لیتے ہیں جب ایک پتا دیتے ہیں
ایسی ذِلّت ہے، مرے واسطے عزّت سے سوا
خود وہ اُٹھ کر مجھے محفل سے اُٹھا دیتے ہیں
موت بولی، جو ہُوا کوچۂ قاتل میں گزر
سر اِسی راہ میں مردانِ خدا دیتے ہیں
گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بُت اقبالؔ
حضرتِ داغؔ کے اشعار سُنا دیتے ہیں

گلدستہ زبان (دہلی)
فروری ۱۸۹۴ء

31

لدھیانہ کے ایک نومسلم سعداللہ سعدی اُن دنوں مرزا غلام احمد کی ہجو لکھا کرتے تھے اور منظوم گالیاں دیتے تھے۔ احمدی حلقوں میں روایت مشہور ہے کہ ۲۱ اشعار کی مندرجہ ذیل ہجو اقبال نے لکھ کر جماعت احمدیہ کے اخبارات میں شائع کروائی (۱۸)۔

واہ سعدی! دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی
مہتروں میں خُوب ہو گی قدردانی آپ کی

۱۸۹۴ء میں مرزا غلام احمد کے معاملے میں اقبال کے جذباتی ہونے کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ ابھی پچھلے ہی برس مرزا صاحب نے اپنی کتاب ''آئینہ کمالاتِ اسلام'' میں ملکہ وکٹوریہ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ پھر امرتسر کے ایک مناظرے میں بڑے دلچسپ انداز میں پادریوں کو نیچا دکھایا تھا۔

ہوا یہ کہ بعض پادریوں نے کوڑھیوں اور اندھوں کو مرزا صاحب کے پاس بھیجا اور کہلوایا۔ ''آپ مسیحِ موعود ہیں تو اِنہیں صحیح کر دیں۔'' مرزا صاحب نے مریضوں کو پادریوں کے پاس واپس بھیجتے ہوئے جواب دیا۔ ''حضرت عیسیٰ کی مسیحائی کا تذکرہ انجیل میں موجود ہے ہمارے قرآن میں نہیں۔ مگر آپ کی انجیل یہ بھی کہتی ہے کہ عیسائیوں کے دل میں اگر سرسوں کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا تو وہ پہاڑوں کو

ہلا کر رکھ دیں گے۔اب آپ انہیں اپنے ایمان کی قوت سے تندرست کر دیں"۔
اقبال کو اِس مناظرے کے بارے میں سن کر جو لطف آیا ہوگا وہ بیان کا محتاج نہیں۔

32

فرسٹ ائر میں کل ۲۰ طلبہ نے داخلہ لیا تھا۔آخری طالبعلم ۸ مئی ۱۸۹۴ء کو داخل ہوا۔
بیس میں سے صرف چار طالبعلم مسلمان تھے باقی ہندو، عیسائی اور سکھ تھے۔
۱۸۹۴ء کے کسی مہینے اقبال نے کالج کا امتحان پاس کیا اور سیکنڈ ائر میں پہنچ گئے۔

33

It was the best of times, it was the worst of times; it was the age of wisdom, it was the age of foolishness; it was the epoch of belief, it was the epoch of incredulity; it was the season of Light, it was the season of Darkness...
A Tale of Two Cities, p.1

اقبال نے نصاب کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں پڑھی ہوں گی کیونکہ اُن کا ذہن کسی ایک طرف لگ کر رہ جانے کا عادی نہ تھا۔ان کتابوں میں سے دو کے نام معلوم ہیں۔
ایک *English Men of Action* تھی جس پر انہوں نے حسبِ عادت اپنا اور کالج کا نام لکھا تھا۔
دوسری کتاب پر سال بھی درج کیا تھا: ۱۸۹۴ء۔یہ شیکسپئر کا مشہور ڈرامہ *Richard III* تھا:

Now is the winter of our discontent

Made glorious summer by this sun of York...

34

داخلہ فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ ۴ فروری ۱۸۹۵ء تھی۔امتحانی فیس دس روپے۔

35

معلوم ہوتا ہے بے جی کی کفایت شعاری یا میاں جی کے داماد کی ہوشیاری سے ایک دفعہ پھر کچھ روپیہ جمع ہوا تھا۔ شیخ عطا محمد نے گھر کے برابر والی دو دکانیں خرید کر میاں جی کے نام کر دیں۔ وہ شائد اُن دنوں چھٹیوں پر آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ اپنی نگرانی میں پرانے دونوں مکانوں اور ان دکانوں کو ملا کر ایک نیا دو منزلہ تعمیر کروانا شروع کر دیا۔ (۱۹)

36

شہر کا یہ حصہ نیا نیا آباد ہوا تھا اور اس کی صفائی اور خوبصورتی ایک نئی دنیا کا احساس دلاتی تھی۔ یوں نظر آتا تھا جیسے سارا شہر ایک دلفریب باغ ہے اور اس میں سنگترے اور آم کے درختوں کے درمیان کہیں کہیں دفاتر، کالج اور مکانات کھڑے ہیں۔ ان سب کو آپس میں ملانے کے لئے ایک لمبی چوڑی مال روڈ تھی جسے عوام ٹھنڈی سڑک کہتے تھے۔ اپنی صاف ستھری چکنی سطح کے لحاظ سے یہ سڑک کسی عجوبے سے کم نہیں تھی۔ یہ خوابوں کی دنیا انگریز کی قوتِ تعمیر کا معجزہ تھی۔ کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں گویا انسان کے ہاتھوں شکست کھانے والی فطرت کا نوحہ کر رہی تھیں۔

۱۸ تاریخ کو جب گورنمنٹ کالج لاہور کے ہال کمرے میں بیٹھے ہوئے اقبال پرچہ حل کر رہے ہوں گے تو باہر پھیلے ہوئے درختوں میں آباد چڑیوں کی خوشگوار آوازوں نے کمرۂ امتحان کی خاموشی کے حسن میں اضافہ کیا ہوگا۔ اُس وقت تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اقبال کو ابھی مزید پڑھنا ہے۔ چند ماہ بعد لاہور واپس آ کر اسی کالج سے بی اے کرنے کا تصور انہیں شائد کافی رومان انگیز محسوس ہوا ہو۔

ایف اے کے پرچوں کی ترتیب کے بارے میں صرف اِتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ ۲۱ مارچ کو ریاضی کا امتحان تھا، اور خاصا مشکل تھا۔ اگلے روز فلسفہ کا امتحان ہوا جسے اکثر طالبعلموں نے ''حسبِ لیاقت'' قرار دیا۔

37

سیالکوٹ میں نیا دو منزلہ مکمل ہو چکا تھا۔

۲۸ اپریل کو انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ نکلا۔ اسکاچ مشن کالج کے صرف چار لڑکے کامیاب ہوئے تھے۔

ان میں اقبال بھی شامل تھے۔ جنہوں نے ۵۷۰ میں سے ۲۷۶ نمبر حاصل کر کے دوسری ڈویژن پائی تھی اور ۴۶۶ اُمیدواروں میں سے چوہترویں پوزیشن پر رہے تھے۔ بہر حال یہ کامیابی تھی۔

بی اے میں عربی، انگریزی اور فلسفہ کے مضامین رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

38

اب اُن کے لاہور جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اُس زمانے میں ترقی کے راستے پر سیالکوٹ سے آگے بڑھنے والوں کے لئے لاہور سنہری مواقع کا شہر تھا۔

اقبال کی شریکِ حیات کریم بی بی کے سلسلے میں یہ طے پایا کہ لاہور میں اقبال کا قیام چونکہ کالج ہوسٹل میں رہے گا لہٰذا وہ اُن کے ساتھ نہیں جاسکتیں (۲۰)۔ ویسے اقبال کے بڑے بھائی بھی بیوی بچوں کو ساتھ نہیں رکھتے تھے بلکہ پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔ اُن دنوں لڑکی کا رشتہ براہِ راست سسرال سے اور بالواسطہ شوہر سے ہوا کرتا تھا۔

کریم بی بی کو البتہ یہ رعایت دی گئی کہ اقبال کی غیر حاضری کا عرصہ وہ اپنے میکے گجرات میں گزار لیا کریں۔ یہ معاملہ کس طرح طے ہوا اور اقبال اور اُن کے گھر والوں کا اس پر کیا ردِعمل تھا؟ اس ضمن میں روایات خاموش ہیں۔

39

میاں جی ایک روز کہنے لگے۔

''بیٹا! میں نے تمہاری تعلیم پر جو محنت کی ہے، مجھے اُس کا معاوضہ ادا کر دینا۔''

اقبال نے سعادتمندی سے حامی بھری تو اُنہوں نے کہا کہ وہ معاوضہ وقت آنے پر بتائیں گے اور پھر صوفیانہ بے نیازی کے ساتھ دوسری چیزوں میں محو ہو گئے (۲۱)۔

40

محلّہ والوں کو بوڑھے درزی کی خوشحالی کچھ زیادہ اچھی نہیں لگتی تھی۔ غالباً نیا دو منزلہ دور ہی سے نمایاں نظر آتا ہوگا۔

ایک پڑوسی نے تو زیادہ ہی قیامت ڈھائی۔ شیخ نور محمد کے مکان کی کھڑکیوں کے عین نیچے کھلے میدان میں بھٹیارن کا تنور لگوادیا جس کا دھواں سیدھا مکان میں آتا تھا۔ یہ صورتِ حال خاصی تکلیف دہ رہی ہوگی (۲۲)۔

غالباً انہی دنوں کی بات ہے۔ کسی روز ایک فقیر نے مکان کے دروازے پر آکر صدا لگائی۔ اقبال نے پہلے تو اُسے منع کیا مگر جب وہ کسی طرح ٹلتا نظر نہ آیا، تو اپنی چھڑی گھما دی۔ کشکول زمین پر گر گیا اور دن بھر کی کمائی ریزہ ریزہ بکھر گئی، جسے دوبارہ جمع کرنے کے لئے وہ بوڑھا فقیر بڑی بے چارگی سے زمین پر بیٹھ گیا۔

اور یہ منظر کہیں شیخ نور محمد نے دیکھ لیا۔

''بیٹا!'' اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''قیامت کے روز جب یہ فقیر خدا کے رسولؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا تو وہ مجھ سے جواب طلب کریں گے کہ خدا نے ہماری اُمت کا ایک فرد تیرے حوالے کیا تھا اور تُو اُس کی بھی تربیت نہ کر سکا؟ بیٹا! میری سفید داڑھی کی طرف دیکھ اور میری مٹتی ہوئی اُمیدوں کی طرف نظر کر!''

اقبال یہ سبق کبھی بھلا نہ سکے (۲۳)۔

41

اقبال کی زندگی کے ابتدائی اٹھارہ برسوں کی اہمیت یہی نہیں ہے کہ ان میں اقبال بڑے ہوئے بلکہ یہ ایک عہد تھا جس میں سیالکوٹ شہر اور اُن کے اطراف کا معاشرہ بھی اُن کے ساتھ ساتھ جوان ہو رہا تھا۔ اقبال کے بچپن میں جہاں چند مکانات ہوتے تھے وہ جگہیں اب گلیوں اور کوچوں میں تبدیل ہو چکی تھیں، جیسے ہنٹر پورہ۔ شہروں کے درمیان وہ سفر جو اقبال کی پیدائش کے وقت عموماً چھکڑوں میں بیٹھ کر طے ہوا کرتا اب اُس کے لئے ریل گاڑیاں عام ہو چکی تھیں۔ اِن سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کی آنکھوں کے سامنے سیالکوٹ چھوٹی صنعتوں کے ایک اہم شہر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جب اُن کی بہن کی شادی ہوئی تھی تو فضل الٰہی کی دکان پر یورپ سے درآمد کیا ہوا کھیلوں کا سامان بکتا تھا۔ مگر اب یہ سامان سیالکوٹ میں بننے لگا تھا اور صرف اقبال کے بہنوئی کی دکان پر نہیں بکتا تھا بلکہ خود یورپ کو بھی برآمد کیا جاتا تھا۔

غرض اقبال نے محنتی لوگوں کی مستقل مزاجی اور ہوشیاری کے ہاتھوں ایک پورے معاشرے کو

کروٹ بدلتے دیکھا تھا۔ وہ خود بھی اسی معاشرے کا ایک فعال شخص بننا چاہتے ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس زمانے میں اُن کے ذہن میں اپنے مستقبل کی جو تصویر اُبھرتی تھی وہ ایک مشہور شاعر کی نہیں بلکہ ایک دولتمند وکیل کی تصویر تھی۔ جب ماچسیں بیچنے والا گلاب دین اپنی محنت سے ایک کامیاب وکیل بن سکتا تھا تو وہ جن کی ذہانت پر اساتذہ کو ہمیشہ فخر رہا تھا وہ بھلا کہاں کہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔

42

جس دور میں اقبال جوان ہوئے تھے اُس دور کے مزاج میں معاشرتی ترقی کا جوش اور جذبہ رچا بسا ہوا تھا۔ ہندوستان نے ایک طویل نیند سے آنکھیں کھولی تھیں اور ابھی بیداری کے خمار کے زیر اثر تھا۔ اُس زمانے میں معاشرے میں خود اپنا مقام حاصل کرنے کے علاوہ اپنی برادری کی بھلائی کے لئے کچھ کرنے کا ایک رواج چل نکلا تھا۔

43

اور پھر ایک دن بوڑھے نور محمد نے اپنی محنت کا معاوضہ بھی بتا دیا۔ ''میں نے تمہاری تعلیم پر جو محنت اور روپیہ صرف کیا ہے اُس کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرو۔'' (۴۴)

شائد اس کے ساتھ ہی اقبال کے ذہن میں باپ کا وہ خواب بھی تازہ ہو گیا ہو جس کے مطابق اقبال کی پیدائش ہی اس لئے ہوئی تھی کہ وہ اسلام کی خدمت کر کے دنیا میں ناموری حاصل کریں۔

44

ستمبر ۱۸۹۵ء کی کسی تاریخ کو اقبال ریل گاڑی میں سوار ہو کر سیالکوٹ سے روانہ ہوئے۔

شائد اُس وقت کسی کو اندازہ نہ رہا ہو کہ اب وہ سیالکوٹ میں کبھی مستقل سکونت اختیار نہیں کریں گے۔ اور نہ ہی کبھی اپنی بیوی کے ساتھ دوبارہ ایک گھر میں رہ سکیں گے۔

باب ۵

حکیموں کا بازار

۱۸۹۶ء تا ۱۸۹۹ء

1

اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔

اقبال گورنمنٹ کالج میں اُس وقت داخل ہوئے جب نیا سیشن پرانا ہو چکا تھا اور ہاسٹل میں کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔

اس مشکل کا حل گلاب دین نے پیش کیا جن کی وکالت چل نکلی تھی اور وہ اپنے بھائی دروازے والے مکان میں ایک مہمان کا بوجھ باآسانی برداشت کر سکتے تھے (۱)۔

اُس وقت اقبال کی عمر اٹھارہ برس تھی، جسے وہ ریکارڈ کی غلطی کی وجہ سے بیس سمجھتے تھے۔ یہاں آنے پر اُن کا حلیہ کیا تھا، یہ معلوم نہیں، مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ لاہور میں قیام کے ابتدائی زمانہ میں شائد فیشن سے متاثر ہو کر وہ ایرانی بادشاہوں کی طرح نیچے کی طرف بڑھی ہوئی لمبی لمبی مونچھیں رکھتے تھے اور گول فریم کا چشمہ لگاتے تھے جس کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی آنکھوں میں بچوں جیسی حیرانی نظر آتی تھی۔ در حقیقت ان میں سے صرف بائیں آنکھ کام کرتی تھی۔

شام کو سورج غروب ہونے کے بعد پرانا شہر چراغوں اور لالٹینوں کی روشنیوں کے دامن میں پناہ

لیتا تھا۔ اور اس کے سرے پر کھڑے ہوئے شاہی قلعہ اور بادشاہی مسجد کے مینار انتہائی پراسرار معلوم ہوتے تھے۔ قلعہ انگریز فوج کا مستقر تھا اور شہریوں کو اس میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ البتہ مسجد نمازیوں کے لئے کھلی تھی جس کے ٹوٹے ہوئے مینار اور اُکھڑا ہوا پلستر پچاس ساٹھ برس پہلے کی یاد دلاتے تھے جب سکھ بادشاہ نے اسے اصطبل بنا دیا تھا۔

پرانے شہر کی ہیرا منڈی جو انیسویں صدی میں نئے شہر کی حدود میں بھی داخل ہو چکی تھی رنجیت سنگھ کے زمانے کی ایک اور یادگار تھی۔

2

گورنمنٹ کالج میں ایف اے سے ایم اے تک تقریباً سبھی شعبوں کی جماعتیں موجود تھیں۔ طلبہ کی کل تعداد ۲۶۴ تھی مگر حاضری اور امتحانات کے ڈھیلے ڈھالے قواعد کی وجہ سے بعض طلبہ جماعتوں سے غائب رہتے تھے (۲)۔

بی اے جس میں اقبال نے داخلہ لیا تھا اُس کی فیس آٹھ روپے ماہوار تھی مگر اس کی ادائیگی اپنی مرضی سے کسی وقت بھی کی جا سکتی تھی۔ غالباً ان تمام رعایتوں کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے میں برطانوی حکومت ہندوستانی طلبہ کو زیادہ تعداد میں مغربی تعلیم کی طرف راغب کرنا چاہتی تھی۔

بی اے فلسفہ میں پہلے منطق پڑھائی جاتی تھی۔ اقبال کی وہ درسی کتاب آج بھی محفوظ ہے جس میں اُنہوں نے جگہ جگہ important کے نشان لگائے تھے۔

لالہ جیارام کی شرافت ضرب المثل تھی۔ اُس زمانے کے دوسرے پروفیسروں کی طرح ان کے پاس بھی ذاتی کتب کا ذخیرہ تھا اور جب اُنہیں اقبال کے ذوق کا اندازہ ہوا تو اُنہوں نے اقبال کو اپنے ذخیرے سے فیض یاب ہونے کی اجازت دے دی۔

انگریزی پرنسپل ڈالنجر صاحب خود پڑھاتے تھے۔

عربی کا شعبہ اورینٹل کالج میں منتقل ہو چکا تھا جو ان دنوں گورنمنٹ کالج کے احاطے میں واقع تھا۔

اقبال کے عربی کے اُستاد غالباً مولوی محمد الدین فوقی تھے اور کشمیری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ عمر پینتالیس برس کے قریب تھی مگر عربی اور فارسی میں کئی کتابیں تحریر کر چکے تھے۔ ان دونوں زبانوں میں شعر بھی کہتے تھے۔

کالج میں اُن کے ہم جماعتوں میں ہر قسم کے لڑکے شامل تھے۔ میاں فضل حسین، جن کا تعلق لاہور کے ایک متمول گھرانے سے تھا۔ چودھری شہاب الدین، اَن پڑھ کسان کے لڑکے جنہیں تعلیم حاصل کرنے کے لئے گھر سے بھاگنا پڑا تھا۔ ان کی رنگت کالی سیاہ اور ہاتھ پاؤں لمبے چوڑے تھے۔ کالج میں داخلہ لینے سے پہلے کچھ عرصہ ریلوے اسٹیشن پر قلی رہے تھے (۳)۔

3

اسی برس کے آخری دنوں میں شیخ نور محمد یا اُن کے گھر والوں نے اُس پڑوسی کے خلاف مقدمہ کر دیا جس کی وجہ سے اُن کا گھر دھوئیں سے بھرا رہتا تھا۔ دیوانی عدالت میں تاریخیں پڑنے لگیں (۴)۔

4

وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ اُس زمانے میں اقبال نے کون کون سی کتابیں پڑھیں۔ مگر اُن کے ذاتی مجموعے میں سے مندرجہ ذیل کتابوں پر اُس زمانے کی تحریریں موجود ہیں (۵)۔

(1) Bernal Bosanquet: Essentials of Logic. London, McMillan (1895)

یہ کتاب بی اے کے نصاب میں شامل تھی۔ اس کے ہر صفحے پر سیاہ یا سرخ نشانات موجود ہیں اور جگہ جگہ important لکھا گیا ہے۔

(2) W. Stanley Jersons: Elementary Methods in Logic Deductive and Inductive. London, Macmilan (1890)

اس کے علاوہ بہت سی کتابیں ۱۸۹۵ء سے پہلے کی مطبوعہ ان کے مجموعے میں شامل ہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال نے اُنہیں کب پڑھا ہوگا۔ کالج کی لائبریری سے جو کتابیں اُنہوں نے پڑھیں اُن کی فہرست بنانا بھی ممکن نہیں ہے۔ اقبال کی سوانح میں یہ ایک بہت بڑا خلا ہے۔ اُن کی اصل زندگی اُن کا مطالعہ اور اُن کی فکر تھی مگر اُس زمانے میں اِس کے صرف مٹے مٹے سے نقش اُبھرتے ہیں جن میں رنگ بھرنا مشکل ہے۔ البتہ یہ بات قریب قریب یقینی ہے کہ بعض موضوعات میں اُن کی خاص دلچسپی تھی اور وہ ان کا گہرا مطالعہ کر رہے تھے۔

5

۱۔ آریاؤں کی تاریخ

اقبال کو اپنے آباؤ اجداد سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ پھر یہ اُس زمانے کا خاص موضوع تھا جس پر مستشرقین نے بے شمار کتابیں تحریر کی تھیں۔

۲۔ زردشت

ایرانی بھی آریا تھے۔ اقبال کے مجموعے میں ایک ایسی کتاب بھی ہے جس میں زردشتی مذہب کا عبرانی مذاہب سے، جن میں اسلام شامل ہے، موازنہ کیا گیا ہے۔

۳۔ مذہبی تجربہ

یہ خیال کہ روحانی تجربات کو عقل کی مدد سے پرکھا جاسکتا ہے یا نہیں، فلسفہ کا خاص موضوع تھا اور گزشتہ ایک سو برس سے اس پر سرگرم بحث ہو رہی تھی۔ کانٹ کے خیال میں انسانی عقل محدود تھی اور خدا تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ہیگل کے نزدیک چونکہ معجزات کو عقلی طور پر ثابت کیا جاسکتا تھا نہ رد کیا جاسکتا تھا لہٰذا معجزات پر یقین نہ رکھنا بھی اتنا ہی خلاف عقل تھا جتنا کہ اُن پر یقین رکھنا۔ اِن سب سے علیحدہ مسلمانوں کا صوفی ادب تھا، جس کی طرف اب اہل مغرب کی توجہ ہوئی تھی مگر تصوف کی کوئی جدید تاریخ ابھی تک نہیں لکھی گئی تھی۔

۴۔ جمالیات

یہ اقبال کی اپنی اُفتادِ طبع بھی تھی اور فلسفہ کی شاخ بھی۔ وہ ایک نوجوان کے طور پر حسن سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ عقلی تجزیہ دل کو زنجیر پہنانے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں!

۵۔ گناہ

یہ خاص طور پر اُن کی دلچسپی کا موضوع تھا۔ فلسفہ میں اخلاقیات عقلی طور پر گناہ کا تجزیہ کرتی تھی مگر اقبال کے ذہن میں یہ صوفیانہ خیال بھی سمایا ہوا تھا کہ گناہ کے بغیر خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ گناہ گار جب اپنے گناہ پر شرمندہ ہوتا ہے تو اُس کے ضمیر کی کشمکش خدا کی رحمت کو جوش میں لاتی ہے۔ گناہ پر شرمندہ ہو کر انسان اُس تڑپ سے واقف ہوتا ہے جو زاہد اور عبادت گذار اپنی ہزار سال کی عبادت میں بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اگر گناہ کی کوئی افادیت نہ ہوتی تو خدا کی کائنات میں گناہ کا وجود بھی نہ ہوتا۔

6

مسلمانوں کی تہذیب وثقافت میں لاہور ویسی ہی اہمیت حاصل کر رہا تھا، جیسی دہلی کو چالیس پچاس برس پہلے تک حاصل رہی تھی۔ ہندوستان کے نامور شاعر اور ادیب یا تو لاہور میں آ کر آباد ہو گئے تھے یا یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد تو اقبال کے قریب ہی بھاٹی دروازے میں رہتے تھے اگرچہ نجی زندگی کے صدموں سے دیوانے ہو چکے تھے اور شام کے وقت پرانے شہر کی گلیوں میں دکھائی دیتے تھے۔

مولانا حالی بھی ایک زمانے میں یہاں آئے تھے اور آزاد کے ساتھ مل کر نئی شاعری کی بنیاد رکھی تھی۔ نواب داغ دہلوی کے لاہور آنے کا واقعہ تو اُن دنوں قریب سبھی کی زبان پر رہا ہوگا۔ دہلی دروازے کا تارا چند حلوائی بڑے فخر سے لوگوں کو یہ بتا کر کہ حضرت فصیح الملک اُس کی دکان پر تشریف لائے تھے اپنا یہ مصرع پڑھا کرتا تھا

تارا نہ ہو تو حلوائے سوہن کھلائے کون

اُن دنوں شاعری، طب اور خوش خطی کو ہر تعلیم یافتہ مسلمان کے لئے ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ دہلی کے بعد اب لاہور نے مسلم تہذیب کی حفاظت کی ذمہ داری اُٹھائی تھی تو اُردو شاعری کا ذوق بھی یہاں کے اطراف میں بچے بچے تک پھیل گیا تھا۔

7

ایک روز اقبال شلوار قمیض اور ٹوپی پہن کر بھاٹی دروازہ سے گزر رہے تھے کہ کالج کے دو جونیئر طلبہ نے اُن کا راستہ روک لیا۔ اِن میں سے ایک سیالکوٹ کا رہنے والا جلال دین تھا اور اُن سے واقف تھا۔

''یہ وہی شیخ محمد اقبال ہیں، جن کا میں ذکر کرتا ہوں۔'' اُس نے اپنے ساتھی سے کہا اور پھر اُس کا تعارف اقبال سے کروایا۔ انبالے کا نوجوان میر غلام بھیک تھا۔ شاعر تھا اور نیرنگ تخلص کرتا تھا (۶)۔

چند روز بعد جلال دین دوبارہ اقبال کے پاس آئے تو معلوم ہوا نیرنگ صاحب کو دکھانے کے لئے کوئی غزل درکار ہے۔ اقبال نے ایک غزل کاغذ پر لکھ کر اُن کے حوالے کر دی۔ عام مضامین تھے، مگر اُنہوں نے بعض بعض جگہوں پر الفاظ یا خیال کے ذریعے انوکھا پن دکھایا تھا۔ مثلاً یہ خیال کہ شمع جو محبوب کی بزم میں جلوہ افروز ہے اُس کی زلف جس شانے پر بکھرتی ہے وہ محبوب پروانے کا پر ہے۔ اسی طرح یہ

خیال کہ میرا دل ایک ٹوٹا ہوا پیمانہ ہے مگر یہ اُس میخانے سے تعلق رکھتا ہے جہاں روزِ الست خدا نے پوچھا تھا کہ تمہارا رب میں ہی ہوں، تو اُس کے جواب میں ہر روح کسی مے خوار کی طرح مست ہو کر پکاری تھی کہ ہاں بے شک!

اس کے علاوہ واعظ پر پھبتی تھی اور رسول کریمؐ سے عقیدت کا اعلان...

حضرتِ واعظ ہیں میخانے میں شائد آ گئے
کلمۂ لاحول، وردِ ہر لبِ پیمانہ ہے
اُڑ کے اے اقبالؔ سوئے بزمِ یثرب جائے گا
روح کا طائر عرب کی شمع کا پروانہ ہے

نیرنگ نے یہ غزل دیکھی تو اُن کی آنکھیں کھل گئیں۔ ''میں نے اُس وقت تک اہل پنجاب کی اُردو شاعری کے جو نمونے دیکھے تھے، اُن کو دیکھ کر میں اہل پنجاب کی اُردو گوئی کا معتقد نہ تھا۔ مگر اقبال کی اس غزل کو دیکھ کر میں نے اپنی رائے بدلی...''

اقبال نے فرمائش کی تھی کہ نیرنگ بھی اپنا کلام اُنہیں دکھائیں

حرم کو چلنا اے زاہد یہ ساری ظاہر پرستیاں ہیں
میں اُس کی رندی کو مانتا ہوں جو کام لے دَیر سے حرم کا

یہ گویا اقبال کے اپنے ہی دل کی آواز تھی۔

ان دونوں کے درمیان، ہم خیالی اور محبت کے ایک ایسے رشتے نے جنم لیا جو عمر بھر قائم رہا۔

8

پرانے شہر میں لاہور کے بعض رئیس خاندان اپنی اپنی خاندانی عظمت و شوکت کے ساتھ مقیم تھے۔ انہی میں حکیم خاندان بھی تھا، جس کے سربراہ حکیم شجاع الدین تھے۔ طب، فلسفہ اور ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ خود بھی مرثیہ اور غزل میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں انہیں خیال آیا کہ حالیؔ اور آزاد کی ''انجمن پنجاب'' جب سے ختم ہوئی ہے، لاہور میں اعلیٰ پیمانے کے مشاعروں میں بھی کمی آ گئی ہے۔ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ اگرچہ یہ کمی پوری کرتا تھا مگر سال میں ایک دفعہ ہوتا تھا۔ چنانچہ اُن کے کہنے پر اُن کے خاندان کے افراد نے ایک ''انجمن اتحاد'' کی بنیاد ڈالی۔ حکیم امین الدین، جو خاندانی پیشہ ترک کر کے

بیرسٹر ہو گئے تھے، عام طور پر سب سے زیادہ امیر سمجھے جاتے تھے اور اُن کی حویلی بھی عالی شان تھی۔ وہ بزم اتحاد کے سیکرٹری بنے اور اُنہی کے مکان پر ۳۰ نومبر کو شام چھ بجے پہلا مشاعرہ ہوا۔ حکیم شجاع میر محفل تھے۔ اُردو زبان کے متعدد ہندو اور مسلمان شعرا کے علاوہ کوئی تین سو شائقین غزلیں سننے کے شوق میں کھنچے چلے آئے تھے۔

ممکن ہے ان میں اقبال بھی رہے ہوں مگر شعر سنانے والوں کی فہرست میں اُن کا نام شامل نہیں تھا (۷)۔

9

فروری ۱۸۹۶ء میں لاہور کے کشمیری بزرگوں اور نوجوانوں نے مل کر انجمن کشمیری مسلمانانِ ہند کی بنیاد رکھی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ فضول رسوم ورواج کی حوصلہ شکنی کی جائے اور فوج میں ملازمت حاصل کرنے میں کشمیری مسلمانوں کی مدد کی جائے۔ کشمیری بزرگوں کے ساتھ ساتھ کالج کے طلبہ نے بھی اس سلسلے میں جوش وخروش کا مظاہرہ کیا ہوگا اور انہی میں سے بعضوں نے انجمن کے رہنماؤں سے اُس نوجوان کا تعارف کروایا جو شعر کہتا تھا مگر مجمع میں سناتے ہوئے اُسے شرم آتی تھی۔ بہرحال اقبال سے فرمائش کی گئی اور وہ انجمن کے پہلے اجلاس میں ۱۲۷ اشعار کی نظم فلاحِ قوم لے کر آئے

دعا یہ تجھ سے ہے یارب کہ تاقیامت ہو
ہماری قوم کا ہر فرد قوم پر مفتوں
دکھائیں فہم و ذکا و ہُنر یہ اوروں کو
زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم و فُنوں

لاہور میں یہ پہلا موقع تھا کہ اقبال نے اپنے شعر کسی محفل میں سنائے (۸)۔

10

اُسی مہینے انجمن حمایتِ اسلام کا گیارہواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ یہ انجمن ۱۸۸۴ء میں اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ عیسائی مشنریوں کا اثر کم کیا جائے اور مسلمان بچوں کے لئے تعلیمی اور رفاہی ادارے قائم کئے جائیں۔ ہر سال انجمن کے قائم کردہ اسلامیہ کالج کے صحن میں دَریاں اور اسٹیج بچھا کر

جلسہ منعقد کیا جاتا تھا اور اب اِس جلسے کو پنجاب اور پنجاب سے باہر کے لوگوں میں ایک میلے کی سی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ شعرا، علماء اور مقررین اسٹیج پر آ کر اپنے جوہر دکھاتے تھے اور حاضرین، جن میں ہر قماش کے آدمی ہوتے تھے، انجمن کے رفاہی کاموں کے لیے چندہ دیتے تھے۔ اِس عوامی میلے کی سب سے زیادہ ہردلعزیز شخصیت اکبری اور اصغری والے ڈپٹی نذیر احمد تھے۔ قدرے بھاری ڈیل ڈول کے آدمی اور آواز میں بادلوں جیسی کڑک، مگر طبعیت میں ایسی شگفتگی جو کبھی چھپائے نہ چھپتی تھی۔ یہ نوجوانوں سے اور نوجوان اِن سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتے تھے۔

اقبال نے ضرور ۱۸۹۶ء کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی ہوگی۔ ہمیں ڈپٹی ندیم احمد کے ساتھ ان کی ملاقات کا حال تو معلوم نہیں مگر تصور کی آنکھ سے اُنیس سالہ اقبال کو ڈپٹی نذیر احمد کے قریب کھڑے دیکھنا بہت آسان ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد مولویوں کا مذاق اِس طرح اُڑاتے تھے جیسے یہ اُن کا مذہبی فریضہ ہو۔ اتفاق سے چند برس پہلے کے کسی جلسے میں اُنہوں نے مولویوں کے ساتھ ساتھ صوفیوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ان لیکچروں کا چرچا اُس وقت تک خاصا عام تھا چنانچہ ذرا سا امکان اس بات کا بھی ہے کہ اقبال شروع شروع میں اُن سے کچھ کھنچے رہے ہوں۔ مگر ایسا ہوا بھی تو یہ بات زیادہ عرصے نہیں رہی کیونکہ چند سال بعد اقبال ڈپٹی صاحب کے حلقہ بگوشوں میں دکھائی دینے لگے (۹)۔

11

مارچ میں کالج کا تعلیمی سال ختم ہوا۔

اقبال چھٹیوں میں ضرور سیالکوٹ گئے ہوں گے، کیونکہ بعد کی روایات سے ان کا یہی معمول سامنے آتا ہے۔ امام بی عام طور پر ''میرا بالی آ گیا!'' کہہ کر اُنہیں گلے لگاتی تھیں اور اُن کا استقبال کیا جاتا تھا۔ سیالکوٹ میں بھٹیارن کے تنور والا مقدمہ ابھی تک چل رہا تھا (۱۰)۔

12

اُن کے بچپن کے دوستوں میں سے کتنے ہی ایسے تھے جو تعلیم چھوڑ کر کسی نہ کسی کام دھندے سے لگ چکے تھے۔

لالو کے بھائی کی دودھ دہی کی دکان تھی مگر وہ خود پہلوانی کرتا تھا اور اقبال کو بھی لنگر لنگوٹ بندھوا کر اکھاڑے میں لے آتا تھا (۱۱)۔ کتنے ہی ایسے تھے جو کھیل کا سامان بنا کر یا کسی اور طرح کے ہنر سے کام لے کر راتوں رات امیر ہوگئے تھے۔ سیالکوٹ ترقی کر رہا تھا اور اقبال نے بھی سوچا ہوگا کہ جب وہ بہت سا علم حاصل کرلیں گے تو اُن کی محنت اُنہیں بہت اونچے مقام پر بٹھا دے گی۔

13

۱۸۹۶ء کے کسی مہینے میں کریم بی نے ایک لڑکی کو جنم دیا جس کا نام معراج بیگم رکھا گیا (۱۲)۔ یہ نام بھی اقبال اور اُن کے گھر والوں کے صوفیانہ رجحانات کی عکاسی کرتا تھا۔
ممکن ہے کہ اس موقعہ پر اقبال گجرات بھی گئے ہوں۔

14

انجمن کشمیری مسلمانان کے ایک اجلاس میں چونڈہ (سیالکوٹ) کے کسی صاحب کی طرف سے ایک تحصیلدار کی شکایت پیش ہوئی جس نے اپنے کسی فیصلے میں کشمیری مسلمانوں کو ''فسادی اور بہادر'' لکھا تھا۔ اقبال نے اس تجویز کی مخالفت کی کہ انجمن کو فیصلے میں سے لفظ فسادی خارج کروانے کے لئے کوشش کرنی چاہئیے۔ ''جو قوم فساد کرنا نہیں جانتی وہ بہادر نہیں ہوسکتی۔ میرا مطلب فساد سے بہادری کی اسپرٹ ہے۔ اگر آپ بہادر اور شجاع نہیں کہلانا چاہتے تو بیشک اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کریں۔'' ان کی تجویز مان لی گئی۔ (۱۳)

15

علی گڑھ میں شبلی کے دوست ٹامس آرنلڈ نے اُس برس Preaching of Islam کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں اپنے ہم نسل مستشرقین کے اس خیال کی تردید کی تھی کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ سرسید احمد خان نے اپنے دوست اور تہذیب الاخلاق کے مشہور مضمون نگار منشی ذکاءاللہ کے لڑکے عنایت اللہ دہلوی سے ''دعوتِ اسلام'' کے نام سے اِس کتاب کا ترجمہ کروایا۔ ممکن ہے یہ ترجمہ میر حسن اور اُن کے شاگردوں کی نظر سے گزرا ہو۔

16

نیرنگ کے لیے یہ خبر اہم تھی کہ اقبال ہاسٹل میں رہنے آ رہے ہیں۔ چھٹیوں سے تازہ دم ہو کر اقبال واپس لوٹے تو ہاسٹل میں سینئر طلبہ کے کمروں کی قطار میں ایک کمرہ اُنہیں بھی مل گیا۔ یہ اکیلے رہنے کا اُن کی زندگی میں پہلا اتفاق تھا۔ وہ کہیں سے ایک حقہ اور بہت سی کتابیں اُٹھا کر لے آئے اور پھر تو اُنہیں تنہائی کا چسکا لگ گیا۔ ایک روز جب تمام لڑکے میدان میں کھیل رہے تھے تو ڈالنجر صاحب نے ہاسٹل کے معائنے کے دوران اقبال کو کمرے میں بنیان اور تہمد باندھے مطالعے میں مصروف پایا۔ ڈالنجر صاحب نے کھیل کود اور ورزش کے فوائد کی طرف اشارہ کیا تو اقبال نے کہا۔ ''سر! یہ بھی تو ایک طرح کی ورزش ہے!'' (۱۷)

ہاسٹل میں اُن کی حاضر جوابی اور دلچسپ گفتگو اُن کی شاعری سے زیادہ مقبول تھی۔ چنانچہ اکثر اُن کے دوست اُن کے کمرے میں جمع ہو جاتے اور اقبال کتاب چھوڑ کر اُن کی گپ شپ میں شریک ہو جاتے۔ دراصل یہاں اُن کا وہی ذوق جاگ اُٹھتا تھا جو بچپن میں خاندان کی عورتوں میں بیٹھ کر رات گئے تک محلے کی پڑوسنوں پر پھبتیاں کستے ہوئے پروان چڑھا تھا۔ اقبال کو صحیح معنوں میں گپ بازی کی لت لگی ہوئی تھی۔ لالہ سرداری لال جن کے ذمے بورڈنگ ہاؤس کے نظم وضبط کا خیال رکھنا تھا عموماً ان مشاغل میں دخل نہیں دیتے تھے۔

اقبال کی طبیعت کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ اگر کوئی پھبتی یا کوئی مذاق ذہن میں آ جاتا تو پھر وہ اُس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، چاہے اِس میں جان ہی کیوں نہ جاتی ہو۔ بعض اوقات اُن کے مذاق دوسروں کے لیے تکلیف دہ بھی ہو جاتے تھے مگر وہ اپنے اُفتادِ طبع کے ہاتھوں مجبور تھے۔ بالخصوص شہاب الدین عرف شہابا اُن کے جملوں کا نشانہ بنتے تھے۔ وہ کہتے۔ ''بھئی تم مجھے نہ روکو۔ تمہیں دیکھ کر مجھ پر لطیفوں کی آمد ہوتی ہے۔'' ایک روز شہابا صاحب مزے سے غسلخانے میں نہا رہے تھے کہ اقبال کہیں سے سیاہی کی دوات لے آئے اور اُس نالی میں اُلٹ دی جس میں سے پانی باہر آ رہا تھا۔ پھر شور مچایا۔ ''دیکھو! دیکھو! شہابے کا رنگ چھوٹ رہا ہے!'' (۱۸)

اقبال کے کمرے میں جو محفلیں جمتی تھیں وہ آہستہ آہستہ ''بزمِ سخن'' میں تبدیل ہو گئیں جو ایک قسم کی بدتمیزی کا دوسرا نام تھا یعنی مختلف زبانوں میں تک بندی اور مزاحیہ شاعری جس کا مقصد اِس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ قہقہوں کا طوفان رکنے نہ پائے! البتہ کبھی کبھی اقبال کی شخصیت کا سنجیدہ پہلو بھی سامنے آتا تھا۔

انہی محفلوں میں وہ اپنی پرسوز غزلیں بھی انتہائی دل کش ترنم میں سنا جاتے تھے۔

نیرنگ نے ایک عرصہ بعد لکھا۔ ''اُس ابتدائی زمانہ میں کسی کو بھی اقبال میں ایک اچھے شاعر مگر عام معیار کے شاعر کے سوا کچھ نظر نہ آیا...دیکھنے والوں کی کوتاہ نظری نہ تھے بلکہ اس وقت وہ چیز موجود نہ تھی جو بعد میں بن گئی۔''

17

اورینٹل کالج کی ایک ہردلعزیز شخصیت مولانا شعیب تھے۔ انہوں نے علم عروض پر ایک رسالہ ''مختصر العروض'' لکھا تو اقبال نے اس کا قطعہ تاریخ گیارہ اشعار میں لکھ کر اُنہیں دے دیا

دکھا کر یہ کتاب بے بہا دل چھین لیتا ہوں
فصاحت کا، بلاغت کا، لیاقت کا، ذہانت کا
'ادب' کے ساتھ بالطبع پھر یوں عرض کرتا ہوں
'جزاک اللہ لکھا ہے رسالہ مختصر کیسا'

مولوی شعیب نے اسے اپنے رسالے کے آخر میں شامل کرتے ہوئے لکھا: شاعر باکمال، ناظمِ عالی خیال، جناب منشی محمد اقبال صاحب اقبالؔ، شاگرد جناب اُستاد داغ دہلوی، متعلم بی اے کلاس، گورنمنٹ کالج، لاہور۔

18

بزمِ اتحاد کے مشاعرے بدستور جاری تھے۔ تازہ خبر یہ تھی کہ دہلی اور لکھنو کا جھگڑا جو ہر جگہ اُردو زبان کے ساتھ پہنچ جاتا تھا، یہاں بھی آ گیا تھا۔

مرزا ارشد گورگانی بہادر شاہ ظفر کی بیٹی کے نواسے تھے اور اس لحاظ سے دہلی کی عزت وسطوت کے علمبردار۔ جب کسی پر طنز کرتے تھے تو وہ ساری محفل کے لئے عبرت کا نمونہ بن جاتا تھا۔ جس کی تعریف کرتے تھے وہ سب کی نگاہوں میں چڑھ جاتا تھا۔

دوسری طرف میر ناظم لکھنوی بارہ کے شیعہ تھے اور میر انیسؔ کے بیٹے کے شاگرد۔ زبردست شاعر تھے مگر اتفاق کی بات کہ مرزا ارشد کے سامنے ان کا چراغ نہ جل سکا۔ اگرچہ عمر میں اُن سے تیرہ برس

چھوٹے تھے مگر اپنے شاگردوں کو ساتھ لے کر مرزا ارشد کے خلاف محاذ بنا لیا۔ اُدھر سے تیموری لہو جوش میں آیا اور یوں لاہور کے زندہ دلوں کو گھر بیٹھے بٹھائے گویا انیس و دبیر کے معرکوں کی پیروڈی دیکھنے کو مل گئی (۱۹)۔

19

ممکن ہے کسی مشاعرے سے واپس آتے ہوئے اقبال سے بھی اُن کے دوستوں نے پوچھا ہو کہ اُن کی ہمدردی اہلِ لکھنو کے ساتھ ہے یا اہلِ دہلی کے ساتھ؟ مگر اقبال نے اپنی شخصیت میں کوئی ایسا خانہ بنایا ہی نہیں تھا جو آسانی سے کھل سکے۔ اُن کے کلام پر جہاں غالبؔ کا اثر تھا وہاں آتشؔ لکھنوی کا رنگ تھا۔ اگر داغؔ دہلوی نے اُنہیں اصلاح دی تھی تو اُس عہد کے سب سے بڑے لکھنوی شاعر امیر مینائی کی حیثیت بھی اقبال کے لئے ایک غیبی مرشد سے کسی طرح کم نہ تھی۔

20

امیر مینائی نے اسلامی تصوف کے گناہ اور مغفرت کے تصورات کو جس طرح نظم کیا تھا اُس کے بعد اگر وہ اقبال کے محبوب ترین شاعر نہ بنتے تو تعجب کی بات ہوتی۔ ممکن ہے اقبال نے اُن کا موزانہ ملٹن سے بھی کیا ہو۔

21

امیر مینائی کی لاہور آمد کی خبر نے سب کو چونکا دیا ہوگا۔ لکھنؤ کے بزرگ شاعر کو بعض سخن شناس داغؔ سے بھی اُونچا مقام دیتے تھے۔ جہاں داغؔ کی شاعری محبوب سے نظر بازی کر کے ختم ہو جاتی تھی وہاں امیرؔ کی شاعری ان تمام مضامین کو سمیٹتے ہوئے روحانیت کی اُن وادیوں کی طرف جا نکلتی تھی جہاں دل نرم ہو جاتے ہیں اور پلکیں بھیگ جاتی ہیں:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

امیرؔ مینائی اُس برس لاہور آئے اور انجمن اتحاد کے مشاعرے میں شریک ہوئے (۲۰)۔ اس

مشاعرے میں اقبال بھی گئے ہوں گے مگر امیرؔ مینائی سے اُن کی ملاقات کی کوئی سند موجود نہیں۔

22

بے گناہوں میں چلا زاہد جو اُس کو ڈھونڈنے
مغفرت بولی ادھر آ میں گنہگاروں میں ہوں
امیرؔ مینائی

23

شرمِ عصیاں سے جو گرا آنسو
اُس کی رحمت کو اِک بہانہ ہوا
امیرؔ مینائی

24

اگلے مشاعرے کے مصرع طرح کا اعلان ہوا۔ اقبال نے بھی طبع آزمائی کی۔ ذہن پر شائد امیرؔ مینائی کا اثر تھا لیکن مقطع اُنہوں نے کچھ اِس طرح لکھا کہ اگر مرزا ارشد اور میر ناظم اُنہیں دہلی اور لکھنو کی توپوں کے درمیان رکھنے کی کوشش کریں تو یہ صاف بچ کر نکل جائیں۔

25

یہ مشاعرہ جو اقبال کی زندگی کا مشہور ترین مشاعرہ بنا، نومبر ۱۸۹۶ء میں منعقد ہوا۔ امیرؔ مینائی جا چکے تھے مگر پوری انجمنِ اتحاد میر اور میرزا سمیت موجود تھی۔ اقبال اپنے عارضی شرمیلے پن پر قابو پا چکے تھے۔ چنانچہ حکیم شجاع کو تعارف کروانے کا موقع بھی نہ دیا اور سامنے آتے ہی مطلع جڑ دیا

تم آزماؤ 'ہاں' کو زُباں سے نِکال کے
یہ صدقے ہوگی میرے سوالِ وِصال کے

کسی طرف سے آواز آئی۔ ''پہلے حضرت کا تعارف تو کروایئے!''

اقبال نے کہا۔ ''لیجئے میں خود عرض کیے دیتا ہوں... خاکسار کو اقبال کہتے ہیں اور یہی میرا تخلص ہے۔ سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں اور یہاں کے سرکاری کالج میں بی اے ؔن جماعت میں پڑھتا ہوں۔ حضرت داغؔ سے تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ یہاں کے کسی بزرگ سے نہ خصوصیت ہے نہ خصومت۔ چند شعر لکھ کر لایا ہوں، اگر اجازت ہو تو پڑھ کر سناؤں''۔

جب وہ اُس شعر پر پہونچے جو خاص امیر مینائی سے ماخوذ تھا، تو مرزا ارشدؔ چونک اُٹھے۔

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مِرے عرقِ انفعال کے

''اقبال! اس عمر میں اور یہ شعر!'' مرزا ارشد کی زبان سے یہ جملہ ادا ہوا اور سب چونک کر پوری طرح اقبال کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کے بعد اقبال نے سولہ اشعار کی غزل کے بقیہ اشعار بڑے ٹھاٹھ سے سنائے۔

ممکن ہے کہ مرزا ارشد کے تعریف کرنے پر میر ناظم نے منہ بنا کر اپنے شاگردوں سے کہا ہو۔ ''بھلا قطرے ہوتا ہے یا 'کترے'! اس شاعر کو اپنے نام کا تلفظ ادا کرنا بھی نہیں آتا ہوگا۔'' مگر آخر میں اقبال کا مقطع کام آیا اور وہ میر ناظم کے عتاب سے بچ گئے

اقبالؔ! لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خَمِ زُلفِ کمال کے

26

مرزا ارشد کے ایک بے ساختہ جملے نے پل بھر میں اقبال کو بہت سے قدر دان فراہم کر دیئے تھے۔

حکیم شجاع اور حکیم امین الدین پرانے شہر کے رئیس۔ منشی محبوب عالم، جو کئی سال پہلے گوجرانوالہ سے بستر کندھے پر اُٹھا کر پیدل لاہور آئے تھے اور اب حکیم شجاع کی عنایت اور اپنی محنت سے پنجاب کے سب سے مشہور اخبار ''پیسہ'' کے مالک تھے (۲۱)۔

ان کے علاوہ پیسہ اخبار کے مینجر منشی عبدالعزیز تھے مگر سب سے دلچسپ شخصیت اُس نوجوان کی تھی جس کا نام اقبالؔ کے عربی کے اُستاد سے ملتا جلتا تھا اور عادتیں عمرو عیار سے۔ محمد الدین فوقؔ! فوق اقبال

سے ایک سال پہلے اُنہی کے ضلع میں کہیں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدین بھی کشمیری تھے۔ خاندانی مشکلات اور اپنی طبیعت کی وجہ سے وہ مڈل سے آگے پڑھ نہ سکے۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور آئے اور منشی محبوب عالم کے اخبار میں نو روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ منشی صاحب کا طریقہ تھا کہ ملازموں کو ہر ہفتہ ایک دو روپیہ جیب خرچ کے طور پر دے دیتے تھے اور بعد میں اُن کی تنخواہ سے کاٹ لیتے تھے۔ ایک دفعہ اکاؤنٹنٹ نے فہرست بنائی تو فوق نے پانچ روپے اپنے نام کے سامنے لکھوا لیے۔ جب یہ فہرست مینجر عبدالعزیز صاحب کے سامنے آئی تو وہ اچھل پڑے اور فوق کو بلوا بھیجا۔ انہوں نے کہا۔ ''حضور! میں تو آٹھ آنے قبول کرنے کو تیار ہوں، لیکن خواہش صرف یہ ہے کہ زندگی میں ایک مرتبہ پانچ روپے اکٹھے دیکھ لوں!'' عبدالعزیز ہنس پڑے اور دہ روپے دے دیے۔ اقبال اور فوق کی دوستی لطیفوں اور بے تکلف صحبتوں کے ایک طویل سلسلے کی ابتداء تھی (۲۱)۔

26

اگلے مشاعرے کے لیے یہ مصرع طرح تجویز ہوا

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا

اس دفعہ فوق نے ارادہ کیا کہ وہ بھی غزل لکھ کر لائیں گے (۲۲)۔

27

انیسویں صدی کے آخر میں ایسے رسالوں کی بھرمار تھی جن میں تازہ غزلیں جمع کی گئی ہوتی تھیں۔ یہ عرفِ عام میں گلدستے کہلاتے تھے اور اُس دور کی ثقافت میں انہیں وہی مقبولیت حاصل تھی جو آج کے دور میں آڈیو کیسٹوں کو ہے۔ انجمن اتحاد کے تحت جو مشاعرے ہوتے تھے اُن کی کاروائی بھی ایک گلدستے کی صورت میں شائع کی جاتی تھی جس کا نام ''شورِ محشر'' تھا۔

اگلے مشاعرے میں اقبال اور فوق نے جو غزلیں پڑھیں تھیں وہ ''شورِ محشر'' دسمبر میں شائع ہوئیں

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اِس پر
مُجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سُخنداں کا

شورِ محشر کے مدیر احمد حسین خاں تھے۔ ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے تھے (۲۳)۔ گورنمنٹ کالج سے بی اے کیا تھا اور شاعری میں مرزا ارشد کے شاگرد تھے۔ کسی مشاعرے میں غزل پڑھتے ہوئے ایک شعر کا دوسرا مصرع تو اتنا مشہور ہوا کہ محاورہ بن گیا:

خواب و خیال ہو گئیں ساری حکائتیں
احمد حسین خان! زمانہ بدل گیا

28

داغؔ کے ایک شاگرد مولوی محمد عبدالرؤف خان رافتؔ تھے جو ۱۸۸۹ء میں بھوپال کی فرمانروا نواب سلطان جہاں بیگم کے پرائیوٹ سیکٹری بھی رہے تھے۔ وہ لاہور آئے تو اقبال نے انجمن اتحاد کے مشاعرے میں اُنہیں بھی خوش آمدید کہا

ضد سے عمامے کو واعظ نے کیا غرقِ شراب
پر کہاں رندو! ہمارے دامنِ تر کا جواب

ارشدؔ و رافتؔ سے ہُوں اقبالؔ مَیں خواہانِ داد
آبداری میں ہیں یہ اشعار گوہر کا جواب

29

اقبال کے دوست اُن سے اکثر کہتے تھے کہ اُن کی آواز اچھی ہے۔ جس طرح وہ ہاسٹل کے کمرے میں اپنی غزلیں گاتے ہیں اُسی طرح مشاعرے میں اُنہیں اپنا کلام ترنم سے سنانا چاہیئے۔ مگر اُس وقت تک صرف گانے والے اور گانے والیاں ہی غزلیں گایا کرتے تھے۔ ایک عرصہ تک اقبال کو بھری بزم میں نواسنج ہونے کی ہمت نہ پڑی مگر آہستہ آہستہ یہ حجاب دُور ہوا اور وہ مشاعروں میں اپنا کلام ترنم سے سنانے لگے۔

30

خارِ صحرا نہ سہی، دَشت کے پتھر ہی سہی
میرا چھالا نہیں پھُوٹا تو مُقدر ہی سہی

روزِ محشر کوئی مے خوار نشے میں بولا
مے احمر نہیں ملتی ہے تو کوثر ہی سہی

مُجھے صیّاد تہِ دَام پھڑک جانے دے
مَیں نہ گُلشن میں رہُوں گا تو مِرے پَر ہی سہی

کِس کو یاد آؤں گا مَیں حَشر کے ہنگامے میں
میرا دفتر ہے گناہوں کا تو دفتر ہی سہی

شِعر اقبالؔ کو آتا نہیں کہنا لیکن
تُم جو کہتے ہو سُخنور تو سُخنور ہی سہی

یہ شعر جس غزل سے ہیں وہ بھی اقبال نے انجمن اتحاد کے مشاعرے میں پڑھی تھی۔ اس کے مقطع کی بدولت ان کے مداحوں میں ایک انتہائی اہم اضافہ ہوا۔ شیخ عبدالقادر اُس زمانے کے مشہور انگریزی اخبار ''آبزرور'' کے نائب مدیر تھے۔ خود شعر نہیں کہتے تھے مگر انگریزی اور اُردو ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔

31

۱۸۹۶ء کے آخر میں حکیم شجاع انتقال کر گئے۔

انجمنِ مشاعرہ کو سنبھالنے کی ذمہ داری حکیم امین الدین نے قبول کر لی اور مشاعروں کا سلسلہ جاری رہا۔

زندگی موت سے ہم دوش ہوئی جاتی ہے
میری میّت اُٹھی اور اُن کی سواری آئی

۱۶ اشعار کی یہ غزل معلوم نہیں کب اقبال نے لکھی تھی مگر اُن کی بیاض میں یہ ہمیشہ ادھوری رہی:

تیر کو ڈھونڈتے ہاتھوں میں کٹاری آئی

''لاڈلی رندوں کی، ساقی کی دُلاری آئی'' پر اُن سے گرہ نہ لگی اور پھر اُنہوں نے اسے مزید توجہ کے قابل نہ سمجھا۔

32

اقبال نے بازارِ حسن کب جانا شروع کیا، اس کے متعلق یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ اُس زمانے میں جبکہ گراموفون کا رواج نہیں ہوا تھا، موسیقی سے لطف اندوز ہونے کا یہی مقبول ذریعہ تھا۔ اقبال کی شادی پر خود اُن کے بزرگ پیراں دتی کو بارات کے ساتھ لے گئے تھے۔ لاہور کا بازارِ حسن تو ہندوستان بھر میں کلکتہ کے بعد دوسرے نمبر پر شمار کیا جاتا تھا۔ یہاں کی طوائفیں فارسی اور اُردو اساتذہ کے کلام سے واقف ہوتی تھیں اور غزلوں کے علاوہ پکے راگ، ٹھمری اور دادرے میں مہارت رکھتی تھیں۔ سامعین کا ذوق بھی اُونچا تھا، چنانچہ تھیٹر کمپنیوں کو لاہور میں ابھی تک زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی اور عام طور پر ناٹک کے نغموں کو عامیانہ خیال کیا جاتا تھا۔ ان حالات میں یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ طالبعلمی کے زمانے میں ہی اقبال اپنے ذوق کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس کوچے کی سیاحت پر نکل آئے ہوں گے۔

اُن کے زمانہ طالبعلمی سے منسوب ایک روایت سنسنی خیز ہونے کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ یہ قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ رقابت اور طیش کے جذبات سے بے قابو ہوکر انہوں نے ایک طوائف کو قتل کر دیا اور پھر ہاسٹل میں آکر چھپ گئے مگر اُس رات ہاسٹل کے انگریز انچارج نے راؤنڈ لیے بغیر سب لڑکوں کی حاضری لگادی تھی چنانچہ جب معاملہ عدالت میں پیش ہوا تو انگریز کی گواہی معتبر سمجھی گئی اور اقبال بری ہوگئے۔

علاوہ اس بات کے کہ ہاسٹل کا انچارج کوئی انگریز نہیں بلکہ لالہ سرداری لعل تھے، اِس روایت کے متعلق اور بھی بہت کہا اور سنا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اقبال اتنے مالدار تھے ہی نہیں کہ وہ کسی طوائف سے اس

قسم کے روابط قائم کرسکیں جن میں رقابت کی انتہائی منزلوں تک بات پہنچتی ہے (۲۴)۔

33

عیشِ جوانی

اے شبابِ رفتہ! اے آرامِ جانِ بے قرار
کتنے دل کش آہ، ظالم! تھے ترے لیل و نہار
اے وہ دن موج زن تھے دل میں جب ارمانِ وصل
ہائے وہ راتیں کہ تھیں جب صحبتِ بوس و کنار
ہلکی ہلکی بام پر نکھری ہوئی وہ چاندنی
ٹھنڈی ٹھنڈی روح افزا وہ نسیمِ خوش گوار
نیچی نیچی آہ وہ نظریں، وہ اندازِ حجاب
نرگسِ مستانہ میں وہ سُرمۂ دُنبالہ دار
گل سے رُخساروں پہ قطرے یوں پسینے کے عیاں
جس طرح وقتِ سحر پھولوں پہ شبنم آشکار
ہائے وہ الہڑ پنے کے دِن، جوانی کا وہ سِن
عُنفوانِ حُسن کا کم کم وہ سینے پر اُبھار
ضدِ ہم آغوشی شوقِ نیم جامہ کو اِدھر
اور اُدھر محوِ تغافل نازِ حسنِ پردہ دار
وصل میں لب پر اُدھر عذرِ نزاکت کا گلہ
اضطرابِ دل سے یاں شکوہ زباں پر بار بار
گوری گوری گردنِ نازک میں فرطِ شوق سے
ڈال دینا بڑھ کے باہیں، وہ مِرا بے اختیار
ہائے وہ شب بھر شرابِ وصل کی سرمستیاں
صبح کو آنکھوں میں کم کم خوابِ نوشیں کا خمار

پھیکا پھیکا لب پہ وہ بدرنگ لاکھا پان کا
نیلے نیلے، رُخ پہ بوسوں کے، نشاں وہ آشکار
آہ وہ جھینپی ہوئی نظریں، وہ شرمیلی ادا
شب کی کیفیت کا، جن سے رازِ پنہاں آشکار
اب نہ ارمانوں کا جمگھٹ ہے، نہ وہ شوقِ وصال
لے رہا ہے چٹکیاں پہلو میں دردِ انتظار
اب کہاں ذوقِ ہم آغوشی کے وہ اگلے مزے
ناتوانی سے ہے کروٹ بھی بدلنا ناگوار
کس پہ تم پھولے ہوئے ہو، آہ یارانِ نشاط
ہونے والا ایک دن ہے عیشِ دنیا کا فشار
خندۂ گُل ہے مگر ہنگامۂ لطف و طرب
چار دن کی آہ، مہماں ہے جوانی کی بہار

34

جب خدا نے شیطان کو جنت سے نکال کر جہنم کے شعلوں کے سپرد کیا تو اُس کا حوصلہ کم ہونے کی بجائے اور زیادہ ہوگیا۔

The mind is its own place, and in itself
Can make a Heav'n of Hell, a Hell of Heav'n.
What matter where, if I be still the same,
And what I should be, all but less than He whom
Thunder hath made greater?
Here at least we shall be free; th'Almighty hath not limit
Here for his envy, will not drive us hence:
Here we may reign secure, and in my choyce
To reign is worth ambition though in Hell:

Better to reign in Hell, than serve in Heav'n

Paradise Lost Book I

35

''(ہاسٹل کی) صحبتوں میں اقبال اپنی ایک اسکیم بار بار پیش کیا کرتے تھے،'' نیرنگ کا بیان ہے۔ ''ملٹن کی مشہور نظم پیراڈائز لوسٹ اور پیراڈائز ری گینڈ کا ذکر کر کے کہا کرتے تھے کہ واقعاتِ کربلا کو ایسے رنگ میں نظم کروں گا کہ ملٹن کی *Paradise Regained* کا جواب ہو جائے...''

36

میں تو کچھ اور ہو گیا جب سے
تیری محفل میں باریابی ہے
حُسن مرتا ہے پردہ داری پر
عِشق کو شوقِ بے حجابی ہے
آدمی کام کا نہیں رہتا
عِشق مِیں یہ بڑی خرابی ہے
لَن تَرانی بھی، طور سوزی بھی
پُردے پَردے مِیں بے حجابی ہے
پُوچھتے کیا ہو مذہبِ اقبالؔ
یہ گُنہ گار بُوترابی ہے

37

یہ جَوانی کے وَلوَلے اے دِل
دو گھڑی کے اُبال ہوتے ہیں
زور تُم اپنی کم سِنی پہ نہ دو
سب حَسیں خُوزد سال ہوتے ہیں

ہائے وہ مار ڈھیلے ہاتھوں کی
کس مزے کے ملال ہوتے ہیں
ذکر کچھ آپ کا بھی ہے اُن میں
قبر میں جو سوال ہوتے ہیں

38

دسمبر ۱۸۹۶ء میں لاہور میں ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف مذاہب کے نمائندوں کو اظہارِ خیال کا موقع فراہم کیا جائے۔ اسلام کی نمائندگی کے لیے جن صاحب کو بلایا گیا وہ مرزا غلام احمد قادیانی تھے۔

یہ بات خاصی قرینِ قیاس ہے کہ اقبال اس کانفرنس میں شامل ہوئے ہوں کیونکہ مذاہب عالم سے اُن کی دلچسپی ظاہر تھی۔ پھر عیسائیت کے مقابلے پر اسلام کی برتری ثابت کرنا اُن کے بچپن کا جنون ٹھہرا اور اُن دنوں تک وہ مرزا غلام احمد کے مداح بھی تھے۔

مرزا صاحب نے اپنا مقالہ شروع کرنے سے پہلے اشتہار چھپوایا کہ اُنہیں خدا کی طرف سے اس کی مقبولیت کی بشارت ہوئی ہے۔ مقالہ اُن کی طرف سے مولوی عبدالکریم سیالکوٹی نے ۲۸ دسمبر کو پڑھنا شروع کیا اور جب وہ اُسے مقررہ وقت پر ختم نہ کر سکے تو حاضرین کے اصرار پر کانفرنس کا دورانیہ دو روز بڑھا دیا گیا۔ مرزا صاحب کے عقیدتمندوں کے نزدیک یہ خدا کے وعدے کی تعبیر تھی۔

39

ابلیس!

اقبال کی دلچسپی کے موضوعات میں اس کا اضافہ بھی طالبعلمی کے زمانے میں ہوا۔

آئی سکائی لوس قدیم یونانی ڈرامہ نگار تھا۔ اس کا ڈرامہ ''پرومیتھیوس باؤنڈ'' اقبال کی نظر سے گزرا تھا جس میں زیوس دیوتا سے بغاوت کر کے انسان کو آگ فراہم کرنے والے کردار کا المیہ تھا۔

ملٹن کی پیراڈائز لوسٹ، جو اقبال کے مطالعے میں رہتی تھی، اگرچہ بائبل کی روشنی میں لکھی گئی تھی

مگر ملٹن اپنی شاعرانہ فطرت سے مجبور ہو کر شیطان کے کردار میں بڑے جاندار رنگ بھر گیا تھا۔

گوئٹے کا ڈرامہ ''فاوسٹ'' ایک ایسے انسان کا المیہ تھا، جو علم کی ہوس میں اپنی روح شیطان کے ہاتھ بیچ دیتا ہے مگر اپنی فطرت میں چھپی ہوئی انسانی خوبیوں کو ختم کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

اسلامی تصوف میں سے ابن عربی کی حکایت بھی اقبال کے ذہن میں بیٹھی تھی۔ ابلیس نے خدا سے کہا کہ میں آپ کے حکم سے سرتابی نہ کرتا لیکن میرا سجدہ کرنا آپ کی مشیت میں داخل ہی نہ تھا تو خدا نے پوچھا، تجھے یہ حقیقت انکار سے پہلے معلوم ہوئی یا بعد میں، اور اُس نے کہا کہ بعد میں معلوم ہوئی! ابن عربی کہتے تھے کہ ابلیس کا استدلال غلط تھا کیونکہ جو چیز اُس کی آزادی تھی وہ اُسے اپنی مجبوری کا نام دے رہا تھا۔

سب سے عجیب بات عطار نے کہی تھی۔ ''ابلیس خُدا کے دروازے کا کتا ہے۔ اُس کے دوستوں کو گزرنے دیتا ہے مگر دشمنوں کو روک لیتا ہے۔''

40

معلوم یوں ہوتا ہے کہ اقبال کا برہمن لہو جب کبھی جوش میں آتا تھا تو وہ خود اپنے آپ سے چھپ کر یہ سوچ لیتے تھے کہ مے نوشی کی طرح کسی بت کے آگے سر جھکانا بھی ایک شاعرانہ خیال ہے خواہ پتھر کی کوئی مورت ہو یا کسی مہ وش کا دِلکش حسن! اُن کی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ اپنے آپ میں موجود اِسی بت پرست پر قابو پانے کی جدوجہد سے عبارت ہے۔

41

کشمیر

(قطعات)

بُت پرستی کو مِرے پیشِ نظر لاتی ہے
یادِ اِیّامِ گزشتہ مُجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اِسلام کا ٹیکا اقبالؔ
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

کشمیر کا چمن جو مجھے دِل پذیر ہے
اِس باغِ جاں فزا کا یہ بُلبُل اَسیر ہے
وَرثے مِیں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

یہ اُن نو قطعات میں سے ہے جو اقبال نے انجمن کشمیری مسلمانانِ ہند کے کسی اجلاس میں سنائے تھے۔

42

فروری ۱۸۹۷ء میں انجمن حمایت اسلام کا بارھواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ ممکن ہے اِس دفعہ اقبال شریک نہ ہو سکے ہوں کیونکہ اگلے مہینے بی اے کے امتحان تھے۔

43

امتحان میں اقبال نے درجہ دوم میں کامیابی حاصل کی۔ عربی اور انگریزی میں اول آئے جس پر اُنہیں دو میڈل دیے گئے۔ اِس کے بعد وہ چھٹیاں گزارنے سیالکوٹ گئے ہوں گے۔

44

اقبال لاہور سے آئے تو خوشی کے عالم میں تھے۔ شاہ جی (میر حسن) نے ایک چپت رسید کر کے کہا۔ ''ایسی حرکتیں ہمارے سامنے!'' (۲۵)

اقبال سیالکوٹ کے بازار میں رحیمہ عطار کی دکان پر کھڑے حقہ پی رہے تھے۔ ایک پاؤں جوتے سے نکال کر دکان کے تختے پر رکھا ہوا تھا۔ دوسرا زمین پر تھا۔ اچانک میر حسن سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ اقبال نے حقہ چھوڑا اور دوسرا پیر بھی زمین پر ٹکا کر ہاتھ باندھ لیے۔ شاہ جی قریب آ چکے تھے۔ سلام کر کے یہ اُن کے ساتھ ہو گئے اور گھر تک چھوڑنے گئے۔ واپس آ کر دوسرا جوتا پہنا۔ (۲۶)

45

یہ اقبال کی فطرت کا تقاضا تھا کہ اُن کا ذہن بیک وقت کئی چیزوں پر متوجہ ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ اُن کی خوش قسمتی تھی ورنہ شاعری، فلسفے اور کاروبارِ دنیا کی کشمکش اُنہیں تباہ کرسکتی تھی۔

46

ایم اے میں اقبال نے عربی اور انگریزی کے بجائے فلسفہ کا انتخاب کیا حالانکہ یہی وہ مضمون تھا جس میں اُن کی پوزیشن نہیں آئی تھی۔ شائد ایک طرف برہمن زادہ ہونے کی وجہ سے وہ فلسفہ کو اپنی میراث سمجھتے ہونگے اور دوسری طرف تصوف اُن کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ چنانچہ مابعد الطبعیات اُن کی فکر کا پسندیدہ میدان تھا۔ اِس کے بعد فلسفہ کے جس شعبہ سے اُنہیں بہت زیادہ دلچسپی تھی وہ انسانی ارادے اور انسانی کردار کی بحث تھی۔

The Nichomachean Ethics of Aristotle

Translated by F. H. Peters

اس کتاب کے حاشیوں پر اقبال نے انگریزی میں لکھا (۲۷)۔

ارسطو کا طریقہ...اُس کا نظامِ اخلاقیات بعض پہلے سے قائم مفروضوں پر انحصار کرتا ہے۔ مقصد، ہیئت اور عملیت جیسے تصورات جن کی مدد سے انسانی زندگی کی تشریح کی گئی ہے اور جو تجربے کو معانی دیتے ہیں کسی منطقی طریقے سے حاصل نہیں کئے گئے ہیں بلکہ اوپر سے آئے ہیں...

47

اپریل میں وکٹوریا کو تختِ برطانیہ پر رونق افروز ہوئے پچاس برس پورے ہورہے تھے۔

۱۴ اپریل کو ضلع سیالکوٹ میں گولڈن جوبلی کے سلسلے کا جشن منعقد کیا گیا۔ منشی غلام قادر فصیح میونسپل کمشنر سیالکوٹ کی تحریک پر بابو محبوب عالم سپرنٹنڈنٹ دفتر ڈپٹی کمشنر اور شیخ میراں بخش میونسپل کمشنر کی کوششوں سے ہزاروں لوگوں کا مجمع اکٹھا ہوگیا۔ (۲۸)

دوپہر ڈھائی بجے جلسے کی کاروائی شروع کی گئی۔ سب سے پہلے غلام قادر فصیح نے تقریر کی۔ اس کے بعد میر حسن کو اظہارِ خیال کے لئے بلایا گیا۔

جلسہ منعقد کرنے والوں نے تجویز پیش کی تھی کہ ایک عظیم الشان ایڈریس (سپاسنامہ) تیار کر کے ملکہ کی خدمت میں بھجوایا جائے۔ میر حسن نے اسی کی تائید کی۔

''... بادشاہِ عادل کا وجود ایسی نعمت ہے کہ جب تک اس نعمت سے ہم بہرہ ور نہ ہوں دوسری نعمتوں سے محظوظ اور متمتع نہیں ہو سکتے... خدائے تعالیٰ اپنی ان نعمتوں کو جو اُس نے اپنی مخلوق کو عنایت فرمائی ہیں اپنے کلام میں متواتر ذکر فرماتا ہے تاکہ اُس کے بندے ان نعمتوں کو جان جائیں اور ان کا شکر بجا لائیں... سورہ بقرہ میں فرماتا ہے: **ولولا دفع اللّٰہ الناس بعضھم بعض لفسدت الارض ولکن اللّٰہ ذوالفضل علی العالمین** (اور اگر اللہ بعض لوگوں کے ذریعہ سے بعض لوگوں کو کرسی حکومت سے نہ ہٹاتا رہے تو ملک کا انتظام درہم برہم ہو جاوے لیکن اللہ دنیا کے لوگوں پر بڑا مہربان ہے۔)

''طوائف الملوکی یا جنگ وجدل کے زمانے میں جو بربادی اور تباہی ہوتی ہے وہ آشکار ہے محتاجِ بیان نہیں... پھر سورۃ حج میں فرماتا ہے۔ **ولولا دفع اللّٰہ بہ بعض لھدمت صوامع و بیع و صلوات و مساجد یذکر فیھا اسمہ اللّٰہ کثیرا** (اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہٹواتا رہے تو نصاریٰ کے صوامعہ اور گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے کبھی کی ڈھائی جا چکی ہوتیں) ظاہر ہے کہ جب دلجمعی اور اطمینان ہی نہ ہو تو عبادتِ الٰہی جس کا رکنِ اعظم اطمینانِ قلب ہے کیونکر کوئی بجا لاسکتا ہے... اگر عادل بادشاہ نہ ہو تو جسمانی اور روحانی دونوں آسائشیں مفقود ہو جاتی ہیں... رسولِ مقبول صلعم نے ہمیں ہر نعمت کا شکر کرنے کی تعلیم فرمائی ہے اور اپنے حکامِ وقت کی اطاعت اور فرمانبرداری کی ہدایت فرمائی ہے۔ پس جب حکامِ وقت کی اطاعت کریں اور اس نعمتِ عظمیٰ کا شکر کریں تو ہم اپنے پاک رسول صلعم کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔''

اس کے بعد میر حسن نے اس حدیث کے حوالے سے جس میں رسولِ اکرمؐ نے نوشیروانِ عادل کے زمانے میں پیدا ہونے پر فخر ظاہر کیا تھا یہ واضح کیا کہ بادشاہ کا مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ آخر میں ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کی برکتیں گنوائیں اور اس تجویز کا خیر مقدم کیا کہ ایسی مہربان ملکہ کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرنا چاہیے۔ اس سپاس نامے پر بھاری خرچ آئے گا ''اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ ایڈریس اُس حضرتِ قیصرۂ ہند میں پیش ہونا ہے جس کی عظمتِ ذات اور شوکت کو بچہ بچہ جغرافیہ پڑھنے والا جانتا ہے۔

اور اُس قوم کی طرف سے پیش ہونا ہے جس کے گزشتہ کارنامے ہر تاریخ دان پر آشکار ہیں گو وہ اب نہایت پست حالت میں ہے مگر گذشتہ بزرگوں کی عظمت اور بزرگی اُنہیں بالکل فراموش نہیں...''

48

موسم گرما میں انجمن کشمیری مسلمانانِ ہند ختم ہوگئی۔

49

۲۵ اگست کو اقبال نے ایک کتاب پر اپنا نام لکھا (۲۹)۔ غالباً یہ نئی کتاب تھی جو اُنہوں نے نصاب کے طور پر خریدی تھی۔

A Study of Religion
James Martineaus, D.D., S.T.D., D.C.,., L.L.D.,
Vol. 1

''اگر دنیائے حادثات کے قوانین اپنی مقررہ راہ پر قائم رہتے ہیں تو اِس سے مذہب کو کوئی فرق نہیں پڑتا،'' مصنف نے تحریر کیا تھا۔ ''اور اگر یہ سائنس کے قوانین خدا کے بنائے ہوئے ہیں تو اس سے سائنس کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سائنس اور مذاہب دونوں مضامین کا مطالعہ یکساں اسباب وعلل پر محیط ہے۔ صرف الگ الگ کناروں پر شروع ہوتا ہے۔ جو بات ایک مطالعے میں بین السطور رہتی ہے وہی دوسرے مطالعے میں کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ لیکن اگرچہ اِن دونوں کے درمیان تصادم نہیں ہے، پھر بھی anti-thesis ضرور ان دونوں کے درمیان موجود ہے۔ اور کوئی بات یہ کہنے سے زیادہ گمراہ کن نہیں کہ خدا محض فطرت کا ہم معنی لفظ ہے۔ فطرت کی صفات پیدائش، نشو ونما اور موت ہیں۔ خدا نہ شروع ہوسکتا ہے نہ ختم۔ فطرت نتائج کا مجموعہ ہے خدا ان تمام نتائج کا لازوال سبب ہے۔ فطرت ایسی چیزوں کا نظام ہے جنہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ خدا خود عقلِ کلی ہے۔ اِن جوڑوں کو جدا کردیں، اِن میں سے قائم، مُسبّب، فطرتِ مطلق، عقلِ کلی کو نکال لیجئے تب جو کچھ رہ جائے گا وہ یقیناً فطرت ہے۔ مگر یوں لٹی پٹی اور تنہا فطرت خدا کی نفی ہے اُس کی مترادف نہیں۔ چنانچہ میں اس خیال کی نفی کرتا ہوں کہ مذہب اور فطرت کے درمیان کوئی تصادم موجود ہے۔ اور اِس بات کی تائید کرتا ہوں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے antithesis ہیں۔''

50

ستمبر یا اکتوبر میں کسی قسم کی تعطیلات ہوئیں تو اقبال پھر سیالکوٹ گئے۔ کریم بی بھی میکے سے آئی ہوئی تھیں۔

51

خدا کے وجود کے بہت سے عقلی دلائل دیئے گئے تھے۔

ارسطو نے کہا تھا کہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ اسباب کا سلسلہ کہیں نہ کہیں سے تو شروع ہوا ہوگا اور وہی پہلا سبب خدا رہا ہوگا۔ مذہبی علما کہتے تھے کہ ہر چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے۔ کائنات کا بنانے والا بھی کوئی نہ کوئی رہا ہوگا۔ جدید عقلیت پسندی کے بانی ڈیکارٹس کا کہنا تھا کہ اگر ہم ایک مکمل ہستی کا تصور کر سکتے ہیں تو پھر اُس کا وجود ثابت ہوجاتا ہے کیونکہ اگر وہ ہستی موجود نہیں تو پھر مکمل بھی نہیں ہوسکتی، مگر چونکہ ہم مکمل ہستی کا تصور کر رہے ہیں لہٰذا وہ موجود بھی ضرور ہوگی۔

اٹھارویں صدی کے اواخر تک مذہب اور فلسفہ کافی خلط ملط ہوگیا تھا۔ کانٹ، جو عیسائی تھا، یہ مشن لے کر اُٹھا کہ وہ مذہب کو منطق کے کمزور سہاروں سے نجات دلائے گا۔ چنانچہ اُس نے خدا کے وجود کے تمام عقلی دلائل رد کردئے۔ ارسطو کی دلیل اس وجہ سے غلط تھی کہ اُس نے خود کہا تھا کہ ہر چیز کا کوئی سبب ہوتا ہے، تو پھر خدا کا بھی کوئی سبب ہونا چاہئے؟ جہاں تک اِس روایتی دلیل کا تعلق ہے کہ ہر چیز کا خالق ہوتا ہے لہٰذا کائنات کا خالق بھی ہونا چاہئیے، تو دنیا میں ہم جتنی بھی چیزیں دیکھتے ہیں اُن کے بنانے والے مرجاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ چیزیں پھر بھی باقی رہتی ہیں۔ لہٰذا خدا کے خالق ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اب بھی موجود ہوگا۔

کانٹ کے خیال میں خدا کے وجود کا ثبوت انسان کے اپنے ضمیر میں ہے۔ چونکہ ہم نیکی کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اگر اس کا بدلہ نہ ملے تو ہمارے ضمیر کا کوئی جواز بھی نہیں رہے گا۔ لہٰذا ایک ایسی ہستی کے وجود کی ضرورت ہے جو دُنیاوی زندگی کے بعد ہمیں انصاف دلائے۔

52

شیلے وہ شاعر تھا جس نے شیطان کو اخلاقی نمونے کے طور پر پیش کیا تھا۔ خدا سے بغاوت کے

مرکزی خیال کو نقطۂ عروج پر پہچانے والا یہی شاعر تھا جس نے ''پرومیتھیوس اَن باؤنڈ'' اُس وقت لکھا تھا جب وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر محبوبہ کے ساتھ فرار ہو رہا تھا۔ اِس کے علاوہ شیلے پہلا انگریز تھا جس نے باقاعدہ پمفلٹ لکھ کر لوگوں کو خدا اور مسیح سے منہ پھیرنے کی دعوت دی۔ بائرن کی طرح وہ بھی آزادی کا متوالا تھا خواہ وہ آزادی سیاسی ہو یا ذہنی۔

کہتے ہیں کہ آئی سکائی لوس نے اپنے المیہ ڈرامے کا دوسرا حصہ بھی لکھا تھا، جس میں دکھایا تھا کہ زیوس دیوتا اپنے باغی پرومیتھیوس کو معاف کر دیتا ہے۔ شیلے نے اِسی گم شدہ ڈرامے کا عنوان لیا تھا مگر اُس کا ہیرو خدا سے معافی نہیں مانگتا۔

Monarch of Gods and Daemons, and all Spirits
But One, who throng those bright and rolling worlds
Which thou and I alone of living things
Behold with sleepless eyes! Regard this Earth
Made multitudinous with thy slaves, whom thou
Requitest for knee-worship, prayer, and praise,
And toil, and hecatombs of broken hearts,
With fear and self-contempt and barren hope.
Whilst me, who am thy foe, eyeless in hate,
Hast thou made reign and triumph, to thy scorn,
O'er mine own minsery and thy vain revenge.
Three thousand years of sleep-unsheltered hours,
And moments aye divided by keen pangs
Till they seemed years, torture and solitude,
Scorn and despaire, these are mine empire.
More glorious far than that which thou surveyest
From thy unenvied throne, O Mighty God!

53

شیلے نے اپنے دیباچے میں لکھا تھا:

شیطان واحد خیالی پیکر ہے جس میں پرومیتھیوس سے مشابہت پائی جاتی ہے...اور میری رائے میں پرومیتھیوس شیطان سے کہیں زیادہ شاعرانہ کردار ہے کیونکہ جرأت، وقار اور خدا کی ہمہ گیر قدرت کے خلاف مزاحمت میں ثابت قدم رہنے کے علاوہ اُسے اقتدار کی ہوس، حسد، انتقام اور ذاتی مفادات کی طلب کے رنگوں سے پاک بھی دکھایا جا سکتا ہے جبکہ پیراڈائز لوسٹ کے ہیرو میں یہ خرابیاں دکھائی دیتی ہیں اور اِس وجہ سے جبر کے خلاف مزاحمت کے اخلاقی سبق میں خلل ڈالتی ہیں۔ (پیراڈائز لوسٹ میں) شیطان کا کردار ہمارے ذہنوں میں ایک تأثر کو جنم دیتا ہے جس کی وجہ سے ہم اُس کی خامیوں کو بھی اُس پر ہونے والے مظالم کے ساتھ ساتھ وزن کرنے لگتے ہیں... یہ بات اُن لوگوں کے ذہنوں کو بالکل ہی گمراہ کر دیتی ہے جو اِس عظیم الشان افسانے کو کسی مذہبی احساس کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

مگر پرومیتھیوس ایک طرح سے اخلاقی اور طباع فطرت کا مکمل ترین نمونہ ہے جسے صاف ترین اور سچے ترین جذبے بہترین اور اعلیٰ ترین مقاصد کی طرف گامزن کرتے ہیں۔

54

عہدِ جدید میں جو مقام فلسفے کی تاریخ میں کانٹ کو حاصل تھا، وہی ادب کے میدان میں وڈزورتھ کو حاصل تھا۔ جہاں فلسفی کے دلائل بیکار ہو گئے تھے وہاں شاعر کا جادو کام کر گیا۔

ورڈزورتھ اپنے الفاظ کی تاثیر سے پڑھنے والوں کو اُس روحانی تجربے سے دوچار کرتا تھا، جہاں وہ اپنے دلوں کو فطرت کے ساتھ دھڑکتا محسوس کرتے تھے اور دھڑکنیں خود بخود اپنے بنانے والے کی حمد کرنے لگتی تھیں۔

My heart leaps up when I behold
A rainbow in the sky:
So was it when life began;
So is it now that I am a man;
So be it when I shall grow old;
Or let me die!
The child is father of the Man;
And I could wish my days to be
Bound each to each by natural piety.

۵۵

اقبال کا بیان ہے۔

''مجھے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، مرزا عبدالقادر بیدل اور ورڈزورتھ کا رہینِ منّت ہونے کا اعتراف ہے۔ پہلے دونوں نے چیزوں کے باطن تک میری رہنمائی کی۔ تیسرے اور چوتھے نے مجھے سکھایا کہ شاعری کے مغربی نصب العین کو اپنی رُوح میں سمونے کے بعد اپنی روح اور اپنے طریقۂ اظہار کو مشرقی کیسے رکھا جائے۔ اور آخری نے مُجھے زمانۂ طالبعلمی میں خُدا کا مُنکر بننے سے بچالیا۔'' (۳۰)

56

انجمن اتحاد کے مشاعروں میں اب اکثر شاعر اقبال کی طرح اپنا کلام ترنم سے سنانے لگے تھے۔
مرزا ارشد بھلا کب چوکنے والے تھے۔ اُنہوں نے اِس صورت حال پر ایک مصرع کہہ دیا جو آناً فاناً مشہور ہو گیا

نظمِ اقبال نے ہر اِک کو گویا کردیا

57

دسمبر ۱۸۹۷ء کے وسط میں حکیم امین الدین نے عید کی تقریب میں اپنے خاص احباب کو بلایا۔ شیخ گلاب دین، منشی محبوب عالم، احمد حسین اور شیخ عبدالقادر کے علاوہ اقبال بھی مدعو کیۓ گئے تھے۔ ان کے علاوہ بھی چھ سات مہمان تھے جن سے اقبال اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔
اُن دنوں اقبال اور احمد حسین خاں مشاعروں میں ایک دوسرے کے حریف سمجھے جانے لگے تھے۔ طعام سے فارغ ہو کر عبدالقادر نے تجویز پیش کی کہ یہ دونوں فی البدیہہ غزلیں کہیں۔ طرح مصرع دیتے ہو اُنہوں نے یہ شعر پڑھا

وعدۂ وصل سے ہو دل کو تسلی کیونکر
فکر یہ ہے کہ وہ وعدے سے پشیماں ہو گا

غزل

لاکھ سرتاجِ سخن ناظمِ شرواں ہو گا
پر مرے سامنے اِک طِفلِ دبستاں ہو گا
مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے
موت جب آئے گی اُس کو تو وہ خنداں ہو گا
جو وفاپیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں
جنّتی ہوگا، فرشتوں میں نُمایاں ہو گا
چار سُو پھولوں کا انبار نظر آتا ہے
شاید اِس بزم میں اقبالؔ غزل خواں ہو گا

احمد حسین خاں نے اپنی باری آنے پر جو مقطع سنایا وہ بظاہر اقبال کے مقطع کا جواب معلوم ہوتا تھا

بلبلیں دُور رہیں مجھ سے تو اچھا احمدؔ
ورنہ تُو گل کی طرح چاک گریباں ہو گا

بعض محققین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مردِ مومن اور خودی والے اشعار اقبال نے ۱۹۱۵ء کے بعد اضافہ کیے ہوں گے۔ بظاہر اِس قیاس آرائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ دونوں الفاظ یہاں اُن معانی میں استعمال نہیں ہوئے ہیں جو ۱۹۱۵ء کے بعد اقبال نے اِن الفاظ کو پہنائے تھے۔ یہاں تو خودی والے شعر میں بھی حسینوں سے چھیڑ چھاڑ ہی نظر آتی ہے۔ مردِ مومن کے تبسم والی بات تصوّف کا ایک روائتی نظریہ ہے جسے اقبال نے اپنے آخری زمانے میں فارسی میں دوبارہ نظم کر کے اور زیادہ مشہور کر دیا۔ اِس غزل کے کل آٹھ اشعار دستیاب ہیں۔ کوئی اوّلین نسخہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے یہ شبہات پیدا ہوئے۔

58

حکیم امین الدین بیرسٹر اپنی وکالت کے سلسلے میں پشاور منتقل ہو گئے۔

انجمن اتحاد کے مشاعرے اُن کے نوجوان عزیز حکیم شہباز الدین کے مکان کے چبوترے پر

منتقل ہو گئے۔

حکیم شہباز الدین بہت ہی لاغر اور نحیف تھے مگر دل کے اچھے تھے۔ احباب کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ رکھتے تھے۔

59

۴ جنوری کو پنجاب یونیورسٹی کا کونووکیشن منعقد ہوا جس میں گزشتہ برس اعلان ہونے والے نتائج پر اسناد اور تمغے تقسیم کیے گئے۔ وائس چانسلر سر سی اے رو تھے اور پنجاب کے گورنر تقسیم اسناد کے لئے خود آئے تھے۔

کونووکیشن میں اقبال بھی گئے ہوں گے اور اپنی بی اے کی اسناد اور خلیفہ محمد حسن ایچی سن میڈل وصول کیا ہوگا۔

60

انجمن حمایت اسلام کے چودھویں سالانہ جلسہ کے اگلے ماہ ایم اے کے امتحانات ہوئے۔ اقبال ایک سال فلسفہ پڑھ چکے تھے اور اُس وقت کے قواعد کی رو سے وہ امتحان دینے کے مجاز تھے۔ ایک روایت ہے کہ اُنہوں نے امتحان نہیں دیا۔ اور قانون کے امتحان کی تیاری کرتے رہے جو دسمبر میں منعقد ہونے والا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اُنہوں نے امتحان دیا اور فیل ہوئے۔

61

پروفیسر اُشر صاحب جو اقبال کو فلسفہ پڑھاتے تھے، فروری میں گورنمنٹ کالج چھوڑ کر چلے گئے اور اُن کی جگہ علی گڑھ والے ٹامس آرنلڈ لاہور آ گئے...!

اقبال کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا ہوگا جب وہ دنیا کے عظیم مستشرق سے اپنے کالج میں ایم اے فلسفہ کے واحد طالبعلم کے طور پر ملے ہوں گے (۳۱)۔ ممکن ہے پہلے پہل یہ جان کر آرنلڈ کو مایوسی ہوئی ہو کہ اُنہیں صرف ایک لڑکے کو پڑھانا ہے مگر اقبال سے ملنے کے بعد اُنہوں نے محسوس کیا کہ جس قسم کے طالبعلم کی وہ ہمیشہ سے آرزو رکھتے تھے وہ اُن کے سامنے ہے۔

62

غزل

جب سے دل میں گزر ہُوا تیرا
یہ مکاں لامکان ہے گویا

عشق کی راہ و رَسم اُلٹی ہے
یاں خموشی زبان ہے گویا

اہلِ دل ہی اِسے سمجھتے ہیں
شعر دل کی زبان ہے گویا

63

آرنلڈ سے پہلی ملاقات کے چندروز بعد اقبال ریل کے ایک ڈبے میں بیٹھے سیالکوٹ کا سفر کررہے تھے اور باہر موسمِ بہار کی رعنائیاں پورے عروج پر تھیں۔

سیالکوٹ میں ۲۸ مارچ کی صبح اقبال ایک دوست کی دکان پر محمد ذکی کے ساتھ بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ میر حسن سامنے سے آتے دکھائی دیے۔ کالج کی راہ پر تھے مگر چہرہ دُھواں ہورہا تھا۔ کہنے لگے۔

''مجھے تار موصول ہوا ہے کل علی گڑھ میں سرسید وفات پاگئے!''

یہ خبر کسی دھاکے سے کم نہ تھی۔ یہ سب جانتے تھے کہ علی گڑھ کالج میں ایک لاکھ روپیہ غبن کی وجہ سے سرسید فکرمند رہنے لگے ہیں اوراس کا اثر اُن کی صحت پر مرتب ہورہا ہے۔ پھر یوں بھی اُن کی عمر اَسّی برس سے اُوپر ہوچلی تھی۔ مگر وہ ایک ایسی شخصیت تھے کہ اُن کی موت کا خیال کرنا ذرا مشکل تھا۔ اقبال اور میر حسن کو اِس بات کا دکھ بھی ضرور ہوا ہوگا کہ سرسید نے جو تفسیر قرآن شروع کی تھی وہ اب مکمل نہ ہوسکے گی۔

میر حسن نے اقبال سے کہا کہ وہ سرسید کی تاریخ وفات نکالیں اور خود کالج روانہ ہوگئے۔ یہ کاغذ قلم لے کر ابجد کا حساب کرنے لگے اور تھوڑی دیر بعد ایک قرآنی آیت ذکی کو دے کر کہا۔ ''ابھی کالج جا کر میر

صاحب کو دے دو‘‘۔ میر صاحب نے پرچہ ذکی کے ہاتھ سے لیا تو اُس پر لکھا تھا۔ **انی متوفیک ورافعک الی ومطھرک** تمام حروف کے اعداد جمع ہو کر سید احمد خاں کی تاریخ وفات کے برابر نکلتے تھے۔ ’’بہت خوب ہے!‘‘ اُنہوں نے بیٹے سے کہا۔ ’’میں نے بھی ایک مادہ نکالا ہے اور وہ ہے، **غفر لہٗ**۔‘‘

پھر اُنہوں نے دونوں مادّے علی گڑھ بھجوا دیئے (۳۲)۔

64

۲۳ جون کو اقبال کے یہاں لڑکا پیدا ہوا (۳۳)۔ اُس زمانے میں اقبال میں آفتاب پرستی کا ایک دبا دبا سار جحان پایا جاتا تھا۔ شائد اِسی لئے اُنہوں نے بچے کا نام آفتاب اقبال رکھ دیا۔

اُس زمانے میں بزرگوں کے سامنے اپنی اولاد کو پیار کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اقبال بھی اسی روش پر قائم تھے اور عموماً دوسروں کے سامنے اپنے بیٹے کو گود میں کھلانے سے پرہیز کرتے تھے (۳۴)۔

65

ہاسٹل میں اقبال نے اعلان کیا کہ اُن کے یہاں لڑکا ہوا ہے جسے وہ اہلِ بیت کے دُشمنوں کو جلانے کے لئے آفتاب حسین کہتے ہیں۔

نیرنگ کو یقین نہ آیا۔

’’حالت یہ تھی کہ اقبال بارہا ایسے افسانے بھی گھڑ کر سنا دیا کرتے تھے، جن کی اصلیت کچھ نہ ہوتی تھی۔‘‘ نیرنگ نے بعد میں لکھا۔ ’’اِس لئے آفتاب حسین... کے قصے کو بھی میں باور نہ کرتا تھا۔‘‘ اُن کے دوست یہی سمجھتے رہے کہ لڑکے کی پیدائش کی بات ہی سِرے سے گپ ہے۔

66

سیالکوٹ میں دیوانی عدالت نے شیخ نور محمد کے حق میں فیصلہ دے دیا اور مقدمے کے اخراجات اُسی پڑوسی کو ادا کرنے کا حکم دیا جس نے اُن کے گھر کے نیچے تنور لگوا دیا تھا۔ پڑوسی کے پاس پیسے نہیں تھے۔ شیخ نور محمد نے اِسی کو غنیمت سمجھا کہ تازہ ہوا بازیاب ہو گئی تھی اور پیسوں کے لئے تقاضا نہ کیا (۳۵)۔

امام بی بی نے یہ سلسلہ شروع کیا کہ محلے کی غریب اور یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر بلا لیتیں۔ وہ کام کاج

میں ہاتھ بٹاتی تھیں اور یہ اپنی بیٹیوں کی طرح اُن کی تربیت کرتی تھیں۔ عطا محمد کو پیسہ ہاتھ سے نکالنے کا بہانہ چاہئے تھا۔ وہ چھٹیوں میں گھر آئے تو کچھ رقم اپنی بے جی کو ''گپت دان'' کے لئے دے دی۔ امام بی بی ان پیسوں سے بھی محلے کی غریب عورتوں کی خفیہ مدد کرنے لگیں۔ رفتہ رفتہ محلے والوں کا رویہ بدل گیا اور ٹوپیوں والوں کے گھرانے کی بڑی عزت ہوگئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دُنیا میں اُونچے مقام کا جو خواب امام بی بی نے دیکھا تھا وہ اُن کی نیک دلی اور سخت محنت کی بدولت اب پورا ہوگیا ہے۔

تنور والے پڑوسی کے دل کا غبار پھر بھی صاف نہ ہوا۔

67

اِس دفعہ جب سردیاں آئیں تو پنجاب میں طاعون کی زبردست وبا پھیلی۔ سیالکوٹ میں میر حسام الدین نے ضرور اپنے بچازاد ''منکر'' بھائی سے کہا ہوگا۔ ''تم نے دیکھا؟ ہمارے مسیح موعود نے سال کے شروع میں ہی طاعون کی پیش گوئی کردی تھی۔ ایمان لے آؤ!''

بہرحال جب بیسیوں لوگ روز مرنے لگے تو ایک روز ٹوپیوں والوں کے گھرانے میں یہ خبر پہنچی کہ طاعون کی بیماری نے اُن کے خطرناک دشمن تنور والے پڑوسی کا گھر دیکھ لیا ہے۔

چند دنوں بعد اُس کی بیٹی روتی ہوئی امام بی بی کے پاس آئی۔ اُس کا باپ مر رہا تھا مگر جان نہیں نکلتی تھی۔ اپنی بیٹی کو بھیجا تھا کہ کسی طرح نتھو کو بلا کر لے آؤ۔ وہ جب تک معاف نہیں کرے گا، مجھے تکلیف سے نجات نہیں ملے گی۔

امام بی بی کو طاعون والے گھر کی لڑکی کا اپنے یہاں آنا سخت ناگوار گذرا مگر شیخ نور محمد لٹھے کا رومال کندھے پر رکھ کر تیار ہوگئے۔ پڑوسی کے سرہانے بیٹھ کر اُسے تسلی دی اور دعائیں پڑھیں۔ وہ مر گیا تو اپنے ہاتھوں سے کفن تیار کیا اور قبرستان تک چھوڑنے گئے۔ گھر میں امام بی بی منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ نور محمد واپس آئے تو اُنہوں نے غُصے کا اِظہار کیا مگر نور محمد نے کہا۔ ''جیل والے بھی پھانسی پانے والے قاتل کی آخری خواہش پوری کردیتے ہیں...''

68

حکیم شہباز اپنا دل وجگر دوستوں کی نذر کرسکتے تھے مگر باقاعدگی سے مشاعروں کا بندوبست کرنا اُن

کی ہمت کی بات نہ تھی۔ انجمن اتحاد کچھ ہی عرصے میں ختم ہو گئی۔ شورِ محشر بھی بند ہو گیا۔ ہاں ویسے قریب قریب روزانہ ہی ان کے چبوترے پر اہلِ سخن کی محفل جمتی تھی جس میں بزرگ اور جوان حصہ لیتے تھے۔ ایسے میں کبھی کسی کی جیب سے تاش کی گڈی نکل آتی تو کچھ منچلے شاعری سے نکل کر رنگوں کی دنیا میں آجاتے۔

پنجابی محاورے میں اینٹ کتے کا بیر مشہور ہے۔ میاں فضل حسین نے اینٹ رنگ بتایا تو اقبال اپنے پتوں کا پنکھا بناتے بناتے بول اٹھے۔ ''اِس کے ساتھ تو تمہارا بیر تھا۔ تم نے اینٹ کیوں بولی؟'' (۳۷)

69

گورنمنٹ کالج میں اقبال اور آرنلڈ کے باہمی ربط کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اتنا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بہت جلد آرنلڈ کو یقین ہو گیا ہو گا کہ اُن کا شاگرد دوسروں سے آگے، بہت آگے جاسکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اقبال کے دل و دماغ پر اپنی شاعری سے زیادہ نہیں تو کم از کم اُس کے برابر فلسفہ کا تسلط تھا۔ اِس لحاظ سے ایم اے کے یہ درس جہاں اقبال اور آرنلڈ غالباً تنہا ہوتے تھے اُن کے دل و دماغ کی سرگزشت میں اُن مشاعروں سے کم اہمیت نہ رکھتے تھے جہاں ایک زمانہ اُن کی فغاں سنا کرتا تھا۔

ایک روز پروفیسر آرنلڈ نے محسوس کیا کہ اقبال کھوئے کھوئے سے اور پریشان ہیں۔ معلوم ہوا ایک مولوی صاحب نے جن سے اقبال بہت زیادہ متاثر تھے کوئی جھوٹا بیان دیا ہے۔

''زندگی میں یہی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے...'' آرنلڈ نے اُنہیں سمجھایا۔ (۳۸)

70

شیخ عبدالقادر کا بیان ہے (۳۹):

اقبال کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت اُس کا ''کیفِ غم'' ہے اور یہی کیفیت [اقبال] کے ذاتی خصائل میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ جو لوگ اُن سے ملتے رہے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اُن میں یہ عجیب وَصف تھا کہ سنجیدگی اور متانت بیٹھے بیٹھے ظرافت پر غالب آجاتی تھی اور چہرے پر یکایک غم آمیز اثرات نظر آجاتے تھے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے جیسے کوئی دردانگیز خیال دفعتہً دل میں آگیا ہے۔ یہ رنگ اُن کے اشعار میں بہ کثرت پایا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے کلام میں اثر گدازِ دل سے ہی

پیدا ہوتا ہے۔ غالب کا یہ شعر اِس خیال کی ترجمانی کرتا ہے

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دِلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

71

اقبال کی جذباتی زندگی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ بہت جلد توقعات وابستہ کر لیتے تھے اور اُن کے پورے نہ ہونے پر بچوں کی طرح افسردہ یا پھر ناراض ہو جاتے تھے۔

72

دسمبر میں اقبال نے قانون کا امتحان دیا (۴۰)۔

اُن کے لئے یہ ایک اہم موقع رہا ہوگا۔ وکالت کی منزل تک پہنچنے اور ایک درخشاں زندگی کا آغاز کرنے میں اب صرف نتیجہ آنے تک کی دیر تھی۔

73

سر سید احمد خان کے بعد نواب محسن الملک علی گڑھ تحریک کی بیشتر ذمہ داریاں پوری کر رہے تھے۔ مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تیرھویں اجلاس کا اہتمام بھی اُنہوں نے لاہور کے ایک ٹیکنیکل اسکول میں کیا تھا۔ میر حسن اس میں شرکت کرنے سیالکوٹ سے اپنے لڑکے محمد ذکی کے ساتھ آئے اور ممکن ہے اقبال بھی شامل ہُوئے ہوں۔

میر حسن جلسہ گاہ پہنچے تو بارش ہو رہی تھی۔ اتفاق سے یہ اپنا ٹکٹ بھول آئے تھے۔ رضا کاروں نے انہیں روک لیا مگر نواب محسن الملک دُور ہی سے پکارے۔ ''ارے! اِن کو روکتے ہو، جنہوں نے کانفرنس بنائی ہے؟'' ہمیشہ کی طرح اس بار بھی انہیں ڈائس پر جگہ دی گئی (۴۱)۔

کانفرنس میں تقریروں کے علاوہ نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ کشمیر کے جواں سال شاعر خوشی محمد ناظرؔ نے اپنی نظم میں ایک مصرع پڑھا۔

کل خوابِ گراں جو مجھ کو آئی

میر حسن نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ خود پنجابی تھے، مگر غلط اُردو برداشت کرنا اُن کے بس میں نہ تھا۔ بعد میں ناظر کو بلا کر سمجھایا۔ ''بھئی آپ نے خوابِ گراں کو مونث کیسے باندھا؟'' (۴۲)

معلوم نہیں ناظر نے کوئی جواب دیا یا ادب سے خاموش کھڑے رہے مگر خواب نیند کے معنوں میں مؤنث ہی ہوتا ہے۔

74

غالباً جنوری ۱۸۹۹ء میں قانون کے امتحان کا نتیجہ نکلا۔ اقبال اصول قانون (jurisprudence) کے پرچے میں فیل ہوئے تھے۔

غزل

جس کو شہرت بھی ترستی ہے وہ رُسوا اور ہے
ہوش بھی جس پر پھڑک جائیں وہ سودا اور ہے

جان دیتا ہوں تڑپ کر کوچۂ اُلفت میں مَیں
دیکھ لو تُم بھی، کوئی دَم کا تماشا اور ہے

تُم ہنسی میں سچ سمجھ بیٹھے، نہیں حاشا نہیں
وَصل کیسا؟ اب مِرے دِل کی تمنا اور ہے

قیس پر یوں طعنہ زن ہوتی ہے لیلیٰ دشت میں
جس کے کانٹے دِل میں چبھتے ہیں وہ صحرا اور ہے

75

مکتوب احسن مارہروی مدیر ''ریاض سخن'' کے نام

مکرمِ بندہ، جناب میر صاحب۔ السلام علیکم

دونوں رسالے پہنچے۔ سبحان اللہ... افسوس ہے کہ اب تک میں نے آپ کے گلدستے کو کوئی غزل نہیں دی۔ انشاء اللہ تعالیٰ امتحان کے بعد باقاعدہ ارسال کیا کروں گا۔ ایک تکلیف دیتا ہوں۔ اگر آپ کے پاس اُستاذی حضرت مرزا داغ کی کوئی تصویر ہو تو ارسال فرمایئے گا۔ بہت ممنون ہوں گا... مَیں نے تمام دُنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کیے ہیں۔ چُنانچہ انگریزی، جرمنی اور فرنچ شعراء کے لیے امریکہ لکھا ہے... حضرت امیر مینائی کے فوٹو کی بھی ضرورت ہے۔ والسلام

خاکسار

محمد اقبال

از لاہور گورنمنٹ کالج بورڈنگ ہاؤس

۲۸ فروری ۱۸۹۹ء

76

مارچ ۱۸۹۹ء میں ایم اے کا امتحان ہوا۔ خان بہادر نواب بخش میڈل فلسفہ میں اوّل آنے والے طالبعلم کو ملتا تھا۔ چونکہ اقبال واحد امیدوار تھے لہٰذا اُن کا میڈل یوں ہی پکا تھا۔ شرط صرف یہ تھی کہ وہ فیل نہ ہوں۔

باب ٦

مشرقی کالج

۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۰ء

1

لاہور کے یونیورسٹی اورینٹل کالج میں مشرقی زبانوں کی تدریس اور اُن پر اعلیٰ پیمانے کی تحقیق ہوتی تھی۔ عربی، فارسی، سنسکرت کے شعبوں میں جو محقق یہ کام کرتے تھے اُنہیں رِیڈر کہا جاتا تھا اور یہ تین برس کے لئے مقرر کئے جاتے تھے(۱)۔

اپریل ۱۸۹۹ء میں کالج کے پرنسپل سبکدوش ہو کر کلکتہ چلے گئے تو ٹامس آرنلڈ قائم مقام مقرر ہوئے۔ ''میکلوڈ پنجاب عربک رِیڈر'' کی اسامی خالی تھی اور تنخواہ بہتر روپے چودہ آنے۔ آرنلڈ کو اپنے چہیتے شاگرد کا خیال آیا ہوگا جس نے اگرچہ فلسفہ میں ایم اے کیا تھا مگر ایف اے اور بی اے میں عربی کے مضمون میں اول آتا رہا تھا اور ریڈر کی اسامی کے لئے یہ بہت کافی تھا۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال نے اِس تجویز پر کیا محسوس کیا ہوگا۔

پہلی بات یہ تھی کہ وہ اُستاد بننا نہیں چاہتے تھے۔ باپ کی طرح تخیلات کے سوداگر نہیں بلکہ بڑے بھائی کی طرح میدانِ عمل کے شہسوار بننے کے خواہش مند تھے۔ اُنہیں ابھی تک اُمید تھی کہ قانون کے جس پرچے میں وہ فیل ہوئے تھے اُس میں دوبارہ کوشش کر کے کامیاب ہو جائیں گے۔ دوبارہ ناکامی کی

صورت میں مقابلے کا امتحان بھی برا خیال نہیں تھا۔ وکیل نہ بن سکے تو وہ اسسٹنٹ کمشنر بننا چاہتے تھے۔ اور خدانخواستہ اُستادی ہی کرنی پڑی تو عربی کیوں؟ وہ مولوی محمد اقبال کہلوانا نہیں چاہتے ہوں گے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی اور فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر بھی ڈھائی سو روپے ماہوار سے کم نہیں پاتے تھے جبکہ پرنسپل کو پندرہ سو روپے ملتے تھے۔

شائد آرنلڈ نے اُنہیں یہ کہہ کر راضی کیا ہو کہ ابھی تو ایم اے کا نتیجہ بھی نہیں نکلا۔ اگر وہ ابھی سے ملازمت میں آ جائیں تو بعد میں آرنلڈ کے لئے اپنے اثر و رسوخ سے اُنہیں گورنمنٹ کالج میں منتقل کروانا دشوار نہ ہوگا۔ پھر تدریس کے ساتھ ساتھ وہ وکالت کے امتحان کی تیاری بھی کر سکتے تھے۔

درخواست دینے کی آخری تاریخ ۱۵ اپریل تھی۔

2

۲۲ اپریل کو ایم اے کا نتیجہ برآمد ہوا۔ اِقبال تیسرے درجے میں پاس ہوئے تھے۔ بہرحال اگلے کانووکیشن میں اُنہیں میڈل ملنے والا تھا۔

3

۲۸ اپریل کو آرنلڈ قائم مقام پرنسپل بن کر اورینٹل کالج آ گئے۔

۵ مئی کو پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کی سب کمیٹی نے متفقہ طور پر اقبال کے تقرر کی تجویز پیش کی۔ اب سنڈیکیٹ کو اس کی رسمی منظوری دینی تھی۔

۱۳ مئی سے اقبال نے مشروط طور پر ریڈر کا عہدہ سنبھال لیا (۲)۔

4

اقبال کے فرائضِ منصبی یہ تھے:

(۱) کالج کی عربی تالیفات کی طباعت کا اہتمام کرنا۔

(۲) علوم و فنون کی کتابوں کا اُردو ترجمہ کرنا خواہ عربی سے کریں یا انگریزی سے۔

(۳) کالج میں پڑھانا۔

اقبال نے کون کون سی تالیفات کی طباعت کا اہتمام کیا، یہ معلوم نہیں مگر ترجمے کے لئے اُنہوں نے سب سے پہلے جس کتاب کو منتخب کیا وہ عربی میں لکھی ہوئی ایک فلسفہ کی کتاب تھی۔

5

کالج میں اقبال بی اوایل (سال اول ودوم) کو تاریخ اور اقتصادیات پڑھاتے تھے جس کا نصاب یہ تھا:

Selley's *Expansion of England*
Notes on English and Indian History
Fawcett's *Political Economy*

انٹرمیڈیٹ (سال اول) کے لئے اُنہیں منطق کا مضمون سونپا گیا تھا۔

Ray's *Deductive Logic (Revised)* pp. 1- 100

انٹرمیڈیٹ (سالِ دوم) میں منطق کی کتاب کے بقیہ حصے پڑھانے کے ساتھ ساتھ نفسیات بھی اُن کے سپرد تھی:

Ladd's *Primer of Psychology*

اِن میں سے ہر کلاس میں ہفتے میں چھ پیریڈ یعنی اوسطاً روزانہ تین پیریڈ!

اِس نظامُ الاوقات میں، جو اقبال کی پیشہ ورانہ زندگی کی پہلی دستاویز ہے، اُن کے ذہن کے اُس مخصوص وصف کا عکس دکھائی دیتا ہے جو اُن کی سب سے بڑی طاقت بھی تھا اور سب سے بڑی کمزوری بھی۔ یعنی ایک ہی وقت میں بہت سی چیزوں پر توجہ مرکوز کرنا۔ دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ اِن متنوع مضامین میں جو مضمون شامل نہیں، وہ عربی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اورینٹل کالج میں عربی پڑھانے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔

6

معلوم ہوتا ہے کہ تدریس کو اُنہوں نے بڑی دیانت داری کے ساتھ شروع کیا۔ کلاس لینے سے پہلے وہ باقاعدہ نوٹ بنایا کرتے ہوں گے کیونکہ اُس زمانے کے چند کاغذوں پر، جنہیں وہ *The Poets of The 19th Century* میں رکھ کر ہمیشہ کے لئے بھول گئے بعض ایسے موضوعات پر اُن کے نوٹس دستیاب

ہوئے ہیں جنہیں وہ اُن دنوں پڑھا رہے تھے: 'علم النفس والقویٰ'۔ انگلستان کی حالت اُنیسویں صدی میں (۱۸۱۵ء تا ۱۸۸۸ء)۔ بستیاں آباد کرنے کا پرانا اور نیا طریقہ۔ تجارت اور جنگ۔ یہ نوٹس اُردو میں لکھے گئے تھے (۳)۔

7

اقبال نے بھاٹی دروازے میں کسی میاں محمد بخش کا مکان کرائے پر لیا۔ اس علاقے میں اور بھی کئی معلم رہتے تھے جن میں سے محمد حسین آزاد ہوش وحواس سے بیگانہ گلیوں میں گھومتے دکھائی دیتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اگلے چھ برس میں کئی مکان تبدیل کئے مگر اب آخری دو مکانات کے سوا اور کسی کی نشاندہی ممکن نہیں ہے۔

کریم بی کو وہ اب بھی لاہور نہ لائے یا شائد اُنہوں نے ہی آنا پسند نہ کیا (۴)۔ اقبال نے ایک باورچی رکھ لیا جس کا نام محمد حسین تھا۔ اُس زمانے میں جبکہ گوشت اور سبزی محفوظ رکھنے کا کوئی طریقہ نہ تھا محمد حسین ہر روز بازار سے سودا خرید کر لے آتا جس کا اہم جزو بکری کا گوشت تھا۔ یہ اقبال کی مرغوب غذا تھی (۵)۔ گائے کا گوشت نہ وہ کھاتے تھے اور نہ انہیں ہضم ہوتا تھا۔

8

روپے ہاتھ میں آئے تو معلوم ہوا کہ خرچ کرنے کے معاملے میں اقبال اپنے بڑے بھائی کی ضد اور اپنی ماں کی طرح کفایت شعار ہیں۔

۸ جون کو اُنہوں نے کالج کے نوٹس والے کاغذات کی پشت پر باورچی خانے کا حساب لکھنا شروع کیا۔ (۶)

اُس زمانے میں روپیہ کے سولہ آنے اور ایک آنے کے چار پیسے ہوتے تھے۔ آنے اور پیسے کا اندراج کرنے کے لئے عام طور پر ان کی علامات لکھی جاتی تھیں، جو یہ تھیں:

ـــ ، ایک پیسہ	ـ۱ـ ، ایک آنہ ایک پیسہ
۰ ، دو پیسے	۱۰ ، ایک آنہ دو پیسے
ـ۰ـ ، تین پیسے	ـ۱ـ۰ ، ایک آنہ تین پیسے

۱ / ایک آنہ (چار پیسہ) ۲ / دو آنے

عہ ایک روپیہ

للعہ چار روپے

اقبال اُردو لکھتے ہوئے اُردو کے ہندسے اور انگریزی لکھتے ہوئے انگریزی کے ہندسے استعمال کرتے تھے۔

حساب نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷ جون کو اقبال نے محمد حسین کو کچھ روپے دئے تھے جن میں سے وہ ۴ آنے ۳ پیسے کا سودا خرید کر لایا۔ اُس میں دال (۲ پیسے)، املی (۲ پیسے)، گوشت (۱ آنہ ۲ پیسے)، دہی (۲ پیسے)، لہسن (۲ پیسے)، دھنیا اور سونف (۱ پیسے) شامل تھا۔

۹ جون کو مزید خریداری ہوئی۔ شائد ۲ آنے کا گھڑا اور کونڈا خریدا گیا۔ اس کے علاوہ گوشت (دہی ۱ آنہ ۲ پیسے)، دال چنا (۱ پیسہ)، دہی (وہی ۲ پیسے)، اور سبزی (۱ پیسہ) خریدی گئی جس کا کل میزان ۴ آنے ۲ پیسے بنتا تھا۔ اٹھنی محمد حسین کے ہاتھ میں آئندہ اخراجات کے لئے باقی رہنے دی گئی۔

۱۰ جون سے ۱۳ جون کا حساب اقبال نے اکٹھا لکھا۔ اس دوران ۲ پیسے کے لیمپ کی خریداری ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ابھی تک بجلی کی فراہمی شروع نہیں ہوئی تھی۔

اِن چار دِنوں میں تین دفعہ ۱ آنہ ۱ پیسے کا گوشت خریدا گیا، دو دفعہ ایک ایک آنے کا دودھ، ایک دفعہ سبزی (۳ پیسہ)، مسالہ (۱ پیسہ)، مصری (۱ آنہ) اور آلو (۲ پیسے) خریدے گئے۔ اِن کے علاوہ اقبال کے گھر میں ۲ آنے باقی رہے۔ لیکن ۱۲ جون کے اندراج سے کچھ ایسا لگتا ہے کہ یہ پیسے اقبال نے کسی وقت واپس لے لئے۔

۱۴ سے ۱۶ جون کی تاریخیں اقبال نے اپنی عادت کے خلاف انگریزی ہندسوں میں درج کیں۔ اِس کے علاوہ گوشت اور سبزی (پانچ دفعہ)، قیمہ (۲ آنے کا) اور آم (۲ پیسے) خریدے گئے۔ محمد حسین کی اپنی جیب سے ۳ روپے ۲ آنے خرچ ہو گئے۔ جو اقبال نے غالباً اگلے ایک دو روز میں اُسے لوٹا دئے ہوں گے۔

9

۲۲ سے ۲۶ جون کے درمیان اقبال نے ۱۱ آنے ۱ پیسہ کے سودے کا اندراج کیا جس میں چار دفعہ گوشت، تین دفعہ سبزی اور ایک دفعہ چاول کے علاوہ آم (۱ پیسہ) اور گھیا (۱ پیسہ) شامل تھے۔

۲۸ جون کو خاص خریداری ہوئی۔ کل ۴ روپے ۲ آنے خرچ ہوئے جن میں آٹا (ا روپیہ)، روغن زرد (ا روپیہ)، دال (۲ آنے) چاول (۸ آنے) اور مسالہ شامل تھا۔ غالباً چولہا جلانے کے لئے لکڑی (ا روپیہ) بھی آئی۔ ۸ آنے محمد حسین کو پیشگی دئے۔

اِس کے بعد کا حساب کسی دوسرے کاغذ پر لکھا گیا جو دستیاب نہیں ہو سکا۔ بلکہ یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس کے بعد اقبال حساب لکھنے سے بیزار ہو گئے ہوں کیونکہ اس قسم کی چیزوں میں مستقل مزاجی اُن کا شیوہ نہ تھی۔

10

کالج جانے کے لئے وہ تانگہ استعمال کرتے ہوں گے۔

عام پنجابی نوجوانوں کی طرح وہ شلوار قمیض پہنتے تھے جس پر سردیوں میں کوٹ کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ اُن دنوں شرفا کا ننگے سر گھومنا معیوب تصور کیا جاتا تھا لہٰذا کالج آتے ہوئے وہ سر پر پگڑی باندھ لیتے تھے۔ حقہ نہ ملنے پر قینچی کے سستے سگریٹ اُن کا ساتھ دیتے تھے۔

گھر آ کر وہ بنیان اور دھوتی پہن لیتے اور زیادہ تر وقت مطالعہ کرتے رہتے یا پھر کبوتروں سے دل بہلاتے جن کے لئے اُنہوں نے باقاعدہ کابک بنوائے تھے۔ حقہ اس تمام عرصہ میں اُن کا لازمی ساتھی ہوتا تھا (۷)۔

شام کو وہ گھر سے نکلتے یا پھر دوستوں کو گھر بلا کر گپ شپ میں وقت گزارتے۔ اب اُنہوں نے ستار بھی خرید لیا تھا۔ لاہور کے سرکردہ فقیر گھرانے کے نوجوان فقیر سید نجم الدین اُن کے خاص دوستوں میں سے تھے جو طاؤس بجانے میں مہارت رکھتے تھے (۸)۔

11

کالج میں تو آرنلڈ سے روزانہ کی ملاقات تھی ہی سہی۔ اب یہ مراسم اُن کے گھر تک پہنچ گئے۔

آرنلڈ کا گھرانہ اُنہیں ''حقیقی خوشیوں کا نمونہ'' نظر آتا تھا۔ مسز آرنلڈ ایک خوش اخلاق خاتون تھیں اور اُن کی چھوٹی سی بچی نینسی بھی ہنستی کھیلتی دکھائی دیتی تھی۔ ممکن ہے اقبال کو کبھی کبھی خیال آتا ہو کہ وہ اپنے لئے بھی ایسی ہی خوشیاں ڈھونڈ سکتے تھے اگر اُن کے بزرگوں کی بے جا ضد نے اُن پر یہ راستہ بند

نہ کر دیا ہوتا۔

بھاٹی دروازے سے ہیرا منڈی بہت دور نہیں تھی۔ اقبال فضول خرچ نہیں تھے مگر حسن اور موسیقی سے دور رہنا بھی اُن کے بس کی بات نہ تھی۔

غزل

تم نے آغازِ محبت میں یہ سوچا ہوگا
کِس طرح کا یہ نیا چاہنے والا ہوگا

تُم نے سمجھا تو ہے اِس گھر کو ہمارا لیکن
اب ہمارا ہے، کوئی دِن میں تُمہارا ہوگا

حشر میں کُچھ تو تُمہیں حُسن پہ ہو گی اُمید
کُچھ مِرے شِکوہ نہ کرنے کا بھروسا ہوگا

نامہ بر! کام تو باتوں میں ہُوا کرتے ہیں
مان جائیں گے، اگر تُجھ کو سلیقہ ہوگا

ہم کہیں جائیں، کِسی کام کو جائیں لیکن
دل یہ کہتا ہے اُس رِہ سے گزرنا ہوگا

تیرے اشعار میں اقبالؔ! یہ رنگت تو نہیں
تُو نے کم بخت کسی شوخ کو تاکا ہوگا

12

شبلی نعمانی کی کتاب ''الفاروق'' ایک طویل انتظار کے بعد ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ بات قریب قریب یقینی ہے کہ یہ اقبال کی نظر سے گزری کیونکہ اگلے چند برسوں میں اُن کے خیالات پر ''الفاروق'' کا رنگ مرتب ہوتا نظر آتا ہے۔

13

سوامی رام تیرتھ سے اگر کوئی معلوم کرنا چاہتا کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان تو وہ کسی صوفی کا شعر سنا دیتے تھے(۹)۔

یہ ماڈرن سادھو عمر میں اقبال سے چار برس بڑا تھا۔ سوامی جی گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے تھے مگر نہ جانے کہاں کہاں سے ہوتے ہوئے اور پنجابی، اُردو، فارسی، انگریزی، سنسکرت، ریاضی، اور ویدانت پڑھتے ہوئے لاہور آن پہنچے تھے۔ پہلے کرسچین کالج میں عارضی لیکچرار مقرر ہوئے مگر اُس وقت نکالے گئے جب تمام عیسائیوں کو سامنے بٹھا کر کہا۔ ''حضرات! ایک بار میں عیسیٰ مسیح بن کر پیغام دینے آیا تھا۔ مجھے غلط سمجھا گیا، اِس لیے دوبارہ حاضر ہوا ہوں''۔

اقبال اورینٹل کالج پہنچے تو عربی اور فارسی شعبوں میں ایسی دشمنی چل رہی تھی کہ اُنہوں نے گھبرا کر سنسکرت کے دامن میں پناہ لی اور یوں سوامی جی سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ اُنہی دِنوں اقبال نے باقاعدہ سنسکرت سیکھی اور ویدانت سے کافی متاثر ہوئے۔

سنسکرت چھٹی زبان تھی، جس سے اُنہیں واقفیت حاصل ہوئی تھی۔ چھ زبانوں کا عالم ہونا یقیناً ایک غیر معمولی بات تھی۔ زبان کی اِس وسعت نے جس طرح اقبال کے ذہن کو جلا بخشی ہوگی اُس کا نفسیاتی تجزیہ ایک دلچسپ موضوع بن سکتا ہے۔

14

عطا محمد احمدی ہو چکے تھے۔ اُن کے یہاں کوئی لڑکا نہ ہوتا تھا۔ اُنہوں نے مرزا صاحب سے دُعا کروائی۔ چنانچہ اُس برس جب اُن کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو اُس کا نام اعجاز احمد رکھا گیا(۱۰)۔

اقبال اُن دنوں ہر مذہبی تحریک کو فلسفہ کی روشنی میں دیکھنے کے عادی تھے۔ اُن کے خیال میں یہ

مسلمانوں کا اپنی کمزوری کے خلاف ردعمل تھا کہ اُنہوں نے اپنے درمیان ایک شخص کو دورِ حاضر کا پیغمبر مان لیا (۱۱)۔ خود احمدی ہونے کا اقبال کو کبھی خیال نہ آیا۔

15

اکتوبر میں آرنلڈ اورینٹل کانگریس میں شرکت کرنے روم گئے تو اگلے ماہ ایک دبلے پتلے کینیڈین کو ہمراہ لے کر واپس لوٹے۔ اِن صاحب کا نام اسٹراٹن تھا اور یہ مستشرق تھے۔ بالخصوص سنسکرت اور ویدانت فلسفے کے ماہر۔

مسٹر اسٹراٹن اورینٹل کالج کے پرنسپل مقرر ہو گئے۔

اقبال کو ویدانت کی طرف راغب کرنے میں سوامی رام تیرتھ نے اگر کوئی کسر چھوڑی تھی تو وہ اسٹراٹن صاحب نے پوری کر دی (۱۲)۔

16

نومبر میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام کی مجلس منتظمہ کی رکنیت اختیار کر لی (۱۳)۔ یہ غالباً اُس جذبے کا اظہار تھا جو عیسائی مشنریوں کے خلاف ہمیشہ اُن کے سینے میں موجزن رہا تھا۔

دُوسری طرف ذات برادری کے نظام پر مبنی جس معاشرے میں اقبال بڑے ہوئے تھے اُس کی یہ روایت بھی تھی کہ شرفا کسی نہ کسی سماجی تنظیم میں شرکت کر کے نمایاں ہوتے تھے۔ کم پڑھے لکھے دیہاتی گاؤں کی چوپال یا جرگے میں بیٹھتے تھے اور پنجاب کے شہروں میں سماجی تنظیمیں اور انجمنیں اِسی دیہاتی چوپال کی توسیع تھیں۔

17

ناظم لکھنوی نے مرزا ارشد سے لڑ جھگڑ کر اپنی ڈیڑھ اینچ کی مسجد الگ بنائی تھی۔ شاہی قلعے اور مسجد کے درمیان جو حضوری باغ تھا وہیں اُن کی ''بزمِ قیصری'' سجتی تھی۔ مرزا ارشد کو چھیڑنے کے لئے بزمِ قیصری میں ایک نومشق نے ارشد تخلص کر لیا۔ اُدھر دُوسری پارٹی میں بھی کسی شاگرد نے اپنے آپ کو ناظم

کہلوانا شروع کر دیا۔

اقبال گر یہی ہیں حسد کی بناوٹیں
جانے، مشاعرے میں، ہماری بلا، لگی

18

یکم جنوری ۱۹۰۰ء!

نئی صدی کا آغاز نئی اُمنگیں لے کر آیا۔

جب پچھلی صدی کا آغاز ہوا تھا تو دنیا کے اُفق پر ایک طرف گوئٹے اور ورڈز ورتھ کے آزادی کے نغمے چھائے ہوئے تھے اور دُوسری طرف نپولین کے فاتحانہ عزائم کی گھٹا۔ اُس وقت یورپ سمجھتا تھا کہ عقلی دلائل اور سائنس کی مدد سے دنیا کے تمام مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔

آج پورے سو سال بعد یہ نظریہ باطل ثابت ہوا تھا اور وقت کا مؤرخ پکار رہا تھا کہ عقل اور سائنس فقط پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جو اپنی جگہ نئے مسائل کو جنم دیتا ہے۔ پیداوار اور ذرائع کی مساوی تقسیم دراصل مسائل کا حل ہے۔

وقت کے مزاج سے اقبال ضرور واقف رہے ہوں گے۔ اقتصادیات میں اُن کی دلچسپی بتدریج بڑھتی نظر آتی ہے۔ اگر معاشیات کی تدریس اُن کے فرائضِ منصبی میں داخل نہ ہوتی شائد تب بھی وہ اِس مضمون میں دلچسپی ضرور لیتے مگر اب تو فوسیٹ کی کتاب کے خشک صفحات اُنہیں بڑے رنگین خواب دکھا رہے تھے۔ الجیلی کے جس مقالے پر وہ کام کر رہے تھے وہ شائد تصوف کے اُس ذوق کی تسکین کرتا تھا جو اُنہیں اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا مگر اقتصادیات کی کتابوں میں جو کچھ درج تھا وہ اُن کی ذات کے اُس حصے کے لئے ضروری تھا جو اُن میں اُن کی ماں کا ورثہ تھا۔ مٹی سے پیدا ہونے والی دولت کس طرح مٹی کے بنے ہوئے انسانوں کے کام آتی ہے، کس طرح چند روپے لاکھوں کی جائداد میں تبدیل ہوتے ہیں اور کس طرح ایک مفلس قوم امارت اور طاقت کے اعزاز حاصل کرتی ہے، یہ بہت دل کش خواب تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ پھر اقبال متضاد موضوعات میں ذہن لڑا رہے تھے۔ الجیلی کا نظریہ توحید اور فاسیٹ کے اقتصادی نظریات۔ عربی اور انگریزی۔ اور اِن سب کے علاوہ سنسکرت اور ویدانت...

اور پھر وہ نظم جو اُنہیں فروری میں پڑھنی تھی!

19

۴ جنوری کو پنجاب یونیورسٹی کا کانووکیشن گورنمنٹ کالج لاہور کے ہال میں منعقد ہوا۔ ان دنوں وائس چانسلر مسٹر واکر تھے۔ اقبال نے شرکت کر کے اپنی ایم اے کی سند اور نانک بخش میڈل حاصل کیا ہوگا (۱۴)۔

20

فروری میں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ پیسہ اخبار والے مولوی محبوب عالم نے تجویز پیش کی تھی کہ اقبال سے نظم پڑھوائی جائے۔

یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُنہیں اِتنے بڑے جلسے میں نظم سنانے کی دعوت دی گئی تھی۔ اُنہوں نے یتیم خانے کی مناسبت سے ایک یتیم بچے کی فریاد لکھنے کا فیصلہ کیا جو پہلے حاضرین سے اپنا درد بیان کرے گا اور پھر رسول اللہؐ کے روضے پر فریاد کرے گا۔ نظم کے آخری حصے میں رسول پاکؐ یتیم کی فریاد کے جواب میں اُمت سے خطاب کریں گے اور حکم دیں گے کہ انجمن حمایت اسلام کے یتیم خانوں کی امداد کی جائے۔

نظم پوری کی پوری آمد نہ تھی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اِس کا مسالہ بھی مختلف ذرائع سے اکٹھا کیا ہوا لگتا تھا۔ لب ولہجہ پر غالب کی گہری چھاپ تھی مگر جہاں جہاں انگریزی شاعری کے مزاج کی جھلک دکھانا چاہی تھی وہاں یہی لہجہ ایک رکاوٹ بن گیا تھا۔ تھامس گرے نے اپنی مشہور *Elegy Written in a Country Churchyard* میں قبر میں سوئے ہوؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

The breezy call of incense-breathing morn,
The swallow twittering from the straw-built shed,
The cock's shrill clarion or the echoing horn,
No more shall rouse them from their lowly bed.

غالباً نظم کا ایک بند لکھتے ہوئے یہ مصرعے بھی اقبال کے سامنے رہے تھے۔

نظم مکمل ہوئی تو حکیم شہباز کے چبوترے پر سنائی گئی۔ جن بزرگوں نے اِس پر رائے دی اُن میں ایک مولوی سراج الدین بھی تھے جن کا لڑکا ظفر علی خان علی گڑھ میں پڑھتا تھا۔ اُس وقت شائد اقبال کو اندازہ نہ رہا ہو کہ آگے چل کر مولوی صاحب سے زیادہ ظفر علی خان سے اُن کا ربط رہے گا۔ مولوی صاحب بھی یہ نہیں سوچ سکے ہوں گے کہ اِسی نوجوان شاعر کی نظمیں ایک دن اُن کے خاندانی اخبار ''زمیندار'' کی رونق بنیں گی۔

21

پوری نظم میں ۱۰۲ اشعار تھے جن کے ۲۳ ترکیب بند ہوتے تھے۔ یہ مسودہ مولوی محبوب عالم کے سپرد کر دیا گیا جنہوں نے اسے اپنے مطبع میں چھاپنے کی ذمہ داری اُٹھائی تھی۔

22

جلسہ ۲۴ فروری کو اسلامیہ کالج کے صحن میں ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد صدارت کر رہے تھے۔ اُنہوں نے اپنے لیکچر میں اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کو آخرت کی فکر کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی کوئی مقام حاصل کرنا چاہئے۔ مولویوں پر تنقید اس لیکچر میں بھی ٹیپ کے مصرعے کی طرح شامل تھی (۱۵)۔

نمازِ عصر کے بعد اقبال کی نظم کا اعلان ہوا۔

نالۂ یتیم!

اور یوں گویا اقبال نے اپنی زندگی کی پہلی بڑی پرفارمنس کا آغاز کیا

آہ! کیا کہیے کہ اب پہلو میں اپنے دل نہیں
بُجھ گئی جب شمعِ محفل در خُورِ محفل نہیں

اور وہ بزرگ جنہوں نے غالبؔ کا زمانہ دیکھا تھا جان گئے کہ اسد اللہ خاں نے دوسرا جنم لیا ہے اور پنجابی لباس پہنے اُن کے سامنے کھڑا ہے۔

پیسہ اخبار کے منشی عبدالعزیز نے محسوس کیا کہ شروع کے بند سن کر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے ہیں۔ اُنہوں نے اقبال کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور نظم کی کاپیاں فروخت کروانا شروع کر دیں۔ حاضرین پر تاثر قائم ہو چکا تھا۔ بڑھ چڑھ کر قیمت لگائی گئی۔ ایک روپیہ، دو روپیہ، تین روپیہ (۱۶)۔

کچھ دیر بعد اقبال کو اشارہ کیا گیا کہ وہ آگے بڑھیں۔ یتیم بچہ اپنی تنہائی کا غم بیان کرنے لگا

آمدِ بُوئے نسیمِ گُلشنِ رشکِ اِرم
ہو نہ مَرہُونِ سَماعت جس کی آوازِ قدم
لذّتِ رقصِ شُعاعِ آفتابِ صُبح دَم
یا صَدائے نغمۂ مُرغِ سَحَر کا زیر و بَم
رنگ کُچھ شہرِ خُموشاں میں جَما سکتے نہیں

خُفتگانِ کُنجِ مَرقَد کو جَگا سکتے نہیں

بچے کوخیال آیا کہ ''داستاں جیسی ہو، ویسا سننے والا چاہیئے۔'' جب یتیمی کی فریاد ہے تو پھر یتیمِ ہاشمیؐ سے کیوں نہ ہو۔ بارگاہِ رسالتؐ سے اُسے جو جواب ملا اُس نے انجمن کے جلسے میں آنے والوں کے جذبات کوایک انوکھی انتہا تک پہنچادیا۔

رسولِ پاکؐ اپنے روضے سے کہہ رہے تھے۔'انجمن لاہور میں اک حامی اسلام ہے' بچہ اُس انجمن کے اجلاس میں جائے جہاں 'جمع ہیں عاشق مرے سب' ہند اور پنجاب کے'! اِن عاشقوں کو وہ محبوب کا پیغام دے

جِس طرح مُجھ کو شہیدِ کربلا سے پیار ہے
حق تعالیٰ کو یتیموں کی دُعا سے پیار ہے

تھی یتیمی کُچھ ازل سے آشنا اِسلام کی
پہلے رکھی ہے یتیموں نے بِنا اِسلام کی
کہہ رہی ہے اہلِ دِل سے، اِبتداء اِسلام کی
ہے یتیموں پر عنایت اِنتہا اِسلام کی

تُم اگر سمجھو تو یہ سَو بات کی اِک بات ہے
آبرُو میری یَتیمی کی تُمہارے ہَات ہے

یہ خاص میر انیس کے مرثیوں کا رنگ تھا اور ابتدا اور انتہا کے متضاد الفاظ کو جس طرح اکٹھا کیا گیا تھا اُس نے کم پڑھے لکھے، اَن پڑھ اور عالم سب کو یکساں متاثر کیا۔

نظم کے دوران تین سو روپیہ چندہ جمع ہوگیا۔ تمام کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ گیلری میں بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے نے ایک کاپی سولہ رُوپے میں خریدی۔ وہ تو خیر اقبال کے والد ہی تھے مگر دوسروں نے بھی چار چار روپے تک خرچ کر دیئے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے کہا۔

''میں نے دبیر اور انیس کی بہت نظمیں سنی ہیں مگر واقعی ایسی دل شگاف نظم کبھی نہیں سنی!''
عوام کے بیحد اِصرار پر اگلے روز پوری نظم دوبارہ سنائی گئی۔

23

صَوتی اعتبار سے غالبؔ کے یہاں ہکار اور معکوس آوازیں (مثلاً بھ۔ گھ۔ کھ) بہت کم ہیں چنانچہ اُن کے لب ولہجہ سے تمکنت اور وضعداری کا احساس پیدا ہوتا ہے (۱۷)۔ مگر دوسری طرف اُن کے یہاں طویل مصوتوں (مثلاً آ۔ اے۔ ہو) کی کمی اُن کے لہجے میں دھیما پن پیدا کرتی ہے

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دِل نہیں رہا

اِن کے برعکس میرؔ کے کلام میں طویل مصوتوں کا استعمال زیادہ ہوا ہے جس کی وجہ سے اُن کا لہجہ بلند ہے۔ البتہ ہکار اور معکوس آوازوں کا کثرت سے استعمال اُسے عام لوگوں کی بول چال سے قریب لے آتا ہے۔

غالبؔ کے زیرِ اثر اِقبال کا مزاج بھی ہکار اور معکوس آوازوں سے گریزاں ہو گیا مگر اُن کے یہاں طویل مصوتوں کی کثرت بھی ہے۔ جس کی وجہ شائد یہ ہو کہ وہ ابتداء ہی سے مجمعوں میں سنانے کے لئے شعر لکھنے لگے تھے اور اُس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر بھی میسر نہیں تھا۔ بہر حال اقبال کے اس منفرد لہجے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں تمکنت اور شوکت بھی ہے اور عوام تک پہنچنے والی لمبی لمبی تانیں بھی۔

24

انجمن کا جلسہ لُوٹ کر کم از کم اُردو بولنے والوں کے لئے اقبال بھی بادشاہی مسجد اور شالامار باغ کی طرح لاہور کے نوادرات میں شامل ہو گئے۔

اُن کے نئے مداحوں میں میاں شاہ دین ہمایوںؔ شامل تھے، جنہوں نے سات سال پہلے اقبال کا انٹرنس کا پرچہ بنایا تھا۔ ہمایوںؔ کے چچازاد میاں محمد شفیع سے بھی اقبال کی گہری دوستی ہوگئی۔

25

مارچ میں الجیلی کے رسالے کا ترجمہ مکمل ہوا (۱۸)۔ ۳۱ مارچ کو کالج کی سالانہ رپورٹ میں اِس کا تذکرہ آیا اور اقبال کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔

26

انسانِ کامل

الجیلی ۷۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۸۱۱ھ میں فوت ہوئے۔ وہ ابن عربی کے طرزِ فکر سے بہت متاثر تھے...

خالص اور سادہ جوہر وہ چیز ہے جسے نام اور صفات دیئے گئے ہیں۔ یہ جوہر موجود ہے خواہ اس کا یہ وجود واقعی ہو یا خیالی۔ جو موجود ہے اُس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) وجودِ مطلق یا وجودِ خالص، یہ خدا کی ذات ہے۔

(۲) وجود جو عدم سے ملا ہوا ہے، تخلیق یا فطرت۔

خدا کے جوہر یا فکرِ خالص کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ الفاظ اُسے بیان نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ہر تعلق سے بالا تر ہے اور علم تعلق ہی تو ہے۔ انسانی سوچ بے کراں خلاؤں میں سے پرواز کرتی ہوئی ناموں اور صفات کے پردے میں سے گزر جاتی ہے۔ وقت کے وسیع کرّہ کو عبور کر لیتی ہے۔ عدم وجود کی سلطنت میں داخل ہوتی ہے۔ اور وہاں فکرِ خالص کے جوہر تک پہنچ جاتی ہے۔ جو اس طرح ملتا ہے کہ عدم کے اندر موجود ہے۔ تضادات کا مجموعہ! اس فکر خالص کے جوہر (حادثات) دو ہیں: تمام گزرے ہوئے وقت میں حیاتِ ازلی اور تمام آنے والے وقت میں حیاتِ ازلی۔ اس کی دو صفات ہیں، خدا اور مخلوق۔ اس کی دو تعریفیں ہیں، وہ جسے تخلیق نہیں کیا جا سکتا اور وہ جسے تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ اس کے دو نام ہیں۔ خدا اور انسان۔ اس کے دو چہرے ہیں، ظاہر (یہ دنیا) اور پوشیدہ (اگلی دنیا)۔ اس کے دو اثرات ہیں، ضرورت اور امکان۔ اس کے دو نقطہ ہائے نظر ہیں، پہلے نقطۂ نظر سے یہ اپنے لیے غیر موجود اور باقی سب کے لئے موجود ہے۔ دُوسرے نقطۂ نظر سے یہ اپنے لئے موجود اور باقی سب کے لئے غیر موجود ہے!

نام، ابن الجیلی کہتا ہے، اُس کو سمجھ میں بٹھا دیتا ہے جس کا وہ نام ہوتا ہے۔ نام اُس کی تصویر ذہن میں بناتا ہے، اُس کو تخیل میں پیش کر دیتا ہے اور یادداشت میں باقی رکھتا ہے۔ نام گویا اُس چیز کا بیرونی

چھلکا ہوتا ہے جس کا نام لیا جاتا ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

ابن الجیلی کا بقیہ فلسفہ انسان کو نام سے حقیقت یا خدا کی طرف لے جانے کے طریقوں پر مشتمل تھا (۱۹)۔

27

منشی محبوب عالم یورپ کے سفر پر روانہ ہونے والے تھے۔

۲۵ مئی کو اُن کے دوستوں کی طرف سے الوداعی جلسہ ہوا جس میں اقبال بھی مدعو تھے اور احمد حسین خان بھی۔ دونوں نظمیں لکھ کر لائے مگر صرف احمد حسین خان نے اپنی نظم سنائی۔ کھانے کے بعد حاضرین اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے اور جب پندرہ بیس افراد رہ گئے تو اقبال نے اپنی ۱۳۸ اشعار کی نظم 'خدا حافظ' برآمد کی

ہو نہ محبوب سے جُدا کوئی
اے رگِ جانِ عالم آرائی

نظم ترکیب بند میں تھی لیکن اقبال نے جدت یہ کی کہ پہلے بند سے بھی پہلے ٹیپ کی ایک بیت ہانک دی۔ پہلے بند میں نواب مرزا شوقی کی مثنوی زہرِ عشق کے ایک شعر پر گرہ لگائی تھی اور دُوسرا بند غالب کے اُس مشہور قصیدے کی زمین میں تھا جس میں یہ شعر ہے

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ پاک
اِس کو کہتے ہیں عالم آرائی

28

۶ جون کو اقبال نے چیف کورٹ پنجاب کے رجسٹرار کے نام درخواست لکھی کہ اُنہیں دوبارہ کلاسیں پڑھے بغیر دسمبر میں ہونے والے قانون کے امتحان میں بیٹھنے دیا جائے (۲۰)۔

۱۴ جون کو یہ درخواست دفتر کی اگلی میز پر کھسک گئی۔ دو دن بعد اِس پر لکھا گیا ''کیا ۱۸۹۸ء کے امتحانات اب تک آخری تھے؟'' اور درخواست کھسک کر واپس پہلی میز پر آ گئی۔ پہلی میز والے نے اُسی وقت لکھا... ''نہیں، آخری دفعہ ۱۸۹۹ء میں امتحان ہوئے تھے''۔ اور اُسے دوبارہ آگے بھیج دیا۔

دو روز بعد میز نمبر دو والے صاحب نے اپنا فیصلہ لکھ دیا جس کی روشنی میں ۲۱ جون کو چیف کورٹ کے کسی ٹائپسٹ نے مسٹر محمد اقبال ایم اے کے نام جوابی خط رقم کیا اور رجسٹرار صاحب نے اپنے دستخط کر دیئے:

...I am desired by the judge to inform you that your application has been refused.

29

شہر میں جوگی کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ چنانچہ جولائی میں اقبال کو اپنے دوست کو رخصت کرنا پڑا۔ اس دفعہ سوامی تیرتھ کا ارادہ تھا کہ وہ ہمالہ کی ترائیوں میں بسیرا کریں گے۔

سوامی جی کو اپنے سفر میں قصے کہانیوں کے روائتی سادھوؤں جیسے بہت سے واقعات پیش آیا کرتے تھے۔ شری کرشن کی محبت میں کالے رنگ سے عشق تھا۔ ایک مرتبہ راستے میں کالا ناگ دیکھا تو خوش آمدید کہنے دوڑ پڑے۔ ''میرے پربھو...تو جس روپ میں بھی نظر آئے!''

ایک علاقے میں ٹھہرے تو قریب کی مسجد میں جا کر کبھی کبھی قرآن کی تلاوت کر دیا کرتے تھے۔ لوگ عرصہ تک انہیں مسلمان سمجھتے رہے۔

30

جن دنوں سوامی جی ہمالہ کے چشموں اور آبشاروں سے قدرت کے بھید پوچھ رہے تھے اقبال اپنی محنت کے حاصل کو مطبوعہ شکل میں دیکھ کر اپنی آنکھیں روشن کر رہے تھے۔ عبدالکریم الجیلی کا انسانِ کامل والا مقالہ بمبئی کے رسالے *Indian Antiquary* میں ستمبر میں شائع ہوا تھا۔ یہ اُن کا پہلا علمی اور تخلیقی کارنامہ تھا جو زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا تھا۔ اُن کی اپنی حد تک فلسفہ کی دنیا میں ایک بہت بڑا قدم!

اِس دوران اقبال واکر کی کتاب پولیٹیکل اکانومی کا ترجمہ شروع کر چکے تھے۔ مگر وہ اقبال ہی کیا جو ایک وقت میں ایک کام کر کے خوش ہو جاتا۔ چنانچہ اسٹبز کی تاریخی کتاب *Early Plantegenets* کا ترجمہ بھی جاری تھا (۲۱)۔

31

لاہور کے حلقے میں اقبال کو جن لوگوں سے ارادت تھی اُن میں سے ایک اہم نام اکثر سوانح نگاروں نے نظر انداز کیا ہے۔ یہ پیرزادہ محمد حسین عارف تھے جن کی زندگی کے بعض حالات اقبال سے اس حد تک مماثل ہیں کہ خیال آتا ہے اقبال نے ان سے خاص رہنمائی حاصل کی ہوگی۔

پیرزادہ عارف، اقبال سے اکیس سال بڑے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے پہلے ایم اے فارسی تھے اور محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے۔ اقبال کی طرح یہ بھی اورینٹل کالج لاہور کے مدرس رہے مگر شعبہ اردو کے صدر کی حیثیت میں۔ فلسفہ اور ریاضی بھی پڑھائی اور قانون دانی میں بھی دخل تھا۔ ان کی زندگی میں انقلاب اُس وقت آیا جب ۱۸۸۵ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا امتحان پاس کر کے اس معزز منصب پر فائز ہوئے۔ پھر سیشن جج ہو کر فیروز پور چلے گئے جہاں مرزا ارشد گورگانی سے اپنے شعروں میں اصلاح لینے لگے۔ غالباً مرزا ارشد ہی کے ذریعے اقبال عارف صاحب سے متعارف ہوئے ہوں گے جو اُن دنوں مثنوی مولانا روم کی حکایات کا ''عقدِ گوہر'' کے نام سے اصل بحر میں ترجمہ کر رہے تھے۔ دیگر احباب کے علاوہ اقبال سے بھی تاریخِ طباعت نکالنے کی درخواست کی۔ اقبال نے ایک اُردو اور دو فارسی قطعات ۱۳۱۸ھ بمطابق ۱۹۰۰ء کے حساب سے لکھ کر پیش کر دیے۔

اور اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گئے (۲۲)۔

32

اکتوبر ۱۹۰۰ء کی سب سے افسوسناک خبر یہ تھی کہ امیر مینائی انتقال کر گئے ہیں۔ وہ اُس وقت اپنے وطن لکھنؤ سے کوسوں دُور حیدر آباد دکن میں تھے۔

33

اقبال کے نزدیک آرنلڈ کی یہ بھی خوبی رہی ہوگی کہ جدید اُردو نظم کے مسائل کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اقبال کو مشورہ دیا کہ انگریزی نظم کی خصوصیات کو کامیابی سے اُردو میں منتقل کرنے کے لیے پہلے بچوں کی نظموں پر طبع آزمائی کی جائے (۲۳)۔

اقبال نے جو نظمیں منتخب کیں، اُن میں امریکی شاعر ایمرسن اور انگریز شاعر ولیم کوپر کے علاوہ بعض

ایسی شاعرات بھی شامل تھیں جن کی نظمیں خاص طور پر بچوں کے لیے ہوتی تھیں۔ ان کے ترجمے میں اقبال نے ظاہراً حالی کی پیروی کی۔ انہی دنوں بچوں کے لئے کچھ طبعزاد نظمیں بھی ہوگئیں۔ ان میں حالی کا اثر زیادہ نمایاں تھا۔ مثلاً اُن کا مشہور شعر ہے

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

غالباً اسی کو گنگناتے ہوئے اقبال نے بچوں کی نظم ''محنت'' شروع کی ہوگی:

وہی لوگ پاتے ہیں عزت زیادہ
جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ

اور ایک دوسری نظم ''بچوں کے لیے چند نصیحتیں'' میں حالی کا وہی شعر لفظی ردوبدل کے ساتھ شامل کردیا

دیکھنا، آپس میں پھر نفرت نہ ہو جائے کہیں
اِس قدر حد سے زیادہ بھی نہ ملت چاہئے

انگریزی نظموں کے ترجمے میں اُنہیں کامیابی ہوئی۔ میٹلڈا بیتھم کی نظم تھی 'A Child's Hymn' جس کا پہلا بند تھا:

God make my life a little light,
within the world to glow.
A little flame that burneth bright,
wherever I may go.

اقبال نے پوری نظم کا ترجمہ کیا، جو یوں شروع ہوتا تھا

لب پہ آتی ہے دُعا بَن کے تمنا میری
زِندگی شمع کی صُورت ہو خُدایا میری

34

اقبال کے بارے میں یہ تبصرہ نہایت دلچسپ ہے کہ جب ہم اقبال کو پڑھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ''اُستاد جیسے کچھ بتا رہا ہے۔ کچھ ڈانٹتا بھی جاتا ہے۔ ہم سے کچھ شکایت بھی ہے۔ کچھ محبت بھی ہے۔

شفیق اُستاد ہے، مگر اُستادوں کی طرح سے ذرا سختی بھی مزاج میں ہے کہ ہم کس طرح صحیح راستے سے بھٹک گئے ہیں لیکن ... ایک فاصلہ برقرار رہتا ہے... اقبال کے کلام میں اگر بچہ بھی ہے تو وہ کہہ رہا ہے کہ میرے دم سے دُنیا کا اندھیرا دور ہو جائے اور دُنیا میں اُجالا ہو جائے!'' (۲۴)

باب ۷

ہمالہ

۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۲ء

1

گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال کے اُستاد لالہ جیارام ایک مہینہ کی چھٹی پر چلے گئے اور قائم مقام اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ کی گنجائش نکل آئی (۱)۔ اقبال ۴ جنوری ۱۹۰۱ء کو غالباً آرنلڈ کی مہربانی سے وہاں متعین ہوگئے۔ تنخواہ دوسو روپے ماہوار!

اِس کلاس کے ایک طالبعلم چوہدری نبی احمد کا بیان ہے کہ ''مسلمان طلبہ... ہندو، سکھ اور عیسائی طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر اپنے پیغمبر کا ذکر دوسرے مذہبی رہنماؤں کے مقابلہ میں کرتے ہوئے جھجکتے تھے (۲)۔ مسلم طلبہ کی گفتگو اس موضوع پر اول تو مختصر ہوتی تھی۔ پھر اندازِ گفتگو میں مصلحت شناسی کی جھلک پائی جاتی... اقبال ہی کی بدولت مسلم طلبہ میں یہ اخلاقی جرأت پیدا ہوئی کہ وہ معذرت آمیز انداز کے بجائے کھل کر پوری جرأت سے اسلام کی جامعیت اور اپنے نبی کی عظمت بیان کرنے لگے...''

فروری میں لالہ جیارام تو واپس آ گئے مگر اقبال کے دوست شیخ عبدالقادر، جو اِسلامیہ کالج میں ایف اے کی جماعتوں کو انگریزی ادب پڑھاتے تھے، رخصت پر چلے گئے۔ اقبال واپس اورینٹل کالج

جانے کی بجائے اسلامیہ کالج آ گئے۔ حکیم شجاع الدین اسی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اُنہوں نے اقبال کا طریقہ تدریس قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ چوہدری نبی احمد نے جس اخلاقی جرات کا ذکر کیا ہے وہ طلبہ میں کیونکر پیدا ہوئی ہوگی۔

''نصاب میں *Seekers of God* کے نام سے ایک کتاب شامل تھی جس میں زمانہ قبل از مسیح کے تین حکماء کی سرگذشتیں درج تھیں۔ عیسائی مصنف نے ان متلاشیانِ حق کے بعض اقوال کا موازنہ انجیل کی آیات سے کیا لیکن (اقبال) نے کلامِ پاک کی اُن آیات سے اِن اقوال کی تشریح کی جو اُن کے ساتھ مطابقت رکھتی تھیں۔ موازنہ کے دوران آپ یہ بھی ثابت کرتے جاتے تھے کہ قرآن کی آیات ان اقوال سے بدرجہا افضل اور بہر نوع اکمل ہیں۔'' (۳)

یوں معلوم ہوتا ہے کہ مشن اسکول کے زمانے میں عیسائیت کے خلاف نفرت جو اُن کے دل میں پیدا ہوئی تھی وہ اب اظہار کی راہ پا رہی تھی۔

2

میاں شاہ دین ہمایوں نئی طرزِ شاعری کے دلداہ تھے۔ یورپ سے واپسی کے بعد سے تو وہ باقاعدگی کے ساتھ نظمیں کہنے لگے تھے اور نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ اُن کی تحریک پر احمد حسین خاں اور مدن گوپال نے ایک ''لٹریری سوسائٹی'' کی بنیاد رکھی اور انارکلی بازار کے شروع میں ایک مقام منتخب کر کے نظموں کے مشاعروں کا منصوبہ بنایا۔ پہلے مشاعرے کا عنوان تجویز ہوا، ہمالہ (۴)۔

اتفاق سے ٹھیک اُنہی دنوں سوامی رام تیرتھ ہمالہ کی گھاٹیوں میں سنیاس لے کر واپس آئے تھے (۵)۔ ہمالہ کی فضا اور قدرتی مناظر اُن کی رُوح میں سمائے ہوئے تھے۔ وہ گھنٹوں اقبال کے پاس بیٹھے ہمالہ کا نقشہ کھینچتے رہتے اور اقبال یوں محسوس کرتے جیسے وہ خود پہاڑ کے دامن میں چل پھر رہے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سوامی نے اُنہیں یہ بھی بتایا کہ بلندیوں پر پہنچ کر نیچے دیکھنے سے بادل ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ کی طرف بڑھتا نظر آتا ہے گویا اٹھکیلیاں کر رہا ہو۔

خود اقبال نے کبھی پہاڑ نہ دیکھے تھے۔ مگر سوامی کے ساتھ اُن کی دوستی ''من تو شدم و تو من شدی'' والے مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ سوامی کے پہاڑوں کی سیریوں ہی تھی جیسے اقبال خود ہمالہ کی گھاٹیوں

سے ہو آئے ہوں۔ باقی کسر پوری کرنے کے لئے اُن کا تخیل بہت کافی تھا۔

ہمالہ

اے ہمالہ ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں!
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ پہ کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے دورۂ شام و سحر کے درمیاں
تیری ہستی پر نہیں بادِ تغیر کا اثر
خندہ زن ہے تیری شوکت گردشِ ایام پر

سلسہ تیرا ہے یا بحرِ بلندی موجزن
رقص کرتی ہے مزے سے جس پہ سورج کی کرن
تیری ہر چوٹی کا دامانِ فلک میں ہے وطن
چشمہ دامن میں رہتی ہے مگر، پرتو فگن
چشمہ دامن ہے یا آئینہ سیال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لئے رُومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے
اے ہمالہ ! کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لئے
ہائے کیا جوشِ مسرّت میں اُڑا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی مانند چلا جاتا ہے ابر

تُو تو ہے مدت سے اپنی سرزمیں کا آشنا
کچھ بتا اُن رازدانانِ حقیقت کا پتا
تیری خاموشی میں ہے عہدِ سلف کا ماجرا
تیرے ہر ذرے میں ہے کوہِ المپس کی فضا
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

رازدانانِ حقیقت سے مراد بدھ مذہب کے اولین پیروکار تھے جو سوامی رام تیرتھ کی طرح ہمالہ کی گھاٹیوں میں سفر کیا کرتے تھے (۶)۔

3

مشاعرے میں احمد حسین بھی اپنی ہمالہ لائے تھے مگر اس دفعہ اقبال نے میدان مار لیا۔
اقبال کی ہمالہ میں ہر چیز متحرک تھی اور ایک نغمگی کے ساتھ زندگی کے راستے پر رواں دواں تھی۔
آسمان جھک کر ہمالہ کی پیشانی کا بوسہ لے رہا تھا۔ بادل خوشی سے جھومتا جا رہا تھا۔ رات اپنی زلفیں کھول رہی تھی۔ ندی گا رہی تھی۔ اور ان سب کی وجہ سے واقعی یہ اُمید بندھتی تھی کہ شائد اُس زمانے کی زندگی کا ماجرا سنانے کے لئے ہمالہ بھی سچ مچ بول اُٹھے یا وقت کی گردش بھی دوبارہ پیچھے کی طرف دوڑنے لگی۔

اقبال ایک مدت سے جس اسلوب کی تمنا کر رہے تھے وہ اب پوری طرح اُن کی گرفت میں تھا۔ انگریزی ترجمہ کی محنت رنگ لائی تھی۔

پوری نظم میں بارہ بند تھے جن کے درمیان موضوع کی مناسبت سے شاعر کی لے کبھی آہستہ اور کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ یہ گویا اقبال کی رُوح کی موسیقی تھی جو الفاظ میں ڈھل گئی تھی۔

4

پچاس برس سے بھی زیادہ عرصے سے ملکہ وکٹوریہ انگلستان پر حکومت کر رہی تھی اور ہندوستان والے تو اُن کے بغیر انگریز کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پچھلی صدی میں غدر کے بعد جب کمپنی کے ظلم و ستم کا بازار گرم ہوا تھا تو ملکہ وکٹوریہ ہی کے فرمانِ عالی سے رعایا نے جان و مال کی امان حاصل کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ہندوستان میں اُنہوں نے کبھی قدم رنجہ نہ فرمایا ہو مگر اب نصف صدی کا عرصہ گذر جانے کے بعد یہاں کے باسی اُنہیں اپنی ہی ملکہ تصور کرنے لگے تھے۔ جب کبھی انگریز کی کوئی زیادتی سہنی پڑتی تو دل میں موہوم سی اُمید بندھتی کہ اگر ملکہ عالیہ کو خبر ہو جائے تو...!

۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو عید الفطر تھی۔ تار کے ذریعے یہ خبر پہلے لندن سے کلکتے اور پھر پورے ہندوستان میں پھیل گئی کہ مادرِ مہربان معظمہ وکٹوریہ انتقال کر گئی ہیں۔

5

اقبال کی نسل کے نوجوان تو بچپن سے درسی کتابوں میں وکٹوریہ کا تذکرہ پڑھتے آئے تھے۔ ایک لمحے کو اُنہوں نے یہی محسوس کیا ہوگا کہ زندگی میں کہیں نہ کہیں ایک مہیب خلاء پیدا ہو گیا ہے۔

دو تین روز بعد لاہور کے ایک ماتمی جلسے میں اقبال ایک مرثیہ لکھ کر پہنچے اور حاضرین کو پڑھ کر سنایا

اے آہ آج برقِ سرِ کوہسار ہو
یا تیر بَن کے میرے کلیجے کے پار ہو
میّت اُٹھی ہے شاہ کی، تعظیم کے لئے
اقبالؔ! اُڑ کے خاکِ سرِ رہگزار ہو
آئی اِدھر نشاط، اُدھر غم بھی آ گیا

کل عید تھی تو آج مُحرّم بھی آ گیا

اِس کے بعد غالباً جلد ہی یہ مرثیہ مطبع مفیدِ عام لاہور سے ''اشکِ خوں'' کے نام سے شائع کروادیا گیا(۷)۔ ساتھ ہی مرثیہ کا انگریزی ترجمہ چھپا جو غالباً حکام بالا کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اقبال نے خود ہی کیا تھا۔ یہ کوئی ایسی عجیب بات بھی نہیں تھی کیونکہ اُن دنوں وہ انگریز سرکار کے ملازم ہی تھے اور پھر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے امتحان کے اُمیدوار بھی بننے والے تھے۔

Now, O sighs of mine, flash like lightning on the pinnacles of a mountain, or be turned into arrows and pierce my heart!

The Royal coffin is raised, O Iqbal! stand up in respect and be turned into the dust of the way!

Joy came followed by strenning sorrow! Yesterday was Id, Muharram (the month of mourning) is today!

6

فروری میں انجمن حمایت اسلام کے ۱۶ویں سالانہ اجلاس میں ڈپٹی نذیر احمد نے ایک طنزیہ نظم پڑھی جس میں اُن مولویوں کا مذاق اُڑایا گیا تھا جو مذہبی خدمت کے جوش میں بیکار ہو کر معاشرے پر بوجھ بن جاتے تھے(۸)۔

۲۴ تاریخ کو اقبال نے اپنی نظم پڑھی ''یتیم کا خطاب ہلال عید سے''!

سَیر میں اَب نہ دِل لگائیں گے
کِس کی اُنگلی پکڑ کر جائیں گے
صُبح جانا کسی کا وہ گھر سے
اور وہ رونا کہ ہم بھی جائیں گے
کھیل میں آگئی جو چوٹ کبھی
کِس کی آنکھوں سے اَب چھپائیں گے؟
کوئی ناغہ جو ہو گیا تو کسے
ساتھ مکتب میں لے کے جائیں گے؟

نظم میں کل پندرہ بند تھے اور پوری نظم ترکیب بند تھی۔ اقبال پچھلے برس کی طرح اس دفعہ بھی کاپیاں چھپوا کر ساتھ لائے تھے۔ بعض کاپیاں ۴ روپے کی بکیں۔ یتیم خانے کے لئے پھر چندہ جمع ہو گیا۔

7

مُنشی فوق سے کب نچلا بیٹھا جاتا تھا۔

۱۹۰۱ء میں انہوں نے ہفتہ وار اخبار نکالنے کی ٹھانی (۹)۔ ''پنجۂ فولاد'' نام تجویز ہوا اور مرزا داغ سے قطعۂ تاریخ لکھوایا گیا۔ اقبال نے بھی طبع آزمائی کی اور ۲۴ اشعار کا تعارف لکھا جس میں اخبار کے مستقل کالموں بزمِ فوق، ضامنِ صحت، تجارت، مذاقِ سخن، مشاہیر، لطائف، سیٹلمنٹ آفس کا ذکر کرنے اور اخبار کا سالانہ چندہ ''تین رائج سکے قیمت سال کی'' بتانے کے بعد یہ بھی بتایا تھا کہ ''اِس بانکے پرچے کا مدیر'' کون ہے

نام ہے اُس کا محمد دین فوق
عُمر چھوٹی ہے مگر ہُشیار ہے

''ہمالہ'' کے شاعر کو ایسا مبتذل اور ناقص قطعہ لکھنا کسی طرح زیب نہیں دیتا تھا، مگر شائد وہ فوق کا دل توڑنا نہیں چاہتے تھے۔

8

بیسیوں صدی کا آغاز ہندوستان میں پرنٹنگ پریس کی مقبولیت کے آغاز کا زمانہ تھا۔ ہر دُوسرے دن ایک نیا اخبار یا رسالہ وجود میں آتا تھا اور کچھ عرصہ جاری رہ کر اپنے بانی کے شوق کی طرح ختم ہو جاتا تھا۔

اقبال کے دوست شیخ عبدالقادر، جو اسلامیہ کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے، ایک بلند پایہ انگریزی اخبار ''آبزرور'' کے چیف ایڈیٹر تھے۔ بازارِ حکیماں کے مشاعروں اور لٹریری سوسائٹی کی محفلوں میں اقبال کے ساتھ ساتھ ہوا کرتے تھے مگر خود شاعری نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۰۱ء کی پہلی سہ ماہی میں انہیں بھی ادبی رسالہ نکالنے کا خیال آیا۔ رسالے کا نام تجویز ہوا ''مخزن''۔ اقبال نے بھی نظم دینے کا وعدہ کیا مگر اپنی مشہور کاہلی کے باعث ٹالتے رہے یہاں تک کہ آخر ایک دن عبدالقادر نے اُن کی ہمالہ کا مسودہ اُٹھا لیا اور اقبال

کے احتجاج کے باوجود کہ نظم ابھی قابلِ اصلاح ہے اُسے لے جا کر کاتب کے حوالے کر دیا (۱۰)۔

مخزن اپریل میں شائع ہوا۔ سرورق پر ہندوستان کا نقشہ تھا جس میں تین مختلف نشانات سے ان مقامات کی شناخت کی گئی تھی جنہیں اُردو کا گہوارہ بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مخزن کے اس شمارے میں نظم ہمالہ موجود تھی (۱۱)۔

اگلے مہینے اقبال کی ایک اور نظم ''گلِ رنگیں'' شائع ہوئی جس میں ادب کا وہ رُومانوی نقطہ نظر پیش کیا گیا تھا جو اُس زمانے میں اقبال کا مسلک بھی تھا اور مخزن کے نئے لکھنے والے ادیبوں سجاد حیدر یلدرم، ابوالکلام آزاد، خوشی محمد ناظر، مہدی افادی، حسن نظامی اور حسرت موہانی وغیرہ کا بھی

کام مُجھ کو دیدۂ حِکمت کے اُلجھاوٴں سے کیا
دِیدۂ بُلبُل سے مَیں کرتا ہُوں نظارہ ترا

مخزن اُس افادیت پسند ادب کا ردِّعمل تھا جسے حالی، نذیر احمد اور سر سید احمد خاں کی مصلحت آمیزی نے جنم دیا تھا۔ یہ اُردو ادب کے اُس دور کا آغاز تھا جو شائد مولانا شبلی کے ہاتھوں بہت جلد شروع ہو گیا ہوتا اگر اُنہوں نے اپنے تخیل کو تاریخ کے میدان کی طرح ادب کے بوستان میں بھی آزاد پھرنے دیا ہوتا۔

اُردو ادب کا رُومانوی دَور مخزن کے ساتھ شروع ہوا تھا اور اقبال اس کے سب سے بلند آواز نقیب تھے۔ عبدالقادر حیدرآباد دکن گئے تو اُنہوں نے خود داغ دہلوی کو اِس بات پر فخر کرتے سنا کہ یہ نوجوان شاعر جس کا ہر طرف چرچا ہے کبھی اُن سے اِصلاح لے چکا ہے۔

9

یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں جب بازارِ حسن میں بڑے شاعروں کا کلام گایا جاتا تھا ۱۹۰۱ء کے عرصے تک اقبال کی غزلیں بھی طوائفوں میں مقبول ہو چکی ہوں گی۔ اقبال گانا سننے تو پہلے ہی جایا کرتے تھے مگر اب ممکن ہے بعض گانے والیاں خود اُن کی تشریف آوری کو اہمیت دیتی ہوں۔ بہرحال حقیقت ہے کہ جوانی کے ایک دور میں اُنہیں بازارِ حسن کے معاملات میں سند مانا جاتا تھا اور بے تکلف دوست اُن سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

''جس زمانے میں مَیں زندہ تھا،'' اقبال لکھتے ہیں۔ ''یا یوں کہیے کہ زندہ دل تھا۔ تو تجربے نے یہ اُصول سکھایا کہ جس معشوق سے زیادہ محبت ہو اُس سے اصولاً زیادہ بے اعتنائی کرنی چاہیے... یار لوگوں

نے فرمائش کی... کہ ہر اُصول پر ایک مفصل رسالہ لکھنا چاہیئے کہ تماش بینوں کے لئے رہنمائی کا کام دے۔ سو بندے نے ایک رسالہ موسوم بہ اَجر السکُوت تحریر کیا... جس میں سکوت کے ایسے ایسے دلائل پیش کئے... کہ فریدالدین عطارؔ بھی اگر اِس رِسالے کو پڑھتے تو اپنے فضائل خاموشی کو فراموش کر جاتے۔ وہ سینہ بہ سینہ شائع ہوتا تھا۔''

غزل

نہ آتے ہمیں اِس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہُوئے عار کیا تھی

تامّل تو تھا اُن کو آنے میں قاصِد
مگر یہ بتا طرزِ اِنکار کیا تھی

کھنچے خُود بخُود جانبِ طور مُوسیٰ
کشِش تیری اَے شَوقِ دِیدار کیا تھی

نہ چھوڑا کبھی بے وفائی نے تم کو
بری طرح یہ بھی وفادار، کیا تھی؟

کہیں ذِکر رہتا ہے اقبالؔ! تیرا
فُسُوں تھا کوئی تیری گُفتار کیا تھی

مخزن، جون ۱۹۰۱ء

10

غزل

محبت کو دَولت بڑی جانتے ہیں
اِسے مَایۂ زِندگی جانتے ہیں

نِرالے ہیں انداز دُنیا سے اپنے
کہ تقلید کو خُودکُشی جانتے ہیں

مخزن، جولائی ۱۹۰۱ء

11

عہدِ طفلی

تھے دیارِ نَو زمین و آسماں میرے لئے
وُسعتِ آغوشِ مادَر، اِک جہاں میرے لئے
تھی ہَر اِک جُنبش نشانِ لُطفِ جاں میرے لئے
حَالِ از مَفہُوم، خُود میری زباں میرے لئے
دَرد اِس عَالَم میں جَب کوئی رُلاتا تھا مُجھے
شورشِ زنجیرِ دَر میں لُطف آتا تھا مُجھے

تکتے رہنا ہَائے وہ پہروں تلک سُوئے قَمر
وہ پھٹے بادَل میں بے آوازِ پا اُس کا سَفر
پُوچھنا رہ رہ کے اُس کے کوہ وصحرا کی خَبر
اور وہ حَیرت دَروغِ مَصلحت آمیز پَر
آنکھ وقفِ دِید تھی، لَب مائلِ گُفتار تھا
دل مِرا جامِ شرابِ ذوقِ اِستفسَار تھا

مخزن، جولائی ۱۹۰۱ء

12

خالی شہرت زندہ رہنے کے لئے کافی نہ تھی۔ جولائی میں وہ ایک دفعہ پھر اورینٹل کالج منتقل ہوئے تھے جس کی تنخواہ وہی بہتر روپے چودہ آنے تھی۔ البتہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا امتحان کوئی دو مہینے بعد ہونے والا تھا اور اقبال کو اُمید تھی کہ جس ذہانت نے اُنہیں شہرت بخشی ہے وہی اُن کے باقی مسائل بھی حل کرے گی۔

13

معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ امتحان کی تیاری کر رہے تھے کیونکہ اگست کے مخزن میں اُن کی کوئی نظم شائع نہیں ہوئی۔ مگر وہ ذہن جس کے متعدد خانوں میں بیک وقت کئی موضوعات پلتے تھے امتحان کی فکر کے ساتھ ساتھ اپنے ادبی نصب العین پر غور کر رہا تھا۔

اگست کے قریب وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ شاعری کا مقام معاشرے میں وہی ہے جو ہمالیہ کی خاموش فضاؤں میں اس کے دامن میں بہتے ہوئے جھرنے کا ہے (۱۳)۔ شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ ان تصورات کو آواز کا جادو عطا کر دے جن تک دوسرے لوگوں کی پہنچ نہیں ہوتی۔

شاعری کے اس نصب العین کی سب سے بڑی مثال مغرب میں گوئٹے اور مشرق میں مرزا غالب تھے۔ ایک عرصے سے اقبال کی تقریباً ہر لمبی نظم میں کوئی نہ کوئی ٹکڑا یا مصرعہ غالبؔ سے ماخوذ چلا آ رہا تھا۔ مگر اقبال کی غالب پرستی یہیں تک محدود نہیں تھی۔ آم کھانا، مولویوں کو تنگ کرنا، ہندوؤں سے دوستی کرنا، اپنی بے نمازی کی تشہیر کرنا اور کبھی کبھی تھوڑا سا کُفر بکنا... غالب کی یہ ساری عادتیں اقبال میں موجود تھیں۔ شراب نوشی کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر صوفی تبسم وغیرہ کا یہ خیال درست ہے کہ جوانی میں چکھ کر بعد میں ترک کر دی تھی تو پھر ہو سکتا ہے کہ اُس چکھنے کی وجہ بھی غالب کی پیروی رہی ہو۔ عبدالقادر تو یہاں تک کہنے پر مجبور ہو گئے۔ ''اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خان غالبؔ (کی روح) نے دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا''۔

14

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مُرغِ تصوّر کی رسائی تا کجا
رُوح تھا تُو، اور تھی بزمِ سُخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے
صُورتِ رُوحِ رواں ہر شے میں جو مستُور ہے

لُطفِ گویائی میں تیری ہَمسری مُمکن نہیں
ہو تصوّر کا نہ جب تک فِکرِ کامِل ہم نشیں
ہائے اَب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سَرزمیں؟
آہ، اے نظارہ آموزِ نِگاہِ نکتہ بیں
گیسُوئے اُردُو ابھی مِنّت پذیرِ شانہ ہے
شَمع یہ جوِیندۂ دِلسوزیٔ پَروانہ ہے

مخزن، ستمبر ۱۹۰۱ء

15

ان دنوں اقبال ہر وقت کسی ایسی بات کی تلاش میں رہتے تھے جو شعر کہنے کا بہانہ بن سکے اور ان کے دوست اس سے آگاہ تھے۔ فرمائشیں ہوتی رہتی تھیں اور وہ انہیں پورا کرتے رہتے تھے۔ کسی کی فرمائش پر آٹھ دس منٹ میں ایک چھوٹی سی نظم کہہ دی۔ فرمائش نجانے کیا تھی مگر نظم میں سوائے جنس زدہ ہونے کے اور کوئی خاص بات نہ تھی۔

ہم نچوڑیں گے دامن

سراپا ہوا مثلِ آغوشِ دریا
نہانے کو اترا جو وہ رشکِ گلشن
اسیرِ خمِ زلف کیونکر نہ ہو خضر
یہ قامت، یہ عارض، یہ سینہ، یہ جوبن
ادھر سر حبابوں نے ساحل سے پٹکے
نہا کر جو نکلا وہ، دریا سے، پُرفن
جو دستِ حنائی سے دامن نچوڑا
کہا مَیں نے ''اے روکشِ شمعِ روشن!

بُری چشمِ گریاں کی تجھ کو قسم ہے
صنم چھوڑ دے، ہم نچوڑیں گے دامن"

کشمیری گزٹ، ستمبر ۱۹۰۱ء

16

پیرزادہ عارف صاحب کی مثنوی "عقدِ گوہر" پچھلے برس شائع نہ ہو سکی تھی۔ اقبال نے اُنہیں تین نئے قطعاتِ تاریخ اُردو میں لکھ کر دیے۔ ایک سے ۱۹۰۱ء اور باقی دونوں سے ۱۳۱۸ھ برآمد ہوتا ہے۔

اِس برس کتاب چھپ گئی۔ دیگر قطعات تاریخ کے ساتھ اقبال کے تمام چھ قطعات شامل تھے

رُوحِ فردَوس میں رُومی کی دُعا دیتی ہے
آپ نے خُوب کِیا، خُوب کہا، خُوب لِکھا
دَردمندانِ مُحَبت نے اِسے پڑھ کے کہا
نقش تسخیرِ پئے طَالِب و مطلُوب لکھا
ہَاتفِ غَیب کی اِمدَاد سے ہَم نے اِقبالؔ
بہرِ تاریخِ اِشاعَت "سُخَنِ خُوب" لکھا

۱۳۱۸ھ

17

ستمبر میں کالج کی تعطیلات تھیں یا اقبال خود ہی چھٹیاں لے کر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان کی تیاری کرنے سیالکوٹ چلے گئے۔

ان کے کالج کے دوست فضل حسین بیرسٹر بن چکے تھے اور ان دنوں کسی مقدمے کے سلسلے میں سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ نیرنگ جو پچھلے سال انبالے میں وکالت شروع کر چکے تھے اقبال سے ملنے سیالکوٹ آ گئے۔ ان دونوں کی موجودگی نے اقبال کو اور زیادہ احساس دلایا ہوگا کہ اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود وہ عملی زندگی میں سست قدم ہوئے جا رہے ہیں اور اب بہت جلد انہیں اپنی ترقی کے لئے کوئی بڑا قدم اٹھانا چاہئیے۔ اسسٹنٹ کمشنری کا امتحان ایک ایسا بڑا قدم ہو سکتا تھا۔

سیالکوٹ میں پھر کالج کے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ اقبال نے آفتاب اور اعجاز کو بلایا اور نیرنگ سے تعارف کرواتے ہوئے آفتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایہہ آفتاب وانگوں سحر خیز اے!'' نیرنگ کو اُس روز یقین آیا کہ اقبال واقعی صاحب اولاد ہیں۔ انہوں نے آفتاب سے کہا۔ ''بھئی یہ تمہارا باپ ایسا ہی گپی ہے...''

ایک روز اقبال اور فضل حسین ایک گلاس میں کوئی سرخ رنگ کی چیز پی رہے تھے۔ نیرنگ کو دیکھ کر انہیں بھی دعوت دی کہ وہ شامل ہو جائیں۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ شراب ہے لہٰذا نیرنگ بڑی دیر تک بچتے رہے۔ آخر دونوں ہنس پڑے اور انہیں بتایا کہ ائریٹڈ واٹر میں سرخ رنگ کا شربت ملا ہوا ہے۔

18

ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے امتحانات شائد ستمبر میں منعقد ہوئے۔ امتحان سے ایک روز قبل اُمیدواروں کا طبی معائنہ ہوا۔ اِس میں اقبال کی دائیں آنکھ میں بینائی نہ ہونے کا معاملہ سامنے آیا اور اُنہیں طبی بنیادوں پر امتحان کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا (۱۴)۔

پیسہ اخبار نے احتجاجی نوٹ لکھا کہ اقبال کی صحت تو قابل رشک ہے۔ بین السطور میں شکائت ظاہر ہو رہی تھی کہ مسلمان اُمیدوار کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔

فوق زیادہ دُور کی کوڑی لائے۔ کشمیری گزٹ کے اکتوبر کے شمارے میں ''مسلمان اُمیدوار'' کے حوالے سے سرخی باندھی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اُمیدوار کا طبی امتحان کم از کم اتنا عرصہ قبل ہوا کرے جب اُمیدواروں نے امتحان کی تیاری بھی شروع نہ کی ہو (۱۵)۔

غالباً اِس امتحان میں ناکامی کے بعد ہی اسٹراٹن صاحب نے اُنہیں مشورہ دیا ہوگا کہ امریکہ یا کینیڈا کے کسی ادارے سے کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کریں (۱۶)۔ اقبال نے یہ بات بہت سنجیدگی سے سنی اور غالباً اُسی زمانے سے سفر کے لئے پیسے بچانے شروع کر دیے۔

19

سوامی بیرونِ ملک تبلیغ کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ اُنہوں نے اقبال سے کہا ہوگا۔ ''ویدانت کی

رُوح بس اتنی سی بات میں ہے کہ کسی مصیبت کو اپنے اُوپر طاری نہ ہونے دو۔ اپنے میں خدا کی موجودگی کے احساس سے ہمیشہ خوش اور پر سکون رہو!'' (۱۷)

20

میاں شاہ دین ہمایوں کشمیر گئے ہوئے تھے (۱۸)۔ اکتوبر کے مخزن میں اُن کی نظم شائع ہوئی جس کا موضوع اُن کی اکثر نظموں کی طرح کشمیر تھا

اعجاز دیکھ تو سہی یاں کیا سماں ہے آج
نیرنگ آسمان و زمیں کا نیا ہے آج
اقبالؔ تیری سحر بیانی کہاں ہے آج
ناظرؔ کمانِ فکر سے مار ایک دو خدنگ

21

غزل

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لئے
بجلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کے لئے
اِس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے
قِصہ خواں نے کیوں سُنا دی داستاں مُجھ کو مری
رہ گیا تھا مَیں ہی کیا اپنے فسانے کے لئے؟
پاس تھا ناکامیٔ صیاد کا اے ہم صفیر!
ورنہ مَیں اور اُڑ کے آتا ایک دانے کے لئے
ترک کر دی تھی غزل خوانی، مگر اقبالؔ نے
یہ غزل لکھی ہُمایوںؔ کو سُنانے کے لئے

مخزن، نومبر ۱۹۰۱ء

پوری غزل پر طبیعت کی بیزاری اور افسردگی کا رنگ نمایاں ہے جو غالباً اسسٹنٹ کمشنری والے امتحان میں ناکامی کا اثر رہا ہوگا۔ آخری مصرع سے ذہن غالبؔ کی طرف جاتا ہے

مجھ کو غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیدادگرِ رنج فزا اور سہی

نومبر میں 'ابرِ کہسار' مخزن میں شائع ہوئی جو ایک طرح سے ہمالہ کے تسلسل کی نظم تھی۔

22

اُسی برس حالیؔ نے سرسید کی سوانح ''حیاتِ جاوید'' شائع کروائی۔ اِس کے آخر میں مولوی میر حسن اور اقبال کی نکالی ہوئی سرسید کی وفات کی تاریخیں خاص طور پر درج تھیں مگر ان دونوں کے نام نہیں لکھے گئے تھے۔ میر حسن نے حالیؔ کو لکھ دیا کہ براہِ کرم آئندہ ایڈیشن میں نام بھی شامل کردیے جائیں (۱۹)۔

دسمبر میں مخزن میں ایک بالکل نئے لب ولہجہ کی غزل شائع ہوئی جس نے نوجوان شاعر کو اچانک مشہور کردیا۔ شاعر کا نام حسرتؔ موہانی تھا اور غزل کا مطلع تھا

بھلاتا لاکھ ہُوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ اُلفت پہ وہ کیونکر یاد آتے ہیں

23

اُس سال کسی وقت اقبال کو بچوں کی نفسیات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اُن کی زندگی کے اس پہلو کے متعلق ہماری معلومات محدود ہیں لہٰذا واقعات کی صحیح ترتیب کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے بہرحال یہ کہا جاسکتا ہے کہ ورڈز ورتھ سے اقبال کو دلچسپی تھی اور ورڈز ورتھ نے بچپن کی نفسیات کو خاص اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اقبال کی ایک نظم ''عہدِ طفلی'' بھی مخزن (جولائی ۱۹۰۱ء) میں شائع ہوئی تھی۔

۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء میں محکمہ تعلیم پنجاب کی جانب سے اُردو کی پانچویں کتاب کا نیا ایڈیشن تیار ہوا تو اورینٹل کالج سے وابستگی، آرنلڈ کی سفارش یا خود اُن کی ذاتی شہرت کی وجہ سے اُن کی دو نظمیں شامل کی گئیں۔ یہ ''ایک مکڑا اور مکھی'' اور ''ہمدردی'' تھیں۔ ۱۹۰۱ء میں ہی کسی وقت اقبال نے بچوں کی نفسیات پر

مغربی ماہرینِ تعلیم کی تحریریں پڑھیں اور اپنی معلومات کو مخزن کے حصہ نثر کے لئے قلمبند کیا۔ اُن کے نزدیک ''تمام قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے۔ اگر طریق تعلیم علمی اُصولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے عرصہ میں تمام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں''۔

اقبال نے اپنے مضمون میں گیارہ اُمور کی فہرست بنائی تھی جو 'عالم طفلی کے ساتھ مختص ہیں':

۱۔ بچوں میں اضطراری حرکت کا میلان ہوتا ہے۔

۲۔ اس عمر میں کسی شے پر مسلسل توجہ نہیں ہو سکتی۔

۳۔ بچوں کو اشیا کو غور سے دیکھنے اور بالخصوص ان کے چھونے میں لطف آتا ہے۔

۴۔ بچے کی توجہ صورت سے زیادہ رنگ کی طرف جاتی ہے۔

۵۔ بچے میں بڑوں کی مدد کرنے کا مادہ خصوصیت سے زیادہ ہوتا ہے۔

۶۔ قوت متخیلہ یا واہمہ بھی بچوں میں بڑی نمایاں ہوتی ہے۔ کہانی میں وہ اسی لئے دلچسپی لیتے ہیں۔

۷۔ بچے میں ہمدردی کی علامات بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ کسی کو ہنستا دیکھے تو خود بھی ہنستا ہے۔ ماں باپ غمگین نظر آئیں تو خود بھی ویسی ہی صورت بنالیتا ہے۔

۸۔ الفاظ یاد رکھنے کے لئے بچہ کا حافظہ حیرت ناک ہے۔

۹۔ اشیا میں فرق کرنے کی قوت کمزور ہوتی ہے۔

۱۰۔ قوائے عقلیہ مثلاً تصدیق definition اور استدلال کمزور ہوتے ہیں۔ یہ تجربے اور علم کے ساتھ بڑھتے ہیں... بچے سے ایسی فہمید کی توقع نہ رکھو جو ابھی تجربے اور علم سے بڑھنی ہے۔ ایک برس کے بچے کو کیا علم کہ 'حُبِ وطن' کس جانور کا نام ہے۔ ہمارے بعض معلم بچہ کے ہاتھوں میں ایسی ابتدائی کتابیں رکھ دیتے ہیں جن کا پہلا باب مثلاً خدا کی صفات سے شروع ہوتا ہے۔ مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ خدا ایک ایسا مجرد تصور ہے جو قوائے عقلیہ کی حدِ کمال پر پہنچنے اور بہت سا علم حاصل کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اور صفاتِ شئے کا اُس شئے سے علیحدہ تصور کرنا ایک ایسا فعل ہے جو بچے سے کسی صورت میں ممکن ہی نہیں ہے۔ لہذا اس قسم کا علم دینا ممکن ہے کہ بعض وجوہ سے اچھا ہو مگر علمی اصولوں کی رُو سے بچے کے حافظہ پر ایک بے جا اور غیر مفید بوجھ ڈالنے سے زیادہ نہیں۔

۱۱۔ اخلاقی محرکات سے بچہ یا تو متاثر ہی نہیں ہوتا یا اگر ہوتا ہے تو بہت کم۔ اخلاقی ذمہ داری کا احساس

اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اس مضمون کا پُر اُمید لب ولہجہ قابل غور ہے۔ گویا اقبال بچے کو نہایت مفید قوتوں کا مجموعہ تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ذرا سی احتیاط ان قوتوں کو انسانیت کی بھلائی کی راہ پر گامزن کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اُن کا یہ حسنِ ظن بھی خوب ہے کہ ''تمام قومی عروج کی جڑ'' کوئی ایک چیز ہو سکتی ہے جس پر توجہ کرنے سے ''تھوڑے ہی عرصہ میں تمام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں''۔ اس طرح کے حقیقت سے بعید محاورات کا استعمال اُن کے ذہن کے کسی گوشے میں چھپے ہوئے اِس خیال کی نشان دہی کرتا ہے کہ پوری دنیا کا ایک دل کش خواب کی طرح حسین ہو جانا ممکن تھا۔

''بچوں کی تعلیم و تربیت'' مخزن (جنوری ۱۹۰۲ء) میں شائع ہوا (۲۱)۔

24

میاہ شاہ دین کی لٹریری سوسائٹی اور عبد القادر کے مخزن کا اقبال پر یہ احسان ہے کہ اُن کی نظموں کو انجمن حمایتِ اسلام کی چندے کی اپیلوں سے نکال کر ایک وسیع دائرے میں لے آئے۔ باقی سب تو ایک طرف رہے خود لکھنو والے بھی اِس نئے انداز پر توجہ دینے پر مائل ہو گئے۔

25

شمع و پروانہ

اس نمبر میں ہم شمع و پروانہ کے عنوان سے مسٹر محمد اقبال ایم اے، پروفیسر گورنمنٹ کالج کی ایک نو تصنیف نظم شائع کرتے ہیں۔ جو پروفیسر صاحب نے ہمارے اِصرار پر نہایت ہی عجلت میں تصنیف فرمائی ہے تاہم اِن اشعار سے اُن کے فن و زباں دانی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

پَروانہ تُجھ کو کرتا ہے اے شمؔع پیار کیوں؟
کرتا ہے اپنی جان کو تُجھ پر نِثار کیوں؟
کُچھ اِس میں جوشِ عاشقِ حُسنِ قدیم ہے
چھوٹا سا طُور تُو، یہ ذرا سا کلیم ہے
تھوڑی سی رَوشنی پہ فِدا ہو رَہا ہے یہ

اِک نُور ہے کہ جس میں فنا ہو رہا ہے یہ
پَروانہ کیا ہے، اِک دلِ ایذا طلب ہے یہ
عَینِ وصال و سوزِ جُدائی، غضب ہے یہ

خدنگِ نظر (لکھنؤ)، جنوری ۱۹۰۲ء

26

خُفتگانِ خاک سے اِستفسار

باغِ جنت ہے وہ یا اِک منزلِ آرام ہے؟
یا رُخِ بے پردۂ حُسنِ ازل کا نام ہے؟
آہ! وہ کشوَر بھی تاریکی سے کیا معمُور ہے؟
یا محبت کی تجلّی سے سراپا نُور ہے؟
تُم بتا دو راز جو اِس گُنبدِ گرداں میں ہے
مَوت اِک چبھتا ہُوا کانٹا دلِ اِنساں میں ہے

مخزن، فروری ۱۹۰۲ء

27

مرزا غلام احمد نے حکم دیا کہ کوئی احمدی کسی غیر احمدی کے جنازے میں شریک نہ ہو۔
شیخ نور محمد کی لڑکی طالع بی ۱۹۰۲ء میں فوت ہوئیں۔ اُن کے تمام احمدی دوستوں نے جنازے میں شرکت سے معذرت کر لی بلکہ نور محمد سے بھی توقع کی گئی کہ وہ بیٹی کے جنازے میں شامل نہ ہوں۔ اُس روایت کے مطابق جس کے تحت نور محمد بھی احمدی جماعت سے منسلک ہوئے تھے اُنہوں نے اس موقع پر جماعت سے تعلق ختم کر لیا اور حامد شاہ کے ذریعے کہلوا بھیجا۔ ''میں عمر رسیدہ ہوں۔ آپ کے ساتھ اس قدر تیز نہیں چل سکتا۔'' (۲۲)

جنازے کے مسئلے نے اُن خاندانوں میں کشمکش پیدا کر دی تھی جن کے بعض افراد احمدی اور بعض غیر احمدی تھے۔ انہی میں سے میر حسام الدین کا خاندان بھی تھا۔ اُن کے بیٹے میر حامد شاہ احمدیت کے

پرجوش مبلغ تھے مگر اپنے والد کے چچازاد بھائی میر حسن سے محبت بھی کرتے تھے۔ ایک دن مسجد میں بیٹھے تھے کہ کسی نے پوچھ لیا۔ ''کیا اپنے چچا کے جنازے میں بھی نہیں جاؤ گے؟'' وہیں جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے ہاتھ اُٹھائے اور کہا۔ ''خدا مجھے اُن سے پہلے اُٹھا لے!''

معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بہن کے جنازے میں شریک ہونے سیالکوٹ آئے تو میر حامد شاہ نے اُنہیں بھی بیعت کی دعوت دی (۲۳)۔ وہ ایک طرح سے اقبال کے اُستاد تھے لہٰذا کچھ اپنی بزرگی کا رعب ڈالتے ہوئے اقبال کی فکری بے راہ روی پر تنقید بھی کی ہوگی کہ کبھی صوفی نظر آتے ہیں، کبھی شیعہ، کبھی سنی اور کبھی مذہب کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں جو کسی نے کبھی نہ کہی ہوں۔ نہیں معلوم اقبال نے وہاں کیا جواب دیا اور میر حامد شاہ کے سامنے کس حد تک کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔ لیکن جب واپس لوٹے تو وہ احمدیت کے بارے میں بہت واضح فیصلہ کر چکے تھے اور اگلے دو تین مہینوں میں کم از کم دو نظموں میں اپنی رائے کا اظہار بھی کر دیا۔

باقی تمام باتیں ایک طرف، مگر محمدِ عربیؐ کے بعد کسی دوسرے شخص کو کسی بھی مفہوم میں نبی تصور کرنا اقبال کے بس سے باہر تھا۔ جس طرح وہ خدا کے ساتھ کسی کی عبادت کرنا شرک جانتے تھے، اُسی طرح محمدؐ بن عبداللہ کے بعد کسی دوسرے کو پیغمبر بنانا بھی شرک سمجھتے تھے۔

28

انجمن حمایت اسلام کا سترہواں اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ اقبال نے ایک نظم لکھی جس میں خود اسلامیہ کالج پنجاب کے مسلمانوں سے مخاطب ہو رہا تھا۔ گویا تعمیر اپنے معمار سے اور نقش اپنے مصور سے خطاب کر رہے تھے۔ اسلامیہ کالج کی زبانی وہ مسلمانوں سے پوچھ رہے تھے کہ کیا وہ اپنے بچوں کو سعدی بنانا چاہتے ہیں؟ کیا وہ اپنے شہروں کو غرناطہ اور بغداد بنانا چاہتے ہیں؟ کیا وہ اندلس و ہند کے فاتحین کی یاد تازہ کرنا چاہتے ہیں؟ اگر چاہتے ہیں تو پھر اُنہیں اپنے اسلاف کی طرح غنی اور سخی بننا ہوگا اور اسلامیہ کالج کو چندہ دینا ہوگا۔

اسلاف کی عظمت کا اقبال کی شاعری میں یہ پہلا تذکرہ اگرچہ اُس معیار کے مطابق نہ تھا جہاں وہ ہمالہ میں پہنچ چکے تھے یا جو آئندہ ایسی نظموں میں اُنہوں نے حاصل کیا۔ مگر شبلی کی ثقافتی تحریک کا، جس سے اقبال اُس وقت تک ضرور متعارف اور متاثر ہو چکے ہوں گے، یہ اُن کی شاعری میں پہلا واضح اظہار تھا۔

ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی نظم کے آخر میں رسولِ مقبولؐ کی نعت تھی مگر فارسی میں۔ دُوسری باتوں کے علاوہ اِس میں ختمِ نبوت کے عقیدے سے وابستگی کا اظہار بھی کیا گیا تھا

اے کہ بعد از تُو نبوّت شُد بہ ہر مفہوم شِرک

بَزم را رَوشن زنورِ شمعِ عِرفاں کردۂ

حسبِ معمول یہ نظم بھی ترکیب بند تھی۔ اِس میں 9 بند تھے۔

29

غالباً فروری کی بات ہے۔ ٹکسالی دروازے میں کسی دینی مدرسے کا طالبعلم ایک بوسیدہ کتاب دکھا دکھا کر لوگوں سے اسلام کے نام پر اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے خیرات مانگ رہا تھا۔ بھاٹی دروازے کی جانب سے شلوار قمیض اور کوٹ میں ملبوس ایک صحت مند راہگیر کو آتے دیکھ کر وہ اُس کی طرف بڑھا۔ اُس کی بدقسمتی کہ یہ راہگیر اقبال تھے۔ وہیں کھڑے کھڑے اُنہوں نے ایک تقریر جھاڑ دی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جو مذہب دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا کر زندگی گزارنا سکھائے اُس کی محبت سے مجھے کوئی کام نہیں۔ طالبعلم دل میں نیچری نیچری پکارتا وہاں سے غائب ہو گیا اور اقبال یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ مذہب کے غلط تصور سے نہ جانے کب لوگوں کو آزادی ملے گی۔

چند روز بعد ایک شام دہلی دروازے کی طرف جاتے ہوئے یہ خود ہی کسی ایسے مولانا سے ٹکرا گئے جو انگریزی کے خلاف وعظ کر رہے تھے۔ اقبال یہاں بھی کچھ بول اُٹھے اور شائد ایک آدھ چلتا ہوا فقرہ بھی کس دیا۔ نتیجے کے طور پر مولوی کے منہ سے جھاگ بہنے لگا اور یہ کافر قرار پائے۔

ان باتوں نے اقبال کو اتنا جوش دلایا کہ اُنہوں نے دونوں واقعات نظم کر کے مولویوں کی ہجو لکھ ڈالی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس نظم میں جس کا نام ''دین و دنیا'' تھا دل کا غبار نکالنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ پوری نظم کا معیار اتنا پست تھا جسکی توقع اُن سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ مگر جو اقبال کے دل میں آجائے!

انجمن حمایت اسلام کے اگلے جلسے میں تمام مولویوں سے اپنا حساب برابر کرنے کی ٹھانی تھی

اِن سے پوچھو، ہند ہی کیا رہ گیا ہے آپ کو

اور بھی تو دیس ہیں آخر جہاں آرام ہے

باندھیے بستر کہ اِن وعظوں کی خاطر سامنے
اِنڈیمن ہے، چین ہے، جاپان ہے، آسام ہے

منشی محبوب عالم نے نظم دیکھی تو پرانی دوستی کے باوجود اسے چھاپنے سے معذرت کرلی۔ غالباً نالۂ یتیم کے وقت سے یہ پہلا موقعہ تھا کہ انجمن کے اجلاس کے لئے اقبال کی نظم پیسہ اخبار کے پریس میں نہیں چھپ رہی تھی۔

آخر صدیقی پریس کے محی الدین نے یہ نظم شائع کی جو اقبال کے کالج کے زمانے کے دوست تھے اور دینی کتابوں کی اشاعت کرتے تھے۔ مگر اب اس میں ایک شعر منشی محبوب عالم کی ہجو کا بھی شامل ہوگیا تھا

آج کل لوگوں میں ہے اِنکار کی عادت بہت
نام محبوبانِ عالَم کا یُونہی بدنام ہے

اِس کے علاوہ درجن بھر اشعار محی الدین کی تعریف کے شامل ہوئے جو غالباً پریس میں بیٹھے بیٹھے سپردِ قلم ہوئے ہوں گے۔

پوری نظم ڈپٹی نذیر احمد کی پچھلے برس والی نظم کی قافیے میں تھی۔

30

انجمن حمایتِ اسلام کا سترہواں سالانہ اجلاس جمعہ ۲۱ فروری کو شروع ہوا۔ اُس روز دو نشستیں ہوئیں۔ اگلے روز دن کے جلسے کی صدارت خان بہادر علی خاں ریٹائرڈ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نے کی جبکہ لفٹنٹ گورنر اور ڈائرکٹر تعلیم مہمانانِ خصوصی تھے۔ اقبال نے آخری دونوں صاحبان کی خدمت میں ۲۲ اشعار کا ''خیر مقدم'' کا قصیدہ پڑھا جو ذوق کے اُس قصیدے کی زمین میں تھا جس کا پہلا مصرعہ ہے: زہے نشاط اگر کیجئے...

زہے نشاطِ فراواں کہ اخترِ تقدیر
چمک رہا ہے اُبھر کر مثالِ مِہرِ مُنیر
خوشا نصیب وہ گوہر ہے آج زینتِ بزم

کہ جس کی شان سے ہے آبروئے تاج و سریر

۲۲ فروری کی رات کو پانچویں نشست میں اقبال نے ''دین و دنیا'' اپنے مخصوص ترنم میں پڑھ کر سنائی۔ تیر نشانے پر بیٹھا اور پرانے خیال کے لوگ ناراض ہوگئے۔ انہی میں محبوب عالم بھی شامل تھے اور وہ کوئی ایسی شخصیت نہ تھے جسے انجمن حمایت اسلام نظرانداز کر سکتی۔ چنانچہ اقبال نے 'نہایت دوراندیشی اور دانائی سے اس بدگمانی کو دُوسرے دن رفع کر دیا...''

کس طرح کیا؟ اس کی تفصیل ہمیں معلوم نہیں۔ مگر دوسرے دن ۲۳ فروری کو انہوں نے اپنی وہ نظم سنائی جو غالباً اُنہوں نے مولویوں والے واقعات پیش آنے سے پہلے لکھی تھی اور اس سال کے لئے اُن کی خاص نظم تھی۔ ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے۔'' اس کی کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بکیں اور دس روپے کی قیمت تک پہنچیں۔

اس نشست کی صدارت نظام الدین، سب جج (راولپنڈی)، کر رہے تھے۔ اُنہوں نے نظم کے اختتام پر کہا۔

''شیخ صاحب کی تعریف جس قدر کی جائے کم ہے۔ آپ پنجاب کے ملک الشعرا ہیں۔''

31

اقبال گورنمنٹ کالج میں اس دفعہ بھی مستقل نہ ہو سکے۔ اسسٹنٹ پروفیسری مارچ میں ختم ہوگئی اور اُنہیں واپس اورینٹل کالج آنا پڑا جہاں اسٹراٹن صاحب کالج میں ایک نئی روح پھونکنے کے لئے دن رات ایک کئے ہوئے تھے۔

غزل

دِل کی بَستی عجیب بَستی ہے
لُوٹنے والے کو ترستی ہے
ہو قناعت جو زندگی کا اُصول
تنگ دستی، فراخ دستی ہے!

تابِ اظہارِ عشق نے لے لی
گفتگو کو زباں ترستی ہے
دیکھیے کیا سلوک ہو اقبالؔ
مجرمِ جُرمِ بُت پرستی ہے

مخزن، مارچ ۱۹۰۲ء

دوسرے شعر سے ذہن سالکؔ کے ایک شعر کی طرف جاتا ہے جواُن دنوں بہت مشہور تھا
تنگ دستی اگر نہ ہو سالکؔ
تندرستی ہزار نعمت ہے

32

غزل

نشے میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ
وہ وعظ اپنا کہے جائے ہوشیار ہوں میں
تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ
کہا جو سر کو جھکا کے ''گناہ گار ہوں میں''

33

نواب حبیب الرحمٰن شروانی اُس برس انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شریک ہوئے۔ بھیکم پور کے رؤسا میں سے تھے۔شبلی کی ''المامون'' پر تبصرے سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا تھا اور پھر ندوۃ العلماء کے جلسوں میں ''علمائے سلف'' اور ''نابینا علماء'' وغیرہ مقالوں سے انہوں نے اپنی مستقل حیثیت قائم کرلی۔ان کا ذاتی کتب خانہ مخطوطات اور مطبوعہ کتب کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔

انہیں اشعار سنانے میں اقبال کو خاص لطف آنے لگا۔ چونکہ یہ شیخ عبدالقادر کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے لہٰذا جب تک لاہور میں رہے شعروسخن کی محفلیں جمتی رہیں۔ (۲۴)

34

۳۱ مارچ کو کالج کی سالانہ رپورٹ میں درج کیا گیا کہ اقبال نے واکر اور سٹبز کی کتابوں کے تراجم مکمل کر لئے ہیں اور اب علم الاقتصاد پر نئی کتاب لکھ رہے ہیں۔ اپنی کتاب!

35

پچیس برس کی عمر میں ایک مکمل علمی تصنیف کا مالک بننا بڑا خوبصورت خیال تھا۔ خاص طور پر اُس صورت میں جبکہ تین مقالے اس سے پہلے ہی میزان میں داخل ہو چکے ہوں۔

علم الاقتصاد پر اپنی کتاب کے لئے اُنہوں نے واکر کی پولیٹیکل اکانومی کو سامنے رکھتے ہوئے بعض دوسری تصانیف سے بھی استفادہ کیا تھا مثلاً مارشل کی ''پرنسپلز آف اکنامکس۔'' اقبال کے سابقہ اُستاد لالہ جیارام اور ہم جماعت فضل حسین نے اُنہیں ''نہ صرف اپنے بیش قیمت کتب خانوں کی کتابیں ہی عنایت فرمائیں بلکہ بعض مسائل کے متعلق نہایت قابل قدر مشورے بھی دیئے۔'' اس کتاب کی زبان وہی اُردو تھی جو اُس عہد میں ایک ادبی زبان سے علمی زبان بننے کے عمل میں تھی۔ اور کتاب کی زبان پر اقبال اتنی ہی محنت کر رہے تھے جتنی اپنی غزلوں کی زبان پر کیا کرتے تھے۔ اُردو کو سنوارنے کا جذبہ جو اُس دور میں عام تھا اِس نثر پارے کی تخلیق میں وہ بھی کسی نہ کسی حد تک کارفرما رہا ہوگا۔ ''میں اہلِ زبان نہیں ہوں،'' اقبال نے اس کتاب کے متعلق بعد میں لکھا۔ ''جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔'' (۲۵)

زبان میں اُنہوں نے جو تجربات کئے اُن میں یہ تجربہ بھی شامل تھا کہ جس طرح انگریزی میں فعل labour فاعل یعنی labourer کے معانی میں استعمال ہوتا تھا انہوں نے اُردو میں لفظ 'محنت' محنت کش کے معانی میں استعمال کیا۔ ''جہاں کئی فارسی محاورات کے لفظی تراجم اُردو زبان میں مستعمل ہیں اگر اِس لطیف محاورۂ انگریزی کا ترجمہ بھی مستعمل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔''

اصطلاحات کا معاملہ ٹیڑھا تھا۔ اقبال نے بعض اصطلاحات خود وضع کیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے حاصل کیں۔

علم الاقتصاد

دیباچہ (اقتباس)

کیا ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مِٹ جائے؟ اِس سوال کا جواب دینا علمِ اقتصاد کا کام نہیں۔ کیونکہ کسی حد تک اس کے جواب کا انحصار انسانی فطرت کی اخلاقی قابلیتوں پر ہوتا ہے۔ جن کو معلوم کرنے لئے اس علم کے ماہرین کوئی خاص ذریعہ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے۔ مگر چونکہ اس جواب کا انحصار زیادہ تر اُن واقعات اور نتائج پر بھی ہے جو علم الاقتصاد کے دائرۂ تحقیق میں داخل ہیں اس واسطے یہ علم انسان کے لئے انتہا درجے کی دلچسپی رکھتا ہے اور اس کا مطالعہ تقریباً تقریباً ضروریاتِ زندگی میں سے ہے۔ (۲۵)

36

ڈاکٹر وانٹ برجنٹ صاحب نے، جنہیں مشرقی زبانوں سے خاص دلچسپی تھی، انگریزی زبان میں ایک مختصر مضمون اُردو پر لکھا تھا۔ کسی موقعے پر اُنہوں نے اقبال کو اس کی کاپی تحفتہً پیش کی (۲۶)۔ اس مضمون کے مطابق:

اُنیسویں صدی میں اُردو نثر کی ترقی کے تین بڑے قومی سبب ہوئے۔ پہلا چھاپہ خانہ کا عام ہونا۔ دوم، انگریزی میں تعلیم (جس کا آغاز ۱۸۳۲ء میں ہوا تھا) جس کے بارے میں برجنٹ صاحب کا خیال تھا کہ ہندوستان کی کوئی زبان اس مغربی اثر سے اِس قدر متاثر نہیں ہوئی جس قدر اُردو ہوئی تھی۔ تیسرا اہم سبب فارسی کے بجائے اُردو کا درباری زبان قرار دیا جانا تھا۔ ''اِس واقعہ کے اثر نے پٹنہ اور پشاور کے درمیانی ممالک کو اُردو کے زیرِ نگین کر دیا ہے اور چونکہ دہلی اور آگرہ کو اب دارالخلافہ ہونے کا شرف نہیں رہا اِس واسطے (اُردو) کی ادبی تحریکات کے مرکز لاہور اور الہ آباد قرار پا گئے ہیں۔''

عبدالقادر نے اقبال سے درخواست کی کہ وہ اس مضمون کو مخزن کے لئے ترجمہ کر دیں۔

37

خطِ منظوم

(پیغامِ بیعت کے جواب میں)

خضر سے چُھپ کے مَر رہا ہوں مَیں
تشنہ کامِ مئے فنا ہوں مَیں
ہم کلامی ہے غَیریت کی دَلیل
خامشی پر مِٹا ہُوا ہوں مَیں
مَیں نے مانا کہ بے عمل ہوں مگر
رَمزِ وحدت سے آشنا ہوں مَیں
پَردۂ مِیم میں رہے کوئی
اِس بھلاوے کو جانتا ہوں مَیں
مَیں کِسی کو بُرا کہوں۔ توبہ
ساری دُنیا سے خُود بُرا ہوں مَیں
بھائیوں مِیں بگاڑ ہو جِس سے
ایسے مذہب کو کیا سراہوں مَیں
مَرگِ اغیار پر خُوشی ہے تُجھے
اور آنسُو بہا رہا ہوں مَیں

عقل نے ایک دِن یہ دِل سے کہا
بھُولے بھٹکے کی رہنُما ہوں مَیں
بُوند اِک خُون کی ہے تُو لیکن
غَیرتِ لَعلِ بے بہا ہوں مَیں
دِل نے سُن کر کہا، کہ سب سَچ ہے
پَر مُجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں مَیں

رازِ ہستی کو تُو سمجھتی ہے
اَور آنکھوں سے دیکھتا ہُوں مَیں
عِلم کی انتہا ہے بے چَینی
اِس مرض کی مگر دَوا ہُوں مَیں
شمَع تُو محفلِ صَداقت کی
حُسن کی بزم کا دِیا ہُوں مَیں
کِس بلندی پہ ہے مَقام مِرا
عَرش ربِّ جَلیل کا ہُوں مَیں
ہائے یہ دِل ہو میرے پہلو میں
تُو یہ سمجھے کہ دہریا ہُوں مَیں
فَیض، اِقبالؔ ہے اُسی دَر کا
بَندۂ شاہِ لافتیٰ ہُوں مَیں

مخزن، مئی ۱۹۰۲ء

اقبال نے احمدیت کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا تھا۔ غالباً میر حامد شاہ نے عقلی دلائل پیش کئے تھے جن کے مقابلے پر اقبال نے عشقِ رسول کو دلیل بنایا تھا۔ اسی نظم میں ان کے تفضیلی عقیدے کی جھلک بھی نظر آتی ہے کیونکہ بین السطور وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اگر رسول اللہؐ کے بعد رہنمائی درکار ہے تو شاہِ لافتیٰ (حضرت علی) کافی ہیں۔

''بھائیوں...'' اور ''مرگِ اغیار...'' والے اشعار میں بظاہر مرزا غلام احمد کے اِس فرمان کی طرف اشارہ تھا کہ کوئی احمدی کسی غیر احمدی کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھے گا۔

38

صدائے درد

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی
کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
روح کا جوبن نکھرتا ہے اسی تدبیر سے
آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے
رنگِ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں
خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں

وصلِ محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی
اک بیاضِ نظمِ ہستی کی ہیں تفسیریں سبھی
ایک ہی مے سے اگر ہر چشمِ دل مخمور ہے
یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستور ہے؟

مخزن، جون ۱۹۰۲ء

39

عشق وہ چیز ہے کہ جس میں قرار
چاہیے بے قرار ہونے کو

مخزن جون ۱۹۰۲ء

40

اسٹراٹن صاحب کی صحت کو ہندوستان کی آب وہوا راس نہ آئی۔ وہ بیمار رہنے لگے تھے۔ جون کے آخر تک اُن کی طبیعت کافی خراب ہوگئی۔

41

بارہ مولہ کشمیر کے رئیس عبدالصمد ککڑ و فارسی میں شعر کہتے تھے۔ مقبلؔ ان کا تخلص تھا۔ اقبال سے خاص مراسم تھے۔

غالباً جون میں عبدالصمد کا جوان بیٹا خواجہ غلام حسن انتقال کر گیا۔ یہ اتنے غم سے نڈھال ہوئے کہ فرزند کا مرثیہ کہنے کی تاب نہ رہی۔ اقبال نے ان کی طرف سے مرثیہ لکھا

اندھیرا صَمَد کا مکاں ہوگیا
وہ خُورشیدِ رَوشن نِہاں ہوگیا

سولہ (۱۶) اشعار کا یہ مرثیہ جولائی کے مخزن میں ''ماتم پسر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

''خطِ منظوم'' جو پچھلے ماہ مخزن میں شائع ہوئی تھی ۱۴ جولائی کو ہفت روزہ پنجہ فولاد میں بھی چھپ گئی۔

۴۲

جولائی کے وسط میں اسٹراٹن صاحب آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے کالج سے چھٹی لے کر وادیٔ کشمیر روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچے تو پہلے سے موجود تکالیف میں کوہستانی بخار کا اضافہ ہوگیا۔

اگست کے خاتمے تک یہ خبر لاہور پہنچ چکی تھی کہ اسٹراٹن صاحب کشمیر میں انتقال کر گئے ہیں (۲۷)۔

اقبال نے اُن کی نوجوان بیوہ کے نام تعزیت نامہ لکھا۔

"...I believe it is through Dr. Straten's influence that some people here are thinking of joining American universities, and I am one of them."

43

لٹریری سوسائٹی یا انجمن اتحاد مدت ہوئی خواب و خیال ہو چکی تھی۔ ایک دن احمد حسین خاں کو اسے دوبارہ زندہ کرنے کا خیال آیا (۲۸)۔ غالباً ۱۳ جون کو اعلان کیا کہ اگلی شام انجمن اتحاد کا مشاعرہ ہے۔ اس عجلت میں بڑے شعراُ وقت نہ نکال سکے مگر لوگ خاصی تعداد میں جمع ہو گئے۔ اتفاق سے زور کی آندھی چلی اور بارش ہوئی جس کی وجہ سے مشاعرہ دو دن بعد تک ملتوی کرنا پڑا۔

۱۶ جون کی شام بقول پنجہ فولاد 'صرف دو تین لڑکوں نے ہی مصرع طرح پر معمولی غزلیں

پڑھیں''۔ مگر جیسا کہ اُس دَور کا مزاج بن چکا تھا، بزم میں دو سنجیدہ مضامین بھی پڑھے گئے۔ ایک مضمون تو احمد حسین کا اپنا ہی تھا۔ دوسرا مولوی ممتاز علی کا لیکچر تھا۔ اتفاق سے دونوں کا موضوع ''تہذیب نسواں'' تھا اور کسی منشی حامد حسین کی نظم بھی شائد اسی موضوع پر تھی۔

۱۸ جون کو پنجۂ فولاد کا شمارہ نکلا تو اُس میں ایک مضمون مشاعرے کے بارے میں بھی تھا۔ لکھنے والے کا نام درج نہیں تھا مگر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اقبال نے لکھا تھا۔ بظاہر اس میں تین باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے اِس پر اقبال کی تحریر کا شبہ ہوتا ہے۔

اوّل اس میں احمد حسین کی تعریف کے ساتھ ساتھ بڑی شائستگی سے اُن پر چوٹ کی گئی ہے۔ ''جن کی ان تھک ہمت'' کے باعث انجمن اتحاد ''دفعتاً پھر کتم وجود میں آ گئی...دفعتاً کا لفظ میں نے اِس لئے لکھا ہے کہ تاریخِ مشاعرہ سے دو دِن بھی پہلے نوٹس شائع نہیں کیا گیا۔'' اقبال اور احمد حسین خاں عام طور پر حریف سمجھے جاتے تھے۔

دوم، مضمون کے آخر میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ ''میرے خیال میں اگر مشہور علم دوست پروفیسر آرنلڈ کو اس لٹریری سوسائٹی کا لائف پریذیڈنٹ قرار دیا جائے تو یہ اَنسب ہوگا۔ عجب نہیں اگر مسٹر آرنلڈ ہی ڈاکٹر لائٹنر ثانی بن کر اِس لٹریری سوسائٹی کو مرحوم انجمن پنجاب سے بھی زیادہ بارونق کر دیں۔''

تیسری بات یہ ہے کہ اس تحریر میں تہذیبِ نسواں کے متعلق ملے جلے جذبات پائے جاتے ہیں۔ احمد حسین خاں اور حامد حسین کی نگارشات کی تعریف ہے۔ ممتاز علی صاحب کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی گئی اور آخر میں کہا گیا ہے۔ ''یہ کسی قدر نامناسب بات معلوم ہوتی ہے کہ مشاعرہ ہو سوسائٹی کا اور تمام وقت ایک ہی مضمون (موضوع) پر صرف کیا جائے۔''

تہذیبِ نسواں کے معاملے میں اقبال کی رائے بہت اُلجھی ہوئی تھی۔ وہ عورتوں کے بعض حقوق کے حامی تھے جو اُن کے خیال میں اسلام نے عورتوں کو عطا کئے تھے مگر اُس زمانے میں عورتوں کی تعلیم اور معاشرتی اصلاح کے لئے جو عام تحریکیں شروع ہوئی تھیں اُن سے وہ سخت بیزار تھے۔

پنجاب میں اِس تحریک کے سب سے سرگرم مبلّغ مولوی ممتاز علی تھے۔ یہ کسی زمانے میں علی گڑھ میں بھی رہ چکے تھے جن کی کتاب ''حقوقِ نسواں'' کے مسودے کو سرسید احمد خاں نے اُن کے سامنے پرزے پرزے کر کے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا تھا (۲۹)۔ اب لاہور سے رسالہ ''تہذیب نسواں'' عورتوں کے لئے اور ''پھول'' بچوں کے لئے شائع کرتے تھے۔ اقبال ان کا ادب کرتے تھے اور اپنا بزرگ

مانتے تھے جس کی ایک وجہ شائد یہ ہو کہ مولوی ممتاز علی کی بیگم اُنہی شفیع احمد صاحب کی بیٹی تھیں جو غدر کے بعد سیالکوٹ میں آئے تھے اور جن کی مدد سے مولوی میر حسن نے اپنی اُردو صاف کی تھی۔ مگر اِس قریبی تعلق کے باوجود اقبال کے لئے ممتاز علی کی تحریک سے ہمدردی محسوس کرنا ممکن نہ تھا۔ بہت دنوں پہلے سر سید نے جو بات مولوی ممتاز علی سے کہی تھی وہ اُس زمانے کے اکثر مسلمان مردوں کے احساسات کی ترجمانی کرتی تھی۔ اُن کی کتاب پھاڑتے ہوئے سر سید نے کہا تھا ''ممتاز علی! ہماری حکومت چھن گئی۔ ہماری تہذیب مٹ گئی۔ اب کیا ہماری عورتیں بھی ہمارے قبضے سے نکل جائیں گی؟''

باب ۸

سورج کے سامنے

۱۹۰۳ء

1

آفتاب

ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں۔ جس کو گاتیری کہتے ہیں۔ یہ دعا گویا ان تاثرات کا اظہار ہے جنہوں نے نظامِ عالم کے حیرت ناک مشاہدے سے اوّل اوّل انسان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا... اصل سنسکرت میں لفظ ''سوتر'' استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے اُردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ ''آفتاب'' رکھا ہے لیکن اصل میں اِس لفظ سے مُراد اُس آفتاب کی ہے جو [محسوسات سے پرے] ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب [روشنی حاصل] کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے... (اقبال)

اے آفتاب! روحِ روانِ جہاں ہے تُو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تُو

باعث ہے تُو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بُود کا
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نُور ہے
دِل ہے، خرد ہے، رُوح ہے، عقل و شعُور ہے
اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعُور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نُور دے
نَے ابتداء کوئی، نہ کوئی اِنتہا تری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیاَ تری

مخزن، اگست ۱۹۰۲

2

ستمبر کے مخزن میں وانٹ برجنٹ صاحب کے مضمون کا اقبال کا ترجمہ ''اُردو زبان'' کے نام سے شائع ہوا(۱)۔ ادارتی نوٹ میں لکھا تھا۔ ''اِس مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اُردو زبان کے بانکپن نے مغربی فضا کو بھی اپنا گرویدہ کرلیا ہے۔''

3

خواجہ مسیح پال سیالکوٹ کے ایک مقامی عیسائی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ عمر ۱۸ برس تھی۔ امیؔن اور حزیؔں کے تخلص کے ساتھ شاعری کرتے تھے۔ اُن کی ایک غزل ''پیامِ یار'' (لکھنؤ) میں چھپی۔ اصلاح لینے کا خیال آیا تو اقبال سے ملے اور اصلاح لینے کا خیال ظاہر کیا۔

''شاعری خداداد چیز ہے،'' اقبال نے جواب دیا۔ ''اگر شعر گوئی کا جذبہ سچا ہے تو مشقِ سخن کئے جایئے۔ اور اساتذہ کا کلام ضرور پڑھیئے تاکہ کان بحروں سے واقف ہوجائیں اور زبان میں کوئی سقم نہ رہ جائے۔''(۲)

سچی بات یہ ہے کہ اقبال کو شاعری میں شاگرد پالنے سے سخت وحشت ہوتی تھی۔

4

منشی سراج الدین نے کشمیر سے چار انگوٹھیاں بھیجی تھیں۔ وہ کشمیر ریذیڈنسی میں میر منشی تھے اور اقبال کے خاص دوست اور قدردان بھی۔ اقبال نے جواب میں دوغزلہ لکھا جس کا عنوان ''شکریۂ انگشتری'' تھا اور جس میں غالب کی ''چکنی ڈلی'' والے اشعار کی جھلک موجود تھی۔ درمیان میں اردو سے بدل کر فارسی پر آ گئے

ہوں بہ تبدیلِ قوافی فارسی میں نغمہ خواں
ہند سے جاتی ہے سُوئے اصفہاں انگشتری

ڈیر سراج

دو تین روز سے طبیعت بسبب دورۂ درد کے علیل ہے۔ یہ چند اشعار قلم برداشتہ آپ کے شکریے میں ارسال کرتا ہوں۔ میرا ارمغاں یہی ہے۔ اسی کو قبول کر کے مشکور کیجیے۔ چاہیں تو پیشانی پر چند سطور اردو میں لکھ کر مخزن میں بھیج دیجیے۔ والسلام

آپ کا اقبال

از لاہور

اس معمولی سی نظم کے آخری اشعار اقبال کے اولین فارسی اشعار ہیں جو دستیاب ہوئے ہیں:

یارم از کشمیر فرستادست چار انگشتری
چار در صورت، بمعنی ہزار انگشتری

اُس وقت شائد خود ان کے وہم و گمان میں نہ آ سکتا تھا کہ آگے چل کر اُردو کی بجائے فارسی اُن کے دل کے نغموں کی زبان بننے والی ہے۔

5

اکتوبر میں اقبال کو دوبارہ گورنمنٹ کالج میں قائم مقام اسسٹنٹ پروفیسر ہونے کا موقع ملا۔ اس دفعہ ان کا تقرر شعبۂ فلسفہ کی بجائے انگریزی میں ہوا تھا۔

آرنلڈ اُن دنوں اورینٹل کالج کے قائم مقام پرنسپل تھے کیونکہ مسٹر اسٹراٹن کی موت کے بعد سے یہ

آسامی خالی تھی۔

6

اقبال جس مبالغے سے حضرت علیؓ کی تعریف کرتے تھے، اُسی جوش و خروش کے ساتھ حضرت عمرؓ کی عظمت بیان کر سکتے تھے۔ اس معاملے میں اقبال کی وسیع النظری کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ مگر سیالکوٹ کے مولوی عبدالکریم صاحب کی نظر میں اقبال نے صرف مرزا غلام احمد صاحب کی بیعت سے انکار نہیں کیا تھا بلکہ حضرت علیؓ کے فیضان کو بیعت سے انکار کی دلیل بنایا تھا۔ چنانچہ اقبال اِس دفعہ سیالکوٹ آئے تو عبدالکریم کی طرف سے ایک نئی تکرار کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں عشق رسولؐ میں ڈوبی ہوئی ایک اور غزل وجود میں آ گئی۔ (۳)

غزل

عاشقِ دیدار محشر کا تمنائی ہُوا
وہ سمجھتے ہیں کہ جرمِ ناشکیبائی ہُوا

تُجھ میں کیا اے عشق! وہ اندازِ معشوقانہ تھا
حُسن خُود 'لولاک' کہہ کر تیرا شیدائی ہُوا

دیکھ ناداں! اِمتیازِ شمع و پروانہ نہ کر
حُسن بن کر عشق آپ اپنا تماشائی ہُوا

بُغض اصحابِ ثلاثہ سے نہیں اِقبال کو
دِق، مگر اِک خارجی سے آ کے مولائی ہُوا

مخزن، اکتوبر ۱۹۰۲ء

7

دسمبر میں اُن کی دو نظمیں مخزن میں شائع ہوئیں۔

پہلی نظم کا عنوان شمع تھا۔ اس میں شمع کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ اے شمع، تیری طرح میں بھی دردمند ہوں لہٰذا میں تیرے اس راز سے واقف ہوں کہ تو محفل کو رونق بخشنے کے لیے نہیں جلتی بلکہ اس لیے جلتی ہے کہ تو اُس تجلی سے دُور ہے جو خدا کی ذات ہے۔ میرا بھی یہی المیہ ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ خدا جس کے فراق میں بے چین رہتا ہوں وہ خود میرے اندر موجود ہے۔ ستم ظریفی دیکھ کہ مجھے یہ شعور بھی دیا اور پھر گناہوں کی طرف بھی دھکیل دیا۔ اب میں اپنے آپ کو کیا سمجھوں؟ خدا کا عکس یا راہ سے بھٹکا ہوا مسافر؟ لیکن میرا خاموش ہونا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ منصور حلاج کا انجام مجھے یاد ہے جسے اناالحق (میں خدا ہوں) کہنے کے جرم میں سولی دے دی گئی تھی۔

دِل خارزارِ کم نگہی میں اُلجھ نہ جائے
ڈرتا ہُوں کوئی میری فُغاں کو سمجھ نہ جائے

یہ نظم گویا ''آفتاب'' کا تسلسل تھی۔ اُن دنوں وہ منصور حلاج کا مطالعہ زیادہ کر رہے ہوں گے کیونکہ اس کے چند مہینے بعد مزید ایک نظم اور ایک غزل میں بھی منصور کا تذکرہ آیا۔

دسمبر میں شائع ہونے والی دوسری نظم سیمول راجرس کی ''A Wish'' کا آزاد ترجمہ تھی۔ اس ترکیب بند میں دو بند تھے اور ۱۳۰ اشعار پر مشتمل تھی۔

ایک آرزو

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہُوں یا رَب!
کیا لُطف انجُمن کا جَب دِل ہی بُجھ گیا ہو
مَرتا ہُوں خامشی پَر، یہ آرزُو ہے میری
دامَن میں کوہ کے اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا، سبزے کا ہو بچھونا
شرمائے جِس سے جَلوت خَلوت میں وہ اَدا ہو

مانُوس اِس قدر ہو صُورت سے میری بُلبُل
ننّھے سے دل میں اُس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

ہو دِل فریب ایسا کُہسار کا نظارہ
پانی بھی مَوج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دَم
اُمید اُن کی میرا ٹُوٹا ہُوا دِیا ہو

بجلی چمک کے اُن کو کُٹیا مری دِکھا دے
جب آسماں پہ ہَر سُو بادل گھِرا ہُوا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بُلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا دَرا ہو

ہَر دردمند دِل کو رونا مرا رُلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید اُنہیں جگا دے

سمجھیں مرے سُخن کو ہندوستان والے
مَوزوں ہوگئے ہیں نالے سُخن نہیں ہے

اَپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہ کے
مَیں بے وطن ہُوں کوئی میرا وطن نہیں ہے

مخزن، دسمبر ۱۹۰۲ء

باب ۹

امیر کا صنم خانہ

۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۴ء

پہلا حصہ

1

لاہور کے بالا خانوں میں کہیں ایک مغنیہ رہتی تھیں جن کا نام امیر تھا۔ عمر اکیس برس تھی اور طوائفوں کے ایک نامور خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ بے حد ذہین اور حاضر جواب تھیں۔ اُس زمانے کے رواج کے مطابق اچھی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ حافظ کی غزلیں خوب گاتی تھیں اور خود بھی شاعرہ تھیں۔

اقبال کا امیر بیگم سے سامنا ہوا تو انہوں نے محسوس کیا کہ وہ محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدارا
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

حافظ

مگر معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں کوئی ایسی دشواری ضرور آن پڑی کہ انہیں اپنی محبت کا جواب نہ ملا (۱)۔

ان دنوں وہ مڈل کے پرچوں کے ممتحن تھے اور ذہن اس طرح اُلجھا ہُوا تھا کہ شعر کہنے کی طرف

طبیعت مائل نہیں ہوتی تھی۔

2

فوق کو پیغام ملا کہ انہیں اقبال نے بلایا ہے۔ ''میں دوڑا دوڑا اُن کے پاس گیا تو اقبال کو کسی قدر فکر مند پایا،'' فوق بیان کرتے ہیں (۲)۔ ''میں نے فکر مندی کی وجہ پوچھی تو بولے کہ ہیرامنڈی کی مغنیہ، جس کے پرسوز گانے سن کر میں بے حد لطف اندوز ہوا، آج کل التفات نہیں کر رہی ہے۔ اب اسکا دماغ ٹھیک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اُس کی ہجو لکھو جو اُس کو کسی طرح سے بھیج دی جائے گی۔ میں تم کو یہ زحمت اِس لئے دے رہا ہوں کہ خود ہجو نہیں لکھتا۔''

فوق مان گئے۔

3

بالآخر امیر بیگم نے اقبال کو بتا دیا کہ وہ خود بھی اُن سے متاثر ہیں۔ صرف امیر بیگم کی والدہ اقبال کو پسند نہیں کرتیں جس کی وجہ شائد یہ رہی ہو کہ اقبال دُوسرے تماش بینوں کی طرح ڈھیروں روپے نہیں لُٹا سکتے ہوں گے۔

غزل

چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم
بن کر خیالِ غیر ترے دل میں آئیں ہم

اے صدمۂ فراق نہ کر ہم سے چھیڑ چھاڑ
تُو کس کا ناز ہے کہ تُجھے بھی اُٹھائیں ہم؟

ڈرتے تھے جس کے واسطے، وہ بات اب کہاں؟
تُو ایک اب کہے تو تُجھے سو سُنائیں ہم

اقبالؔ شعر کے لئے فرصت ضرور ہے

اس فکر امتحاں میں غزل کیا سنائیں ہم

مخزن، جنوری ۱۹۰۳ء

4

جنوری کے مخزن میں اُن کی غزل کے ۵ اشعار (جن میں آخری دو شعر شامل نہیں تھے) اور ۳۳ اشعار کی نظم ''سیّد کی لوحِ تُربت'' شائع ہوئی جو مثنوی کی صُورت میں تھی۔ اس میں سرسیّد کی قبر کے کتبے کی زبانی ہندوستان میں بسنے والوں کو امن اور اتحاد کا پیغام دیا گیا تھا۔

5

''اچھی ہجو لکھنے میں دو تین دن صرف ہوگئے،'' فوق بیان کرتے ہیں۔ ''لیکن ہجو مکمل ہوگئی اور میں اقبال کے پاس گیا، تو وہاں یہ دیکھ کر کچھ مایوس سا ہوگیا کہ اُنہوں نے اس بات کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ آخر میرا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور میں نے عرض کی کہ میں ہجو لکھ کر لایا ہُوں۔ اقبال نے ایک پُر لطف تبسّم کر کے فرمایا۔ ''اب اس کی ضرورت نہیں۔ اُس کا دماغ ٹھیک ہوگیا ہے!''

6

جنوری میں شبلی نعمانی انجمن حمایت اسلام کے کسی جلسے میں لیکچر دینے لاہور آئے۔ اُن کا موضوع ''اسلام'' تھا۔ اُنہوں نے مذہب اور انسانی فطرت کے ربط کے علاوہ دِین اور دُنیا کے باہمی تعلّق پر زور دیا۔

خیال ہے کہ اس موقعے پر آرنلڈ نے اپنے دوست سے شاگرد کا تعارف کروایا ہوگا اور سفارش کی ہوگی کہ وہ ''علم الاقتصاد'' پر زبان کی اصلاح کے خیال سے ایک نظر ڈالیں۔

7

انجمن کا اٹھارہواں سالانہ اجلاس چند ہفتوں میں ہونے والا تھا مگر اقبال محسوس کر رہے تھے کہ وہ کوئی نظم پیش نہیں کر سکتے۔ اُنہوں نے امتحانات کا عُذر پیش کر دیا۔ بہرحال یہ ۱۹۰۰ء کے نالۂ یتیم کے بعد پہلا موقع تھا کہ انجمن کا سالانہ اجلاس اقبال کی نظم کے بغیر ہو رہا تھا۔

8

مخزن اور پنجۂ فولاد کے بعد ''خطِ منظوم'' ہفتہ وار الحکم (قادیان) کے ۱۰-۱۷-۲۴ فروری کے نمبر میں شائع ہوگئی (۳)۔ میر حامد شاہ کو خیال آیا اور اُنھوں نے دھواں دھار قسم کی جوابی نظم ''الحکم'' میں چھپوادی جس میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ

میرا پابوس کیوں نہ ہو اقبال
حامدِ نائبِ خدا ہوں میں

9

غزل

کیا کہوں، اپنے چمن سے مَیں جُدا کیونکر ہوا ؟
اور اسیرِ حلقۂ دامِ ہوا کیونکر ہوا؟
ہے طلب بے مدّعا ہونے کی بھی اِک مُدّعا
مُرغِ دل، دامِ تمنّا سے رہا کیونکر ہوا؟
دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تُجھے
پھر یہ وعدہ حشر کا، صبر آزما کیونکر ہوا؟
میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی
کیا بتاؤں، اُن کا میرا سامنا کیونکر ہوا؟
یُوں تو مرتے ہو ہنسی ٹھٹھے پہ اے اقبالؔ! تُم
دِل تُمھارا اِس قدر درد آشنا کیونکر ہوا؟

مخزن۔ فروری ۱۹۰۳ء

۱۲ اشعار کی یہ غزل امیرؔ مینائی کی زمین میں تھی۔

10

عشق مجازی تصوّف کا مستقل موضوع ہے۔ یہ کسی دلربا کا والہانہ عشق ہی ہوتا ہے جو ایک سچّے

سالکِ راہ کو خُدا کی طرف رجوع کروانے کا سبب بنتا ہے۔ زلیخا اور یوسف کا عشق، شیریں اور فرہاد، لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا...صُوفیانہ ادب میں ایسے قصّوں کی کمی نہیں۔ اور اقبال بھی ان سے آگاہ تھے۔

عشقِ مجازی سے آگے بڑھ کر عشقِ حقیقی تک بات پہنچے تو موسیٰ ایک منفرد کردار ہیں جنہوں نے خدا کو ظاہری حُسن کے پردے سے بے نیاز ہو کر بے حجاب دیکھنا چاہا تھا۔ مگر اقبال کے نزدیک سچے عاشق کی نگاہ محبوب کی صورت میں بھی خُدا ہی کا جلوہ دیکھتی ہے۔ بہر حال، تمام صُوفی ادب اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ عِشق کے گہرے تجربے سے گزرے بغیر کوئی راہی سلوک کی راہ گزر پر تیز چلنے کے قابل نہیں ہُوا۔ اقبال کی زندگی میں عِشق کا یہ سانحہ امیر بیگم کی صُورت میں رونما ہُوا۔

اس عشق کی دو منزلوں کا سُراغ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ جنوری کے مخزن میں جو غزل شائع ہُوئی تھی اُس میں وصل کی خواہش کا یہ عالم تھا کہ صدمۂ فراق ناگوار معلُوم ہو رہا تھا۔ اگلے مہینے جو نظم کہی اُس میں اپنے اس شعر کا خاص طور پر جواب لکھتے ہوئے بتایا کہ ہجر میں جو لطف ہے وہ اب اُس سے واقف ہو گئے ہیں۔ یہی سلوک کی راہ میں مجاز سے حقیقت کی طرف قدم ہوتا ہے۔

شیریں فرہاد کا قصہ پڑھ کر کسی کو تعجب ہُوا کہ بھلا ایک انسان کِس طرح پہاڑ کاٹ کر نہر نکال سکتا ہے۔ اُس نے ایک دانا سے یہ سوال کیا تو جواب ملا۔ ''انسانی شخصیت میں بے پناہ قوتیں موجود ہیں جو عام طور پر زندگی کی مختلف خواہشات میں بکھر جاتی ہیں۔ جب کوئی ایسی خواہش سامنے آ جائے کہ وہ باقی تمام آرزوؤں کو ختم کر دے تو یہ قوّت اکٹھی ہو جاتی ہے۔ پہاڑ اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ مگر اصل مصرف اِس قوّت کا یہ ہے کہ عِشق خُود حُسنِ کامل بن جائے۔ فرہاد گنوار سنگتراش تھا، اُس نے اِس توانائی کو پتّھر کُوٹنے میں صرف کر دیا۔ اگر وہ اپنے دل کو تراشنے پر توجّہ کرتا تو اُسے محبوب کا جلوہ وہاں مل جاتا۔ پرویز کے محل میں شیریں کو تلاش کرنے کی بجائے اُسے اپنے دل کے محل میں تلاش کرو۔''

جدید شُعراء میں سے غالبؔ نے اِس خیال کو ظاہر کیا تھا ؏

جگر کیا ہم نہیں رکھتے جو کھودیں جا کے معدن کو

اقبالؔ گنوار سنگتراش نہ تھے۔

11

۲۶ فروری کی شام امیر بیگم نے اُن سے شعر کہنے کی فرمائش کر دی یا خود اقبال نے اُنہیں سنانے کی

خواہش محسوس کی (۴)۔

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
غالبؔ

خیالات کا ہجوم ہوگیا۔ وحدت الوجود کے دفاع میں ایک نظم اُن کے ذہن پر اُترنے لگی جس کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ خُدا ہی خُدا ہے۔ وہی رسول کے جلوے میں زمین پر آیا تھا۔ اُس کا حُسن عاشق کے دل میں عِشق بن جاتا ہے اور محبوب کی شکل میں حُسن۔

یہ عجیب بات ہے کہ عورت سے محبت کرنے کی نسبت خدا سے محبت کرنا زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ قیس کو لوگوں نے مجنوں کا خطاب دے کر چھوڑ دیا تھا مگر منصور سُولی چڑھا دیئے گئے۔ اقبال کو بھی اپنی ہونے والی نظم سے خوف محسوس ہوا کہ ''کوئی وہابی اِس کے بعض اشعار پر کوئی فتویٰ نہ دے دے۔'' چنانچہ تمہید میں کہیں پندرہ سولہ اشعار کی غزل بھی کہہ دی۔ اِس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ یہ اشعار ستار کی دُھن پر مرتب کئے گئے ہوں۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دِل وا کرے کوئی
منصور کو ہُوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی سے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
ہو دِید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
میں اِنتہائے عِشق ہوں، تُو انتہائے حُسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
اَڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طُور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی
سو سو اُمید بندھتی ہے اِک اِک نگاہ پر
مُجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی

محفل ہو، شُغلِ مے ہو، شبِ ماہتاب ہو
اور مَیں بگڑوں تو مُجھ کو سنبھالا کرے کوئی
ہم جانتے ہیں میم کے پردے میں کون ہے
ہاں بھیدیوں سے منہ نہ چھپایا کرے کوئی
اقبال! عشق نے مِرے سب بَل دیے نکال
مُدّت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

غزل کے بعد اصل نظم کا آغاز ہوا۔ اشعار اِس رفتار سے نازل ہو رہے تھے کہ خود قلم پکڑنا دُشوار تھا۔ اُن کے اپنے الفاظ میں ''یہ سمجھ لو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال ڈالا ہے۔ مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی آ رہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہو گیا ہے۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کِسے پکڑوں اور کِسے چھوڑ دوں!''

امیر بیگم یا کسی اور ہمدرد نے کاغذ قلم سنبھال لیا اور اقبال پر آمد ہوتی رہی۔

ابرِ گُہر بار

دِل میں جو کُچھ ہے نہ لب پر اُسے لاؤں کیونکر؟
ہو چھپانے کی نہ جو بات، چھپاؤں کیونکر؟
صدمۂ ہجر میں کیا لطف ہے اللہ اللہ!
یہ بھی اِک ناز ہے تیرا نہ اُٹھاؤں کیونکر؟
ضبط کی تاب، نہ یارائے خموشی مجھ کو
ہائے اس دردِ محبت کو چھپاؤں کیونکر؟
بات ہے راز کی پر منہ سے نکل جائے گی
یہ مئے کہنہ خُمِ دل سے اُچھل جائے گی

آسماں مجھ کو مٹا دے جو فروزاں ہوں میں
صورتِ شمعِ سرِ گورِ غریباں ہوں میں
ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا
کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں
رِند کہتا ہے ولی مجھ کو، ولی رِند مجھے
سُن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں
زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں
کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب
کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں
ہوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اتنی باتیں
کیا غضب آئے نگاہوں سے جو پنہاں ہوں میں
دیکھ اے چشمِ عدو! مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں
مزرعِ سوختۂ عشق ہے حاصل میرا
درد قرباں ہوں جس دل پہ، ہے وہ دل میرا

قصۂ دار و رسن، بازیٔ طفلانۂ دل
التجائے ارنی سرخیِ افسانۂ دل
حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مِل جاتا
تُو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل
عرش کا ہے، کبھی کعبے کا ہے دھوکہ اس پر
کس کی منزل ہے الٰہی! مرا کاشانۂ دل
اِس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا

دل کسی اور کا دیوانہ، میں دیوانۂ دل
تُو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں! اِس کو
خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے
وہ اثر رکھتی ہے خاکسترِ پروانۂ دل
عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

آتی ہے اپنی سمجھ اور پہ مائل ہوکر
آنکھ کھل جاتی ہے انسان کی، بے دل ہوکر
میری ہستی ہی تو تھی میری نظر کا پردہ
اُٹھ گیا بزم سے میں، پردۂ محفل ہوکر
عینِ ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا
حق دکھایا مجھے اِس نقطے نے باطل ہوکر
طُور پر تُو نے جو، اے دیدۂ موسیٰ! دیکھا
وہی کچھ قیس نے دیکھا پسِ محمل ہوکر
کیا کہوں بے خودیٔ شوق میں لذّت کیا ہے
تُو نے دیکھا نہیں زاہد! کبھی غافل ہوکر
مئے عرفاں سے مرا کاسۂ دل بھر جائے
میں بھی نکلا ہوں تری راہ میں سائل ہوکر
المدد! سیّدِ مکّی، مدنی العربی!
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی
لاکھ سامان ہے، اِک بے سر و ساماں ہونا
مجھ کو جمعیتِ خاطر ہے، پریشاں ہونا
تیری اُلفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا
یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا
علم و حکمت کے مدینے کی کشش ہے مجھ کو
لطف دے جاتا ہے کیا کیا مجھے ناداں ہونا
لطف دیتا ہے مجھے، مِٹ کے ترِی اُلفت میں
ہمہ تن شوقِ ہوائے عربستاں ہونا
یہی اسلام ہے میرا، یہی ایماں میرا
تیرے نظارۂ رُخسار سے حیراں ہونا
خندۂ صبحِ تمنائے براہیم اسّی
چہرہ پرداز بہ حیرت کدۂ میم اسّی

حشر میں، ابر شفاعت کا گہربار آیا
دیکھ اے جنسِ عمل! تیرا خریدار آیا
پیرہن عشق کا جب حُسنِ ازل نے پہنا
بن کے، یثرب میں، وہ آپ اپنا خریدار آیا
میں گیا حشر میں جس دم تو صدا یوں آئی
دیکھنا، دیکھنا، وہ کافرِ دیں دار آیا
لطف آنے کا تو جب ہے کہ کسی پر آئے
ورنہ دل اپنا بھی آنے کو تو سو بار آیا
عشق کی راہ میں اِک سیڑھی ہر منزل پر
نجد کا دشت، کہیں، مصر کا بازار آیا
لیں شفاعت نے قیامت میں بلائیں کیا کیا
عرقِ شرم میں ڈوبا جو گنہ گار آیا
ہے ترے عشق کا مے خانہ، عجب مے خانہ

یعنی ہشیار گیا، اور میں سرشار آیا
ما عرفنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری
قابِ قوسین سے کھلتی ہے حقیقت تیری

لے چلا بحرِ محبت کا تلاطم مجھ کو
کشتیِ نوح ہے ہر موجۂ قلزم مجھ کو
خوف رہتا ہے یہ ہردم کہ رہِ یثرب سے
طُور کی سمت نہ لے جائے توہّم مجھ کو
اپنا مطلب مجھے کہنا ہے مگر تیرے حضور
چھوڑ جائے نہ کہیں تابِ تکلّم مجھ کو
ہے ابھی اُمّتِ مرحوم کا رونا باقی
دیکھ اے بے خودیٔ شوق! نہ کرگُم مجھ کو
ہمہ حسرت ہوں، سراپا غمِ بربادی ہوں
ستمِ دہر کا مارا ہوا فریادی ہوں

اے کہ تھا نُوح کو طُوفاں میں سہارا تیرا
اور براہیم کو آتش میں بھروسا تیرا
چشمِ ہستی صفتِ دیدۂ اَعما ہوتی
دیدۂ کُن میں اگر نُور نہ ہوتا تیرا
مجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدی سے، مگر
غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا
کیا کہوں اُمّتِ مرحوم کی حالت کیا ہے
جس سے برباد ہوئے ہم وہ مصیبت کیا ہے

حال اُمّت کا بُرا ہو کہ بھلا، کہتے ہیں
صفتِ آئینہ، جو کچھ ہے، صفا کہتے ہیں
واعظوں میں یہ تکبّر کہ الٰہی توبہ
اپنی ہر بات کو آوازِ خدا کہتے ہیں
ان کے ہر کام میں دنیا طلبی کا سودا
ہاں مگر وعظ میں دنیا کو برا کہتے ہیں
لاکھ اقوام کو دنیا میں اُجاڑا اِس نے
یہ تعصب کو مگر، گھر کا دِیا کہتے ہیں
یہ نصاریٰ کا خدا اور وہ علی شیعوں کا
ہائے کس ڈھنگ سے اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
مقصدِ لحمک لحمی پہ کھلی اِن کی زباں
یہ تو اِک ڈھنگ سے تجھ کو بھی بُرا کہتے ہیں
تیرے پیاروں کا جو یہ حال ہو، اے شافعِ حشر!
میرے جیسوں کو تو، کیا جانیئے کیا کہتے ہیں
وصل ہو لیلیٰ مقصود سے کیونکر اپنا
اخترِ سوختۂ قیس ہے اختر اپنا

امراَ جو ہیں، وہ سنتے نہیں اپنا کہنا
سامنے تیرے پڑا ہے مجھے کیا کیا کہنا
ہم جو خاموش تھے اب تک تو ادب مانع تھا
ورنہ آتا تھا ہمیں حرفِ تمنا کہنا
شِکوہ منّت کشِ لب ہے، کبھی منّت کشِ چشم
میرا 'کہنا' جو ہے 'رونا' تو ہے 'رونا'، 'کہنا'
قوم کو قوم بنا سکتے ہیں دولت والے

یہ اگر راہ پہ آ جائیں تو پھر کیا کہنا
بادۂ عیش میں سرمست رہا کرتے ہیں
یاد فرماں نہ ترا اور نہ خدا کا کہنا
دیکھتے ہیں یہ غریبوں کو تو برہم ہو کر
فقر تھا فخر ترا، شاہِ دوعالم ہو کر

اِس مصیبت میں ہے اِک تُو ہی سہارا اپنا
تنگ آ کر لبِ فریاد ہوا وَا اپنا
ہم تو مٹ جائیں گے معمورۂ ہستی سے مگر
صبر، اِن راہنماؤں پہ پڑے گا، اپنا
ہم نے سو راہ اخوت کی نکالی لیکن
نہ تو اپنا ہوا اپنا، نہ پرایا اپنا
ہاں برس، ابرِ کرم! دیر نہیں ہے اچھی
کہ نہ ہونے کے برابر ہوا ہونا اپنا
ایک یہ بزم ہے لے دے کے ہماری باقی
ہے انہیں لوگوں کی ہمّت پہ بھروسا اپنا
داستاں درد کی لمبی ہے کہیں کیا تجھ سے
ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنا تجھ سے

قوم کو جس سے شفا ہو، وہ دوا کون سی ہے؟
یہ چمن جس سے ہَرا ہو وہ صبا کون سی ہے؟
جس کی تاثیر سے ہو عزّتِ دین و دنیا
ہائے اے شافعِ محشر! وہ دوا کون سی ہے؟
جس کے قطرے میں تاثیر ہو یک رنگی کی

ہاں بتا دے وہ مئے ہوش رُبا کون سی ہے؟
قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا
ناقہ وہ کیا ہے؟ وہ آوازِ درا کون سی ہے؟
تیرے قربان کہ دکھا دی ہے یہ محفل تُو نے
میں نے پُوچھا جو ''اخوت کی بنا کون سی ہے؟''
راہ اِس محفلِ رنگیں کی دِکھا دے سب کو
اور اِس بزم کا دیوانہ بنا دے سب کو

''زاہدِ تنگ نظر'' اور ''یہ نصاریٰ کا خدا'' والے اشعار میں ظاہر ہے کہ عبدالکریم سیالکوٹی کی طرف اشارہ تھا۔

12

''شعر کہنے کی کیفیت کو... جنسی تحریک سے بھی مماثل قرار دیا جاسکتا ہے۔'' اقبال نے کہا۔ ''اور حالتِ حمل سے بھی۔ جب تک میں اِس کیفیت کی تکمیل میں اشعار نہیں کہہ لیتا، مجھے سکون مہیّا نہیں ہوتا۔ اور وہ سکون (جب ملتا ہے) تکان اور ماندگی لئے ہوئے ہوتا ہے۔'' (۵)

معلوم ہوتا ہے کہ طویل نظم کو اختتام تک پہنچانا اقبال کے لیے فطری طور پر مُشکل ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اُن کی تخلیقی صلاحیت شعلۂ جوالہ کی مانند تھی۔ ممکن ہے کہ نظم کا نقطۂ عروج آنے سے پہلے اُن کا تخلیقی تجربہ اپنے نقطۂ عروج سے دوچار ہوجاتا ہو۔ ابرِ گہر بار'' اس کی سب سے واضح مثال ہے۔ اس نظم کا اختتام اس کے نقطۂ آغاز اور اس کی شاندار اُٹھان سے کسی طرح ہم آہنگ نظر نہیں آتا۔ بعد کی نظموں میں یہ خامی بتدریج کم ہوتی نظر آتی ہے مگر ان کا بغور مطالعہ کرنے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظم کے اختتام کو شاندار بنانے کے لئے اقبال کو شعوری توجہ مبذول کرنی پڑتی ہوگی۔

13

اگلی شام اقبال نے ابرِ گہر بار کتابت کے لئے دے دی۔

14

۲۸ فروری کو پنجۂ فولاد میں اقبال کا کھلا خط امیرؔ مینائی کے شاگردوں اور احباب کے نام شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اتنے بڑے شاعر کی کوئی سوانح ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے لہذا وہ خود اس کام کا عزم کرتے ہیں۔

''......اس لئے چند باتیں حضرت امیرؔ کے تلامذہ اور دیگر واقف کاروں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں!

(۱) حضرت امیرؔ مینائی کی کوئی ایسی بات جس نے اُن کی زندگی یا شاعری پر کوئی خاص اثر کیا ہو۔

(۲) اُن کے زبانی مقولے

(۳) اُن کے بچپن کی بعض باتیں جن سے اُن کی آئندہ عظمت کا پتہ چلتا ہو۔

(۴) اُنہوں نے کس کس مقام کا سفر کیا اور کیوں؟

(۵) کس کس اُستاد سے کیا کیا حاصل کیا؟

(۶) اُن کی عام عادات۔

(۷) چند ایک مشاعروں کی مفصل کیفیت۔

یہ جتا دینا ضروری ہے کہ یہ مضمون انگریزی میں لکھا جائے گا اور ولایت کے کسی مشہور اخبار یا رسالے میں چھپوایا جائے گا۔''

15

یکم مارچ کو انجمن کا اجلاس ہوا۔ بعض لوگوں کے لئے یہ بات غیر متوقع رہی ہوگی کہ اقبال جنہوں نے پہلے معذرت کر لی تھی، اب اپنی نئی نظم لکھ کر لائے ہیں اور اس کی کاپیاں بھی ہمراہ ہیں... ''ابرِ گہر بار یعنی نعتِ عاشقانۂ جناب سرورِ کائنات و فریادِ اُمّت برآستانۂ آں ذاتِ بابرکات۔''

بعض بند غلط ترتیب میں چھپ گئے تھے اور جلدی میں کتابت کی غلطیاں بھی دور نہیں کی جا سکی تھیں۔ ''طور پر تو نے جو اے دیدۂ موسیٰ دیکھا'' میں غلطی سے ''حضرتِ موسیٰ'' لکھا ہُوا تھا۔ مگر یہ نظم انجمن کے جلسوں میں پڑھی جانے والی پچھلی نظموں سے بھی زیادہ پسند کی گئی۔

یہ نظم اقبال کی بعد کی نظموں کے مقابلے میں ناپختہ سہی مگر اس میں غالب کے تغزل، امیر مینائی کے

تصوف اور حالی کے سماجی تجزیے کا امتزاج دلکش تھا۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں نوجوان اقبال کے حالی جیسے بزرگوں سے موازنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر جس نفسیاتی تجربے سے ''ابرِ گہربار'' دوچار کرتی تھی وہ اس نظم کو مسدس حالی سے الگ ایک اور حیثیت دیتا تھا۔

یہ اقبال کی اپنی اُفتادِ طبع کا نتیجہ تھا جس کے تحت وہ اپنے نفس کی شدید ترین خواہشات کا رُخ موڑ کر اُن کی قوّت سے شعر کہنے کا تجربہ کرتے تھے۔

16

امیر بیگم تو محض بہانہ تھیں۔ اقبال جس حُسن کی مستی سے سرشار تھے وہ خود اُنہی میں تھا مگر اس تجربے کے بعد اُن کے سامنے آیا تھا۔

نظر جب سے تیری نظر سے ملی ہے
جسے دیکھتا ہوں، وہی خُوب رُو ہے
خودی نے عطا کی، مجھے خودشناسی
مرا حُسن دائم مِرے روبرو ہے
نمایاں ہے کثرت میں وحدت کا جلوہ
جدھر دیکھتا ہُوں وہی رُوبرُو ہے

17

انہی دنوں سیالکوٹ جانا ہوا۔ رئیس آغا باقر کے بیٹے محمد ناصر خاں کے ختنے کی تقریب میں کسی نے امیر مینائی کے دیوان ''صنم خانۂ عشق'' میں سے ایک طرح مصرع نکال کر محمد ناصر خاں کا سہرا لکھنے کی فرمائش کی۔ اقبال نے فی البدیہہ ۱۱۹ اشعار کی غزل کہہ دی۔

18

مارچ کے مخزن میں ''بُلبُل کی فریاد'' شائع ہوئی۔

19

اپریل میں ناصر خاں کا سہرا مخزن میں شائع ہُوا۔

لڑکپن کے ہیں دن، صُورت کسی کی بھولی بھولی ہے

زباں میٹھی ہے، لب ہنستے ہیں، پیاری پیاری بولی ہے

اسی مہینے ''ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی'' والی غزل مخزن ہی میں شائع ہوئی۔

20

۱۹ اپریل کو اورینٹل کالج میں نئے پرنسپل صاحب مقرر ہوئے اور آرنلڈ دوبارہ گورنمنٹ کالج کے شعبۂ فلسفہ کے ہو رہے (۶)۔ توقع تھی کہ وہ ایک دفعہ پھر اِقبال کو وہاں بُلوا لیں گے۔

21

لاہور میں کوئی نوازش صاحب رہتے تھے۔ اقبال ان کے یہاں گرامی اور کسی بسمل کے ہمراہ بیٹھے تھے کہ دردِ قولنج کی تکلیف محسوس ہوئی جو انہیں اب کبھی کبھی محسوس ہونے لگی تھی۔ میزبان عجیب ستم ظریف تھا کہ ایک مصرع پڑھا جس کی ردیف ''اہلِ درد'' تھی۔ پھر فرمائش کر دی کہ اس پر کچھ اشعار کہے جائیں۔ اقبال نے ''اہلِ درد'' کے عنوان سے اکتیس اشعار کا دوغزلہ کہہ ڈالا (۷)۔

22

انجمن کے جلسوں کی وجہ سے اقبال کے دوستوں میں کچھ نئے اضافے بھی ہُوئے تھے۔ اِنہی میں سے ایک نواب حبیبُ الرحمٰن شیروانی تھے، اپنے عہد کے مشہور علم دوست اور محقق۔ دوسرے غلام قادر گرامؔی تھے، جالندھر کے لااُبالی اور مخبوط الحواس فارسی شاعر۔

گرامی صاحب غالباً اقبال کی فرمائش پر اس مرتبہ لاہور ہی میں ٹھہر گئے اور اُنہی کے گھر قیام کیا۔ اُن کی بیوی جن کا نام بھی اقبال تھا اور تُرک تخلّص کر کے شعر کہتی تھیں اپنے شوہر کا انتظار ہی کرتی رہ گئیں۔

گرامؔی اقبال کے اشعار کی داد دیتے رہے۔

امیرؔ بیگم اکثر ان محفلوں میں شریک ہو جاتی تھیں۔

حشر کو مانتا ہوں بِن دیکھے
ہائے ہنگامہ اُس کی محفل کا

اقبال میں چھپا ہوا شاعر جو ہمیشہ ان کے اندر بیٹھے طالب علم سے دبتا رہا تھا، اب غالب ہو گیا۔ اُن دنوں وقت کا کوئی لحظہ خالی نہیں جاتا تھا جب وہ اپنے پُرانے خواب کی تعبیر کے لئے متفکر نہ ہوں۔ ملٹن کی تقلید میں ایک طویل نظم لکھنے کا خواب! (۸)

23

شائد یہ اقبال کی زندگی کا بہترین مہینہ تھا۔

۱۱ مارچ کو عید تھی۔ بارش ہوئی اور بے فکرے دوست گھر میں جمع ہو گئے۔ شاعری کا دور چلا۔ ایسے میں خیال آیا کہ امیر بیگم کے بغیر عید کیا ہو گی۔ فوراً عبدالقادر یا کسی اور دوست کو اُس کی طرف دوڑایا۔ اُس پہ بن آئے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے!

انتظار کے عالم میں حبیب الرحمٰن شیروانی کا نام لے کر کاغذ کھینچا اور قلم اٹھا کر خط لکھنے بیٹھ گئے۔

''......آج عید کا دن ہے اور بارش ہو رہی ہے۔ گرامی صاحب تشریف رکھتے ہیں اور شعر و سخن کی محفل گرم ہے۔ شیخ عبدالقادر ابھی اُٹھ کر کسی کام کو گئے ہیں...اور ابرِ گہر بار کی اصل علت کی آمد آمد ہے۔ ملٹن کی تقلید میں کچھ لکھنے کا ارادہ مدّت سے ہے...''

جب کچھ اور لکھنے کو نہ رہا تو وہ خط میں اپنی نظمیں درج کرنے لگے۔ ''بلُبل کی فریاد'' اُن کی نئی نظم تھی۔ ولیم کوپر کی انگریزی نظم سے جُزوی طور پر ماخوذ، وہ لکھی۔ اس قسم کی صحبتیں اُن دنوں روزانہ کا معمول تھیں اور وہ خوب موج میں تھے۔

ایک دن مشن کالج کے پرنسپل حاکم علی کا نوکر کسی کام سے اُن کے پاس آیا۔ ہوشیار پور کا رہنے والا اور اقبال ہی کے الفاظ میں بالکل ''جانگلو''! اس کا نام علی بخش تھا۔

نہ جانے اُس کی کیا بات اقبال کو اچھی لگی کہ اُس سے پنجابی میں کہا۔ ''تم ہمارے پاس اچھے رہو گے۔'' وہ خوش ہوا مگر حاکم علی کی ملازمت چھوڑنے کے لئے کچھ دنوں کی مہلت طلب کر لی (۹)۔

24

ناصر کا سہرا اور اقبال کی ایک اور غزل ''تو نہاں مجھ سے میرے داغِ جگر کی صورت'' مخزن کے مئی کے شمارے میں شائع ہوئیں۔ یہ غزلیں اُس معیار سے بہت پست ہیں جو وہ اُس وقت تک اپنے لئے بنا چکے تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ''ہمالہ'' اور ''ابرِ گہر بار'' کے بعد انہوں نے مخزن میں ان کی اشاعت کس طرح گوارا کی۔ اس کا جواب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ اُن کے اندر کا شاعر اُن دنوں کافی بیتاب تھا۔

25

۳ جون کو آرنلڈ نے اقبال کو گورنمنٹ کالج کے شعبۂ فلسفہ میں عارضی پروفیسر مقرر کروالیا (۱۰)۔

26

عطا محمد اُن دنوں برٹش بلوچستان میں ایس ڈی او تھے۔ انگریز میجر انجینئر سے جھگڑا کر بیٹھے۔ اُس نے کسی دیسی مُلازم کو ساتھ ملا کر، جو پہلے ہی ان سے پُرخاش رکھتا تھا، سازش کی اور ایک دن اہلِ خانہ کو یہ اطلاع ملی کہ عطا محمد اسٹور سے مال خورد بُرد کرنے پر حراست میں لے لیے گئے ہیں۔ (۱۱)

اقبال نے سُنا تو بے چین ہوگئے۔ فوراً دوستوں کی محفل اُٹھا دی اور سامان باندھا۔ عام حالات میں سفر کے تصور سے بھی ان کے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے تھے مگر یہ معاملہ عطا محمد کا تھا۔ ٹرین پر بیٹھ کر بلوچستان پہنچ گئے۔ یہ راستے کا آسان ترین حصّہ تھا۔ قلعہ سنڈیمن پہنچنے کے لئے جہاں عطا محمد تھے، ابھی کوئی مزید سو میل کا سفر گھوڑے اور اونٹ پر طے کرنا تھا!

اِس سفر میں اقبال کو پوری طرح اندازہ ہوا کہ امیر نے اُن کی زندگی میں کیا اہمیت حاصل کر لی ہے۔ دُور ہونے سے کشش کم نہیں ہوئی تھی، کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

از مقام مغل کوٹ

ڈیر سیّد تقی۔ السّلام علیکم... خدا کی پناہ! پہلے روز ۳۷ میل کا سفر گھوڑے پر کیا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی لیکن جو تکلیف محبت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو وہ لذیذ ہو جاتی ہے... بھائی صاحب کے متعلق خبر ملی۔ ان کو رائل انجینئر کوئٹہ کے تار پر تار دینے کی وجہ سے حراست سے نکال دیا ہے...

امیر کہاں ہے، خُدا کے لئے وہاں ضرور جایا کریں۔ مجھے بہت اضطراب ہے۔ خدا جانے اس میں کیا راز ہے۔ جتنا دُور ہو رہا ہوں۔ اُتنا ہی اُس سے قریب ہو رہا ہوں۔ والسّلام۔

شیخ صاحب [عبدالقادر] کی خدمت میں یہ تمام حالات عرض کردیں۔ والسلام۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

27

دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا عُرس تھا۔ زائرین کے ہجوم میں ایک مجہول سا آدمی کھڑا نظم پڑھ رہا تھا۔ بال کمر تک لمبے تھے اور سینہ اتنا تنگ جیسے بارہ برس کا بچّہ ہو (۱۲)۔ یہ درگاہ کے توشہ خانے کے مہتمم خواجہ حسن نظامی تھے جن کا سلسلۂ نسب نظام الدین اولیاءؒ سے ملتا تھا۔ مشہور انشاپرداز تھے۔

اس وقت وہ جو نظم پڑھ رہے تھے اُس میں دہلی کے خواجہؒ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ شاعر کی مشکلیں آسان کردیں۔ شاعر نے کہا تھا کہ اُس کا بھائی جن مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے نظام الدین اولیاء اپنی برکت سے اُنہیں دُور کردیں۔

یہ نظم، جس کا عُنوان ''برگِ گل'' تھا، حسن نظامی کو اقبال نے ارسال کی تھی (۱۳)۔

28

مکتوب بنام نواب حبیبُ الرحمٰن شروانی

از شہر سیالکوٹ

۱۶ اگست ۱۹۰۳ء

مخدوم ومکرم جناب قبلہ خان صاحب

السّلام علیکم

...خدا کے فضل سے اُس تشویش کا خاتمہ ہوا... بھائی صاحب بَری ہوئے۔ اگرچہ روپیہ کثیر صَرف ہوا تاہم شُکر ہے... ہم باقی رہ گئے اور ہماری مصیبت دشمنوں کی تلاش میں پھر بلوچستان کی طرف عُود

کرگئی...والسلام

آپ کا مخلص

محمد اقبال

29

اقبال اور شیخ عبدالقادر کے درمیان کبھی کبھی یہ بحث ہوتی تھی کہ یہ خواجہ حسن نظامی صاحب جوان ہوں گے یا بوڑھے۔ اقبال کا خیال تھا کہ عُمر رسیدہ آدمی ہوں گے (۱۴)۔

30

کوئٹہ سے واپسی کے بعد اقبال اور امیر کی پہلی ملاقات کا کوئی احوال اب موجود نہیں ہے ورنہ یہ معلوم ہوتا کہ سفر کی دُوری نے جس قُربت کو بڑھایا اُس نے اگلی ملاقات میں کن رنگوں کا اضافہ کیا۔ محبت کے کون سے نئے اسرار سامنے آئے!

صرف ایک غزل ہے جس میں استعاروں کے دبیز پردوں کے پیچھے سے کسی دل کی ہلکی ہلکی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔

غزل

عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا
مجھے پی کے تھوڑی سی مخمور رہنا

تمھیں میں بتاؤں محبت ہے کیا شے
یہ ہے دل کے ہاتھوں سے مجبور رہنا

دِکھاوے کی بے اعتنائی کے صدقے
بڑے کام آیا، مرا دُور رہنا

وہ سَو ناز اقبالؔ پر کر رہے ہیں
زمانے میں ہے اُن کو مشہور رہنا

مخزن۔ اگست ۱۹۰۳ء

31

اب اقبال کی شہرت شمالی ہندوستان سے نکل کر دُور دُور پھیل چکی تھی۔ اور مدت سے دکن میں مقیم اُستاد داغؔ اکثر اس بات پر فخر کرتے ہوئے پائے گئے تھے کہ یہ نیا شاعر کبھی ان سے بھی اصلاح لے چکا ہے۔

دکن کے شاعر نادرؔ کاکوروی کبھی اُن سے ملے نہیں تھے مگر اُن کے مشتاق تھے۔

اگست میں ''خدنگ نظر'' (لکھنؤ) میں اقبال کی ایک غزل اکیس اشعار کی شائع ہوئی جس کا مطلع تھا

پاس والوں کو تو آخر دیکھنا ہی تھا مجھے
نادرِ کاکوروی نے دُور سے دیکھا مجھے

اگست ہی میں حسرتؔ موہانی کے رسالے ''اُردوئے معلّٰی'' میں ایک مضمون ''اُردو زبان پنجاب میں'' شائع ہُوا۔ اس میں لکھنے والے کے نام کی جگہ ''تنقیدِ ہمدرد'' چھپا تھا مگر خیال یہ ہے کہ اسے خُود حسرتؔ موہانی نے لکھا تھا۔

مضمون نگار نے خوشی محمد ناظرؔ اور اقبال کی شاعری کی زبان پر اعتراضات کئے تھے اور آخر میں کہا تھا کہ خلافِ محاورہ زبان کے رواج سے بہتر ہے کہ اُردو زبان کا پنجاب میں فروغ ہی نہ ہو(۱۵)۔

32

ہر صبح قرآن پڑھتے ہوئے تاریخ اور قبل از تاریخ کے پراسرار واقعات اقبال کی آنکھوں کے سامنے آجاتے تھے۔

آدمؑ کو بنانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک امانت کائنات کی ہر شے کے سامنے رکھی مگر کسی نے اس بوجھ کو اُٹھانے کی ہمت نہ کی۔ پھر اسے آدم نے قبول کیا۔ وہ بوجھ کیا تھا؟

قُرآن میں یہ بھی تھا کہ آدم نے اللہ سے فرمانبرداری کا عہد کیا تھا اور اس کے بعد نافرمانی کر کے اُس شجر کے قریب چلے گئے تھے جو ممنوعہ تھا۔ سر سیّد کا خیال تھا کہ اُس شجر پر عقل وشعور کے پھل لگتے تھے جیسا کہ بائبل میں درج تھا۔ اور اقبال کے نزدیک اس واقعے میں سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ یہ قدم اُٹھانے سے اگرچہ انسان اپنے صحیح مقام، یعنی زمین پر پہنچ گیا، جہاں کا اللہ نے اُسے خلیفہ بنایا تھا۔ مگر ساتھ ہی وہ اپنے خالق کے دیدار کی نعمت سے محروم ہوگیا، جو غالباً باغِ جنت میں اُسے میسر تھی۔ شیخ نُور محمد

کبھی کبھی کہتے تھے۔ ''نہ جانے بندہ اپنے ربّ سے کب کا بچھڑا ہُوا ہے۔'' اور پھر اُن کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔(۱۶)

موسیٰ کا خدا سے کہنا ''اَرِنی'' (تجھے دیکھوں گا) اور خُدا کا کہنا ''لَن ترَانی'' (تم نہیں دیکھ سکتے) ...اس مکالمے میں اقبال کو عاشق اور معشوق کی شوخیاں دکھائی دیتی تھیں اور شاید یہ واقع پڑھتے ہُوئے اُنہیں اُستاد داغ کی غزل کا مزہ آجاتا ہو۔

محمدؐ، علیؓ اور حسینؓ اس پوری داستان میں سب سے بڑے کردار دکھائی دیتے تھے۔ محمدِ عربیؐ تو خیر صاحبِ لولاک تھے، جن کی خاطر یہ دُنیا بنائی گئی۔ نُور تھے، اوّل تھے، آخر تھے۔ مگر اُس زمانے میں علیؓ کے مُعاملے میں اقبال کسی شیعہ سے کم نہ تھے اور غزل کے اکثر اشعار کی اس قسم کی باتوں پر تان ٹوٹتی تھی کہ ''پیاس رُوح کی بجھتی ہے اِس نگینے سے۔'' ان کا خیال تھا کہ رسول اللہ نے حضرت علیؓ کو ایک خُفیہ علم عطا کیا تھا۔

مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ اقبال کی نظر میں پوری تاریخ دو متضاد قوتوں کے درمیان کھنچاؤ کی داستان تھی۔ ایک طرف عقل تھی، جو انسان کو ترقی کی راہ پر دوڑاتی تھی اور اُسے سمجھاتی تھی کہ اُس نے شجرِ ممنوعہ کے پاس جا کر کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ اس دنیا ہی میں اپنی جنت بنا سکتا ہے۔ یہاں بیٹھ کر بھی خُدا کو سمجھ سکتا ہے۔ دوسری طرف دل تھا، جسے اپنی چھوڑی ہوئی منزل یاد تھی، اور وہ اُس محبوب کے وصال کی لذّت طلب کرتا تھا جسے اس نے ایک لمحے کی بھول میں اپنے سے دور کر لیا تھا۔ یہ دل نافرمانی پر افسوس کرتا تھا۔

انسان اور بزمِ قدرت

صبح، خورشیدِ درخشاں کو جو دیکھا مَیں نے
بزمِ معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا میں نے
گُل و گلزار ترے خُلد کی تصویریں ہیں
یہ سبھی سورۂ والشّمس کی تفسیریں ہیں
نُور سے دُور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں
کیوں سیہ روز، سیہ بخت، سیہ کار ہوں میں؟

میں یہ کہتا تھا کہ آواز کہیں سے آئی
بامِ گردوں سے و یا صحنِ زمیں سے آئی
''انجمن حُسن کی ہے تُو تری تصویر ہوں میں
عِشق کا تُو ہے صحیفہ، تری تفسیر ہوں میں
میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تُو نے
بار جو مجھ سے نہ اُٹھا وہ اُٹھایا تُو نے
ہائے غفلت ! کہ تری آنکھ ہے پابندِ مجاز
ناز زیبا تھا تجھے، تُو ہے مگر گرمِ نیاز
تُو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر، نہ سیہ کار رہے

مخزن۔ ستمبر ۱۹۰۳ء

معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال اُنہوں نے عرب صُوفی نسافی کے مطالعے سے حاصل کیا تھا جس کے نظریات کو انہوں نے کوئی تین سال بعد جو مقالہ کیمبرج یونیورسٹی میں لکھا، اُس میں بھی بیان کیا۔ ''حُسن ازل، جسے حقیقتِ اصلی کہنا چاہیئے، لامحدود ہے...فطرت ایک آئینہ ہے جس میں اُس (حُسن) کی جھلک نظر آتی ہے۔'' مگر نسافی کے نزدیک آئینہ بھی دو طرح کا ہوسکتا ہے۔ ایک وہ جو محض حسن کا عکس پیش کرتا ہے۔ یہ گویا بزمِ قُدرت ہے۔ دوسری طرح کا آئینہ حسن کے باطنی جوہر کو بھی محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ انسان ہے۔ انسان اُس لامحدود ہستی کی ایک محدود صُورت ہے مگر بھول کر خود کو اُس سے الگ سمجھ بیٹھتا ہے۔ (۱۷)

اقبال کے ذہن کو سمجھنے کے لئے یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ عرب کے ساتھ اُن کا صرف مذہبی یا تاریخی ہی نہیں بلکہ ثقافتی رشتہ بھی زندہ اور پائیدار تھا۔ اوائل جوانی ہی سے وہ بالکل اُسی طرح عربی شاعروں کے اشعار میں اپنے ہجر اور وصال کی کیفیات ڈھونڈتے آئے تھے جس طرح اُردو اور فارسی کے دوسرے شاعروں کے اشعار میں۔ ممکن ہے کہ اُن دنوں کالج کی تدریسی مصروفیات کے سبب یا اپنے میلانِ طبع کی وجہ سے اُنہوں نے دوبارہ عربی ادبیات کا مطالعہ کیا ہو۔ کیونکہ ستمبر ہی میں ''خدنگِ نظر'' (لکھنؤ) میں اُن

کی نظم ''شیشۂ ساعت کی ریگ'' شائع ہوئی جس میں ریت کو صحرائے عرب کی ریت قرار دے کر اُس سے کہا گیا تھا کہ وہ ہجرتِ اسماعیل، ہجرتِ مُوسیٰ، مصائب مریم، ہجرتِ رسولؐ اور واقعۂ کربلا کی شاہد ہے:

تُو گردِ پا ہے شائد بصرہ کے زائروں کی
بانگِ درا سے تیرا ہر ذرّہ ہے شناسا
طرزِ نفس شماری، شیشے سے تُو نے سیکھی
جاسوس بن گئی تُو اقلیمِ زندگی کی

33

۲۸ ستمبر کو پنجۂ فولاد میں اُن کی ایک اور نظم ''دردِ عشق'' شائع ہوئی۔ اِس کے اکیس اشعار تھے مگر مطلب کچھ زیادہ واضح نہ ہوتا تھا سوائے اِس کے کہ زمانہ مروّت کے راہ و رسم بھلاتا رہا ہے۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والی تعصب کی فضا کے بارے میں یہ اقبال کا دبا دبا ردِّ عمل تھا، جو آئندہ مہینوں میں اور واضح ہوتا گیا۔

34

''اُردو زبان پنجاب میں'' نے اچھا خاصا معرکہ گرم کر دیا تھا۔ میر غلام بھیک نیرنگ نے ''انبالوی'' کے نام سے اس کا جواب لکھا، جو شائد ستمبر میں کہیں شائع ہوا۔

اگر کوئی اور دِن ہوتے تو اقبال شائد اس بحث میں نہ پڑتے۔ مگر یہ وہی زمانہ تھا کہ اُن کا شاعری کا جوش اپنے پورے عروج پر تھا۔ چنانچہ وہ اساتذہ کے کلام سے اپنے دفاع میں اسناد تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے۔

35

علی بخش کو اقبال کی پیشکش یاد تھی۔ اُس نے گاؤں سے اپنے بھائی کو بلوا کر حاکم علی کے گھر نوکر رکھوا دیا اور خُود اقبال کے پاس آ گیا۔ اقبال کے معمولات کو سمجھنے میں اُسے کچھ وقت لگا۔

ان کی طبیعت کچھ اس طرح کی تھی کہ وہ اپنے گردو پیش کی دُنیا سے زیادہ اپنے ذہن میں رہتے تھے۔ بہت سی سرگرمیاں تھیں جنھیں سچ مچ انجام دینے کی بجائے فقط سوچ کر ہی ان کی تسکین ہو جاتی

تھی۔ چنانچہ ہلنا جُلنا بے حد ناگوار گزرتا تھا اور کوشش کرتے تھے کہ اپنی جگہ سے ہلے بغیر سارے کام کروا لیں۔ ایک زمانے میں ذرا پہلوانی کا شوق رہا تھا اور اکھاڑے میں لنگوٹ کس کر ورزش کرتے تھے مگر اب شائد وہ مشغلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ بس ہر روز صبح سویرے اُٹھ کر فجر کی نماز ادا کرنا اور پھر تلاوت کرنا ایک ایسا معمول تھا جسے وہ کبھی ترک نہیں کرتے تھے۔

کالج سے واپس آنے کے بعد گرمیوں میں دھوتی اور بنیان پہن لیتے تھے۔ سردیوں میں اس پر کشمیری دُھسّے کا اضافہ ہو جاتا تھا، اور بس! گھر میں زیادہ تر وقت آرام کُرسی میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتے گزرتا اور ایسے میں علی بخش کا کام یہ ہوتا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُن کا حقّہ تازہ کرتا رہے اور تمبا کو ختم ہو جائے تو نظام دین کے کھیت کا تمبا کو لا کر ذخیرہ بحال کرے۔

شام کو اُن کے یہاں دوستوں کی آمد ہوتی تھی اور وہ اُسی آرام کرسی میں پڑے پڑے اُن سے باتیں کرنے لگتے تھے۔ ایسے میں علی بخش کو ان کے کمرے سے قہقہوں کی آوازیں آتی تھیں۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہاں کوئی علمی گفتگو ہو رہی ہے اور ویسے علمی گفتگو کا مطلب وہ جانتا بھی نہیں تھا۔

کبھی اقبال اپنے کسی دوست کو بھیج کر امیر بیگم کو بلوا لیتے تو پھر ساز و نغمہ کی آوازیں بلند ہونے لگتیں۔

دلبرِ جانانِ من، برد دل و جانِ من
برد دل و جانِ من، دلبرِ جانانِ من
حافظ

یہ علی بخش کی سمجھ سے اونچی باتیں تھیں۔ اُسے تو کھانا پکانا بھی نہیں آتا تھا۔ کہیں سے آلو گوشت کا سالن پکانا سیکھ لیا تھا، اور مسلسل کئی مہینے وہ اقبال کو یہی کھلاتا رہا اور وہ بھی چپ چاپ زہر مار کرتے رہے کیونکہ جب تک آم دسترخوان پر موجود ہوں وہ کسی دوسری چیز کی کمی محسوس نہیں کر سکتے تھے۔

رات کو سوتے ہوئے وہ بڑے بھیانک خراٹے لیتے جو کبھی کبھی اچانک رُک جاتے اور ایک طویل ہانک سُنائی دیتی۔ ''علی بخش! کاغذ پنسل لے آؤ۔'' یہ دوڑ کر دونوں چیزیں لے جاتا۔ اقبال روشنی کرتے، جس میں بس اتنا نظر آتا کہ اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا ہے اور اُنہیں کسی دوسرے کے وجود کا احساس نہیں رہا۔ وہ تیزی سے کچھ لکھے چلے جا رہے ہیں۔ علی بخش، جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا، ایک عرصے تک یہ نہ سمجھ سکا کہ صاحب کو آدھی رات کے وقت یہ کیسا دورہ پڑتا ہے اور وہ اس کا علاج کیوں نہیں کروا لیتے (۱۸)۔

غزل

کہوں کیا، آرزوئے بے دِلی مجھ کو کہاں تک ہے؟
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے
زمانے بھر میں رُسوا ہُوں مگر اے وائے نادانی
سمجھتا ہُوں کہ میرا عِشق میرے رازداں تک ہے

مخزن۔ اکتوبر ۱۹۰۳ء

36

شیخ عبدالقادر ''اردو زبان پنجاب میں'' والی بحث کو ''ناگوار'' قرار دیتے تھے مگر جب اقبال نے جوابی مضمون لکھ لیا تو اُنھوں نے مخزن کے اکتوبر کے پرچے میں اِس نوٹ کے ساتھ شائع کر دیا کہ ''جس تحقیق سے شیخ محمد اقبال صاحب نے کام لیا ہے، وہ قابلِ داد ہے اور اِسے اس بحث کا خاتمہ سمجھنا چاہیئے۔'' (۱۹)

اقبال نے تنقیدِ ہمدرد کے آٹھ اعتراضات کے خلاف اپنے دفاع میں اساتذہ کے کلام سے استناد کیا تھا۔ البتہ ''مجھ کو'' کی بجائے ''میں نے'' کے استعمال کو اپنی بے دھیانی کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے اعتراض تسلیم کیا تھا۔

اِس مضمون میں فارسی اور اُردو کے ۲۳ اساتذہ کے کلام سے دلائل تلاش کیے گئے تھے اور ساتھ میں حسرت موہانی کے ایک شعر کا بھی حوالے دے دیا تھا۔ اساتذہ کے نام یہ تھے۔ امیر مینائی، مومن، مصحفی، سودا، میر تقی میر، داغ، بہادر شاہ ظفر، عبدالوہاب، نساط شیرازی، ناسخ، فردوسی، سعدی، فوقی ریزدی، نظامی، غالب، امیر اللہ تسلیم، برق، انیس، شیخ علی حزیں، آتش جلال لکھنوی، ممنون دہلوی، ملول لکھنوی اور بیدل۔

مضمون کے آخر میں اقبال نے لکھا تھا۔

اگر اہلِ پنجاب مجھ کو یا حضرت ناظر کو بہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں تو اُن کی غلطی ہے۔ زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی دشوار گزار وادی ہے کہ یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ

ہے۔قسم بخدائے لایزال مَیں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اِس قسم کی ہوتی ہے کہ میں باوجود اپنی بے علمی اور مائیگی کے شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں ورنہ مجھے زبان دانی کا دعویٰ ہے نہ شاعری کا۔"

37

Love and death

What time the mighty moon was gathering light
Love paced the thimey plots of paradise...

اگرچہ اس نظم کا شمار ٹینی سن کی کمزور نظموں میں ہوتا ہے مگر شائد اس کی ابتدا نے اقبال کے تخیّل کو مہمیز کیا ہوگا۔ چنانچہ عشق اور موت کی اس حکایت کو انہوں نے نظم کیا جس کے مطابق روزِ ازل عشق کی مسکراہٹ نے موت کا خاتمہ کر دیا تھا۔روزِ ازل کا نقشہ کھینچنا بھی آئندہ زندگی میں اُن کا مخصوص موضوع بن گیا۔

سُہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی
کہ خود ناخوشی مستِ جامِ خوشی تھی

''عشق اور موت''۔مخزن، نومبر ۱۹۰۳ء

38

پنجاب کا علاقہ بہاولپور اُن دنوں ریاست تھا جہاں کے نواب انگریزوں کی سرپرستی میں حکومت کیا کرتے تھے۔۱۲ نومبر کو اس علاقے کی دھج دیکھنے والی تھی۔نوابزادہ مبارک بالغ ہوگیا تھا اور وائسرائے ہند لارڈ کرزن خُود اپنے ہاتھوں سے اُسے تاج پہنانے تشریف لا رہے تھے۔دُور دُور کے مشاہیر کو دعوت نامے بھیجے گئے۔انجمن حمایت اسلام کے توسط سے ایک دعوت نامہ اقبال کو بھی ملا تھا۔(۲۰)

۱۲ نومبر کو شیخ عبدالقادر جشن میں شریک ہوئے، کیونکہ صحافی ہونے کی حیثیت میں اُنہیں تو وہاں موجود ہونا ہی تھا۔البتہ ان کے ذمّے یہ پیغام بھی تھا کہ اقبال اپنی مصروفیات کی وجہ سے شریک نہ ہونے پر معذرت چاہتے ہیں اور ایک قصیدہ مکمّل کر رہے ہیں جسے بہت جلد ''مخزن'' میں شائع کرکے نواب صاحب کے حضور پیش کیا جائے گا۔

لاہور واپس پہنچ کر شیخ عبدالقادر نے اقبال کو بتایا کہ وہاں حسن نظامی بھی آئے تھے اور وہ بالکل

جوان آدمی ہیں۔ اُن کے ہم عُمر ہوں گے۔ اقبال کا اندازہ غلط تھا۔ (۲۱)

''مخزن'' کا نومبر کا شمارہ تاخیر سے شائع ہوا مگر اُس میں اقبال کا قصیدہ موجود تھا۔ بظاہر اسے لکھنے میں قصیدے کی روایت کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ مگر اقبال غالب کی پیروی سے یہاں بھی باز نہ آئے بلکہ انہوں نے ایک قدم آگے نکل کر قصیدے کا اختتام دعائیہ کرنے کی بجائے اپنی شعر گوئی کی تعریف میں کیا تھا!

ایک خاص بات یہ تھی کہ نواب بہاول پور کو عباسی خاندان سے ہونے کا دعویٰ تھا۔ چنانچہ اقبال نے اس قصیدے میں دُعا کی

سامنے آنکھوں کے پھر جائے سماں بغداد کا
ہند میں پیدا ہو پھر عباسیوں کی سرزمیں
صُلح ہو ایسی، گلے مل جائیں ناقُوس و اذاں
ساتھ مسجد کے رکھے بُت خانۂ آذر، زمیں
نامِ شاہنشاہِ اکبر زندۂ جاوید ہے
ورنہ دامن میں لیے بیٹھی ہے سو قیصر، زمیں
بادشاہوں کی عبادت ہے رعیّت پروری
ہے اِسی اخلاص کے سجدے سے قائم ہر زمیں

39

ان دنوں اقبال کی شاعری میں ایک خاص ذہنی انقلاب کے آثار ملتے ہیں۔ ابھی تک اُن کی شاعری میں جس فعل کا سب سے زیادہ ذکر ہوا تھا وہ شائد ''دیکھنا'' تھا۔ اب اُنہوں نے ''دکھانے'' کا ذکر کیا۔ یہ گویا اس بات کا احساس تھا کہ شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ جو کچھ خود دیکھے اُسے دوسروں کو بھی دکھائے۔

اُن کی نظم ''شاعر''، جس کا صحیح زمانہ معلوم نہیں مگر اندازاً اِسی دَور کی نظم ہے، اِس مسلک کا پہلا اعلان ہے اور ایک طرح سے اُن کی آئندہ شاعری کا دیباچہ بھی۔ یعنی شاعر، قوم کا ''دیدۂ بینا'' ہوتا ہے:

مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ

کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اقبال اُس نسل سے تھے جو سرسیّد کی تحریک کی پیداوار تھی۔ قومی شناخت سے اپنے آپ کو پہچاننا اور "قومی بھلائی" کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا اُس دَور میں شُرفاء کی تہذیب کا حصّہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک اقبال کی ملّی شناخت بھی پُختہ ہوچکی تھی۔ چاہے وہ عیسائی مبلغوں کا تدارک کرنے کی تجویز ہو یا کشمیری مسلمانوں کی تنظیم کی کوشش، اُن کا قلم اور اُن کی آواز اس میں ضرور شامل ہوتی تھی۔

40

مگر ذاتی سطح پر معاملہ دُوسرا تھا۔ وہ اپنے معاشرے کے بنائے ہوئے اصولوں کو قبول کرنے والا ذہن دُنیا میں لائے ہی نہیں تھے۔ جبری شادی نے غالباً ایک ایسا زخم لگایا تھا جس کی تکلیف وقت کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ بھاٹی دروازے کا اقبال اِس لحاظ سے ایک معمّہ ہے کہ اجتماعی سطح پر وہ جس قوم اور جس معاشرے کی بقاٗ چاہتا ہے انفرادی سطح پر اُسکی اخلاقیات کا مذاق اُڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

اقبال کی شخصیت کے اِس تضاد کو جس شخص نے پہلے پہلے محسوس کیا وہ اُن کے پڑوس میں رہنے والے ایک متّقی اور صُوفی منش بزرگ تھے (۴۲)۔ اُنہوں نے اقبال کے کسی شناسا سے اقبال کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی متضاد خصوصیات کا حوالہ دے کر شائد اس طرح کی کوئی بات کہی کہ یہ کسی نئے اسلام کی بُنیاد ڈال بیٹھے گا!

مولوی صاحب کی بات اقبال تک پہنچی تو اُنہوں نے خوب لُطف لیا ہوگا کیونکہ اپنے بارے میں اس قسم کی تنقید سُن کر اُنہیں ایک طرح کی تسکین ملتی تھی۔ ایک روز جب مولوی صاحب کہیں سے آرہے تھے اقبال (شائد ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ) اُن کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے۔

زُہد اور رندی

سُنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا

ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیلِ علی ہم نے سنی اس کی زبانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اُڑانی
کچھ عار اِسے حُسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ، ہمارے شُعرا کی، ہے پُرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رَمز کے اب تک نہ کُھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سُنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی
رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوّف کی، تو منصور کا ثانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہو گا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

اِک دن جو سرِ راہ ملے مجھ کو یہ حضرت
پھر چھِڑ گئی باتوں میں وہی بات پُرانی
مَیں نے یہ کہا، کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا زرہِ قُربِ مکانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جُدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اِس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

41

اسی ماہ ''فتنہ وعطر فتنہ'' (۲۳ دسمبر) میں اُن کی نظم ''پیامِ صُبح'' شائع ہُوئی جو امریکی شاعر لانگ فیلو کی نظم Daybreak سے ماخوذ ہے۔

42

''عقل کی انتہا کیا ہے؟''

''حیرت۔''

''اور عشق کی انتہا کیا ہے؟''

''عشق کی کوئی انتہا نہیں۔ عشق لاانتہا ہے!'' اقبال نے کہا۔ (۲۳)

''پھر آپ نے یہ کیا لکھا ہے: ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں!''

''دُوسرا مصرع بھی تو پڑھیے...''

غزل

ترے عِشق کی انتہا چاہتا ہُوں
مِری سادگی دیکھ، کیا چاہتا ہُوں

سِتم ہو، کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

چلو، مِل کے اقبال کے گھر کو ڈھونڈیں
کہ مَیں بھی اُسے دیکھنا چاہتا ہوں

مخزن، جنوری ۱۹۰۴ء

43

غالباً سردیوں کی چھٹیوں میں اقبال سیالکوٹ گئے۔ عطا محمد کے یہاں ایک اور لڑکا پیدا ہو چکا تھا

جس کا نام امتیاز رکھا گیا تھا۔

شائد امتیاز کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر اقبال نے چھینا ہوگا اور وہ چلایا ہوگا جس پر اُنہوں نے وہ نظم لکھی جس کا سبب اُن کے اِس بھتیجے کو بتایا جاتا ہے (۲۴)۔ اس نظم میں صاف ورڈز ورتھ کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔

میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حُسنِ ظاہری
کم نہیں کچھ، تیری نادانی سے نادانی میری

مخزن، فروری ۱۹۰۳ء

44

فروری کے ''اُردوئے معلیٰ'' میں جواب الجواب تنقیدِ ہمدرد کا ایک اور مضمون ''اِصلاحِ زبانِ پنجاب'' چھپا۔ اُنہوں نے اقبال کے دلائل تسلیم نہیں کیے اور لکھا کہ جو اسناد پیش کی گئی ہیں اُن سے اعتراض کا رد نہیں ہوتا۔ (۲۵)

دوسرا حصہ

45

سر سیّد کہہ گئے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلافات دن بدن نمایاں ہوتے جائیں گے' اور جو زندہ رہے گا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

اقبال زندہ تھے اور دیکھ رہے تھے۔ جنوبی ہند میں انقلابی رہنما بال گنگا دھر تلک نے شیوا جی کے تہوار منانے شروع کر دیئے تھے، جن پر مسلمانوں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُن کی تاریخ کا مضحکہ اُڑایا جا رہا ہے۔ آپس کے تناؤ کو جس چیز نے نقطۂ عروج تک پہنچایا، وہ دسمبر ۱۹۰۳ء میں انگریز حکمرانوں کا یہ اعلان تھا کہ وہ ہندو اکثریت کے صُوبے بنگال کو تقسیم کرنے والے ہیں۔

بنگال کی تقسیم کا مطلب یہ تھا کہ ایک صوبے کے دو ہو جاتے۔ مغربی بنگال کا صدر مقام کلکتہ ہوتا، جو برطانوی ہندوستان کا دارالحکومت بھی تھا۔ یہ صوبہ بدستور ہندو اکثریت کا رہتا مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک

مشرقی بنگال وجود میں آ جاتا، جس کا صدر مقام ڈھاکہ ہوتا اور اس صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی۔

اس اعلان کے ساتھ ہی ''احتجاج شروع ہو گیا جس کی شدّت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگلے دو مہینوں میں صرف مشرقی بنگال میں کم از کم پانچ سو احتجاجی اجلاس ہوئے... اندازاً پچاس ہزار کاپیاں ایسے پمفلٹوں کی تقسیم ہوئیں جن میں تقسیم کے خیال پر تنقید کی گئی تھی۔''

مگر یہ تنقید یا تو ہندوؤں کی طرف سے ہوئی تھی یا کانگریس کی طرف سے۔ وہ مسلمان جو سر سیّد کے نظریات کے پیرو تھے، وہ اس تنقید کے نتیجے میں سخت بے چین ہو گئے تھے۔ ''کیا ہندوستان ہمارا وطن نہیں ہے؟''

46

اس سوال کے جواب میں اقبال کی نظموں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جسے عموماً اُن کی حبُ الوطنی کی نظمیں کہا جاتا ہے اور جس کی ابتدائی جھلک ''دردِ عشق'' میں دکھائی دے چکی تھی۔ مگر ان کی زندگی کے اس دور میں اُن کے سیاسی رجحانات کے متعلّق شواہد اتنے کم ہیں کہ وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ صرف اتنی بات یقینی نظر آتی ہے کہ دو نظمیں اُنہوں نے تقریباً ایک ساتھ کہی ہوں گی۔ اِن میں سے پہلی نظم ہے ''بیراگ'' (رخصت اے بزمِ جہاں) اور یہ امریکی شاعر ایمرسن کی Good Bye سے ماخوذ ہے۔ یہ مخزن (مارچ ۱۹۰۴) میں شائع ہوئی۔ بظاہر اس میں شہر چھوڑ کر فطرت کی طرف پلٹ جانے کا ذکر ہے مگر بغور پڑھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ بزمِ جہاں سے شاعر کو جس بات کی شکایت ہے اُس میں اپنوں کے غیر ہو جانے کا شکوہ پیش پیش ہے۔

گو بڑی لذّت تری ہنگامہ آرائی میں ہے
اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے

اگر اس نظم کو اُس دوسری نظم کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے جو انہوں نے انہی دنوں کہی تھی تو مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ دوسری نظم کا عُنوان ''تصویرِ درد'' تھا۔

تصویرِ درد

عطا، ایسا بیاں مجھ کو ہُوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں
رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ، سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مُصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اُس کو، جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا، عہدِ کہُن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ قدرت ہے

کِیا رفعت کی لذّت سے نہ دل کو آشنا تُو نے
گُزاری عُمر پستی میں مثالِ نقشِ پا تُو نے
تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے بُرا تُو نے
ہوس، بالائے مُنبر ہے تُجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری، صُورت ہے اِک افسانہ خوانی کی

وہ حُسنِ عالم آرا تیرے دل میں جلوہ گستر تھا
غضب ہے، آسمانوں میں دِیا اُس کا پتا تُو نے

بیابانِ محبّت ، دشتِ غُربت بھی، وطن بھی ہے
یہ ویرانہ، قفس بھی، آشیانہ بھی، چمن بھی ہے
وہی اک حُسن ہے، لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا، بے ستوں بھی،کوہکن بھی ہے
اُجاڑا ہے تمیزِ ملّت و آئیں نے قوموں کو
مِرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے؟
''نمی گردید کوتہ، رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بُود بے پایاں، بہ خاموشی ادا کردم''

آخری شعر نظیری کا تھا، جسے اقبال نے اپنے فارسی شاعری کے وسیع مطالعے میں سے چُن کر یہاں رکھ دیا تھا۔اس کا مطلب تھا'' حکایت کبھی ختم نہ ہونے والی تھی؛ چنانچہ میں نے اس کو خاموش رہ کر ادا کر دیا۔''

شائد اس غیر واضح نظم کا یہی اختتام مناسب تھا۔ ۱۲۸ اشعار اور ۸ بند کی اس نظم میں تعصب کی مخالفت، حُسنِ ازل اور اپنی دیدہ وری کی تعریف کے مختلف موضوعات کی بھرمار تھی اور شاعر کے خیالات ان سب کے درمیان بھٹکتے پھر رہے تھے۔ مجموعی طور پر یہ کسی سیاسی سوچ کی عکاسی کرنے کی بجائے وحدت الوجود کا قول بن کر رہ جاتی ہے۔

دوسری طرف تغزل کے اعتبار سے یہ اُن کی اب تک پڑھی جانے والی لمبی نظموں میں سب سے زیادہ پختہ اور پُر وقار بھی تھی۔

اُن کا ارادہ اس نظم کو انجمن کے سالانہ جلسہ میں سُنانے کا تھا جو یکم اپریل سے ہونے والا تھا۔

47

پروفیسر آرنلڈ انگلستان واپس جا رہے تھے۔ اقبال نے اُس دن کا تصوّر کیا جب وہ اُستاد سے ملاقات کا شوق لے کر اُن کے مکان پر پہنچیں گے اور وہاں کوئی نہ ملے گا!

فروری میں گورنمنٹ کالج میں آرنلڈ کے لیے الوداعی جلسہ ہوا۔ بہت سے طلبہ نے اپنی نظمیں پڑھیں۔ اقبال ''نالۂ فراق'' لکھ چکے تھے''تاہم اس خیال سے کہ اس میں میرے ذاتی تاثرات کا ایک دردانگیز اظہار تھا، کسی عام جلسے میں اس کا پڑھنا مناسب نہ سمجھا گیا۔''(۲۶)

جاتے جاتے آرنلڈ دو اچھی باتیں اُن کے کان میں ڈال گئے تھے۔ پہلی بات یہ تھی کہ اُنہوں نے ان کے لئے گورنمنٹ کالج کے شعبۂ فلسفہ میں مستقل ملازمت کی بات منوالی ہے۔ دوسری بات، یہ مشورہ کہ اقبال بھی انگلستان چلے آئیں اور وہاں تعلیم حاصل کریں!

آرنلڈ ۲۶ فروری کو رُخصت ہوئے۔

48

کچھ عرصے سے ان کی نظموں میں ایک اُداسی در آئی تھی۔ ان دنوں کی نظموں کا مزاج پچھلے برس کی اُن نظموں سے بہت مختلف نظر آتا ہے جو اُنہوں نے امیر بیگم سے روابط کی سرشاری میں کہی تھیں۔ اس اُداسی کی وجہ کچھ بھی رہی ہو اب اس کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ ایک مرحلے پر امیر بیگم کی والدہ نے اُن کی اقبال سے ملاقات پر پابندی عائد کردی تھی۔ ۱۹۰۴ء کا سال اقبال کے لئے پچھلے برس سے بہت مختلف تھا۔

49

مارچ میں مخزن میں اُن کی نظم ''نالۂ فراق'' شائع ہوئی۔

50

مارچ کی آخری تاریخ سے پہلے ہی اقبال کو گورنمنٹ کالج میں تقرری کا پروانہ مل گیا اور اُنہوں نے اورینٹل کالج میں استعفیٰ دے دیا۔ (۲۷)

51

یکم اپریل کو جمعہ تھا اور اجلاس کا پہلا دن۔ یہ اجلاس تین روز جاری رہا۔ (۲۸)

اس دفعہ لوگ پہلے سے زیادہ تعداد میں آئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ مولانا الطاف حسین حالؔی بھی تشریف لائے تھے۔ شاعر کی شہرت کا طلسمی اثر کیا چیز ہوتا ہے!

حالؔی سے پہلے اقبال کو اپنی نظم سُنانی تھی۔ اور اقبال سے پہلے اُن کے ایک دوست مولوی احمد دین

عُرف الف دین کو تقریر کرنی تھی۔ یہ تقریر ذرا طویل ہوگئی تو مجمع میں بے چینی پھیلی اور آوازیں آنا شروع ہوئیں، ''الف دین' بے دین ہوگیا!'' کوئی اور وقت ہوتا تو اقبال اس فقرے سے خوب محظوظ ہوتے مگر اس موقع پر اُنہیں غُصہ آ گیا۔ وہ ایک دم شاعر سے کالج کے اُستاد بن گئے اور مجمع کو ڈانٹا ''اگر آپ لوگ خاموشی سے تقریر نہیں سنیں گے تو میں نظم بھی نہیں سُناؤں گا۔''

آخر خدا خدا کر کے اُن کی باری آئی۔ انہوں نے شلوار قمیص اور چاندنی جوتے پہنے ہوئے تھے۔ گریبان کا بٹن کھلا تھا۔ چہرے پر ناک پکڑ عینک لگی تھی۔ (۲۹)

اقبال نے اپنی نظم ترنم سے پڑھنا شروع کی اور اس کی کاپیاں دھڑا دھڑ بکنے لگیں۔ ایک شعر حالؔی نے بھی دس روپے میں خریدا۔ معلوم نہیں ڈپٹی نذیر احمد کی اس نظم کے بارے میں کیا رائے ہوئی مگر ایک شخص جسے قریب قریب حال آ گیا، وہ دہلی کے خواجہ حسن نظامی تھے۔ انہوں نے اپنا عمامہ اُتار کر اقبال کے سر پر رکھ دیا جسے عبدالقادر نے بہت کہہ سُن کر اُنہیں واپس کیا۔ (۳۰)

غالباً اسی جلسے کے بعد شیخ عبدالقادر نے اقبال سے کہا ہوگا کہ وہ ایک ایسی نظم کیوں نہیں لِکھ دیتے جسے ہندوستان میں قومی نغمے کے طور پر گایا جا سکے۔ (۳۱)

اقبال کے بعد حالؔی کھڑے ہُوئے۔ وہ آواز جس نے پہلی بار ''مسدّس'' سُنائی تھی اب نحیف تھی۔ اُنہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ نظم بھول آئے ہیں۔ ارشد گورگانی نے فوراً آگے بڑھ کر اعلان کیا۔

سنتے ہیں کہ اس بزم میں حالؔی آئے
سننے کو ہیں حالی و موالی آئے
کیا شوق ہے کیا خوف ہے کیا گھبراہٹ
بھول آئے ہیں نظم، گھر سے خالی آئے

اگلے روز وہ نظم ساتھ لے کر آئے۔

''مادرِ پنجاب انجمن''

مگر اب آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں نے کہا۔ ''آواز نہیں آ رہی۔ اقبال سے پڑھوایئے''۔ آخر جب ایک دفعہ نظم سُنا چکے تو اقبال کو حکم ہوا کہ وہ اپنی پاٹ دار آواز میں اسے دُہرائیں (۳۲)۔

نظم سنانے سے پہلے اقبال نے فی البدیہہ رباعی پڑھی۔

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالیؔ
معمور مئے حق سے ہے جامِ حالیؔ
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالیؔ

تیسرا حصہ

52

اپریل میں ''علم الاقتصاد'' کا ایک حصہ مخزن میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا'' آبادی۔'' (۳۳)

''افلاس اور دیگر برائیوں کا اصل منبع آبادی کا حد سے زیادہ بڑھ جانا ہے...جس ملک میں آبادی بلا قید بڑھ رہی ہو، وہاں کے لوگوں کو چاہیئے کہ انجام بینی سے کام لیں اور ان وسائل کو استعمال کریں، جو آبادی کی ترقی کو روکتے ہیں۔''

یہ کتاب اقبال نے مسٹر اسکوٹر کے نام منسوب کی تھی جو محکمہ تعلیم پنجاب کے ڈائریکٹر تھے۔ پوری کتاب اسی سال شائع ہوئی مگر اس کی درست تاریخ معلوم نہیں۔ (۳۴)

''ذرا خیال کرو کہ غریبی... سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوئ انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے...اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ...کیا یہ ممکن نہیں ہے ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟''

53

شیخ عبدالقادر نے اقبال کو بتایا کہ وہ بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے انگلستان جارہے ہیں۔ اقبال نے ان سے کہا کہ وہ بھی اپنے بڑے بھائی کو خط لکھ کر اخراجات کا بندوبست کروانے کے لئے کہیں گے۔ (۳۵)

شیخ عبدالقادر مئی میں روانہ ہوگئے۔

54

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

مخزن، جون ۱۹۰۴ء

57

عطا محمد اُن دنوں ایبٹ آباد میں تعینات تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں اقبال اُن کے پاس چلے گئے اور جاتے ہی بیمار پڑ گئے (۳۶)۔ غالباً اسی کیفیت میں ایک روز اُس جگہ بیٹھے تھے جہاں اب میونسپل باغ ہے۔ عین سامنے پہاڑ سربن کی چوٹی تھی۔ مشرق کی جانب سے گھٹا آئی اور پہاڑ اُس میں چھپ گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر ان کی طبیعت رواں ہوگئی۔

اُٹھی پھر آج وہ پُورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہُوا پھر پہاڑ سربن کا

نظم کا نام انہوں نے ''ابر'' رکھا۔ اس سے پہلے وہ ''ہمالہ'' اور ''ابرِ کوہسار'' وغیرہ لکھ چکے تھے مگر وہ خیالی نظمیں تھیں۔ کسی پہاڑ کو سچ مچ دیکھ کر لکھی جانے والی یہ شائد ان کی پہلی نظم تھی۔

58

ایبٹ آباد میں اُن سے لیکچر کی فرمائش کی گئی۔ اُنہوں نے ''قومی زندگی'' کے عنوان سے ایک لیکچر دیا۔ نظم میں اُنہوں نے جب بھی اس موضوع پر کچھ کہنا چاہا تھا، تصوّف کی رَو میں بہہ نکلے تھے۔ مگر نثر میں اُنہوں نے دُنیا کی مختلف قوموں کا تجزیہ کیا کہ وہ کس طرح کے حالات سے دوچار ہیں۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ نئے دور کے لحاظ سے اسلامی قانون کی نئی تدوین کی طرف توجہ کریں۔ بظاہر یہ خیال شبلی کی ''سیرۃ النعمان'' کی بازگشت معلوم ہوتا تھا۔

اگرچہ شیعہ مفسرّوں نے (فقہ کے) بعض اصول کی تشریح میں ایک حیرت ناک وسعتِ نظر سے

کام لیا ہے، تاہم جہاں تک میرا علم ہے شریعتِ اسلامی کی جو توضیح جناب ابو حنیفہؒ نے کی ہے ویسی کسی اسلامی مفسّر نے آج تک نہیں کی۔ ہمیں اس وقت ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے۔ اور اگر اس کام کی اہمیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام شاید ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے کم از کم ایک صدی کی ضرورت ہے۔'' (۳۷)

57

ہندوستان اور پوری دنیا میں ایک اور اہم سوال جو شائد انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس شدت کے ساتھ سامنے آ رہا تھا وہ تھا معاشرے میں عورتوں کے مقام کا سوال۔

ابھی پچھلے برس ایک خاتون سائنسداں مادام کیوری نے نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔ اور اسی برس انگلستان کی انقلابی رہنما ایمیلیا نے عورتوں کے لئے ووٹ کا حق حاصل کرنے کی جدّ و جہد میں بعض عملی اقدامات اُٹھانے کا عزم ظاہر کیا تھا۔ ہندوستان میں بہت عرصہ سے پردے کے مسئلے پر بحث ہو رہی تھی۔ اس بحث میں ایک اہم آواز مولوی ممتاز علی کی تھی۔ یہ محمد حسین آزاؔد کے شاگرد اور اقبال کے اُستاد تھے جنہوں نے بڑی مخالفت کا سامنا کر کے لاہور سے پرچہ ''تہذیبِ نسواں'' نکالا تھا۔

دُوسری اہم آواز لکھنؤ کے ایک بانکی طبیعت رکھنے والے ادیب کی تھی۔ ان کا نام عبدالحلیم شرؔر تھا۔ شبلی کے دوست تھے۔ شبلی ہی کی طرح انگریزی، فرانسیسی اور اسلامی تاریخ کا ذوق رکھتے تھے۔ مگر تحقیق کی بجائے ناول کو اپنا میدان بنایا تھا۔ صحافی بھی تھے اور بہت سے رسالے، پرچے وغیرہ نکالتے رہتے تھے۔ ایک رسالے میں پردے کی مخالفت میں لکھ دیا کہ پردہ تو نگاہ اور ذہن کا پردہ ہوتا ہے نہ کہ گھر کی چار دیواری میں عمر قید! اِس پر ایک بزرگ دوست اکبر حسین، الہ آباد سے ٹکٹ کٹوا کر ان کے گھر جا دھمکے اور سیدھے زنانے میں گھستے چلے گئے۔ عورتوں نے شور مچا کر شرؔر کو بلایا تو اکبر الہ آبادی کہنے لگے۔ ''جب آپ اپنے گھر میں اِس اصُول پر عمل نہیں کر سکتے تو لکھتے کیوں ہیں؟''

الہ آباد واپس پہنچ کر انہوں نے شرؔر کو لکھ بھیجا

اُٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق
بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
بے حجابی مری ہمسائے کی خاطر سے نہیں

صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

58

اقبال عورتوں کی آزادی کے کبھی قائل نہیں ہو سکے۔ ان کے خیال میں عورتوں اور مردوں کے میدان الگ الگ تھے۔ دوسرے لفظوں میں جہاں تک دنیا کے کاروبار کا تعلق تھا عورتیں مردوں سے کم تر تھیں (۳۸)۔ پردے کے بارے میں ان کا خیال تھا:

''بعض مسلمان جو مغربی تہذیب سے بہت متاثر ہوئے ہیں اس دستور کے مخالف ہیں اور اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں اور حال کے دیگر اسلامی ممالک میں پردے کی یہ صورت نہیں تھی جو آج کل ہندوستان میں ہے۔ لیکن ... چونکہ اقوامِ ہندوستان نے اخلاقی لحاظ سے کچھ بہت ترقی نہیں کی، اس واسطے اس دستور کو یک قلم موقوف کر دینا میری رائے میں قوم کے لئے نہایت مضر ہوگا۔ ہاں اگر قوم کی اخلاقی حالت ویسی ہو جائے جیسی کہ ابتدائے زمانہ اسلام میں تھی تو اس کے زور کو کم کیا جا سکتا ہے اور قوم کی عورتوں کو آزادی کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے کی عام اجازت ہو سکتی ہے۔

ان تمام اصلاحوں کے علاوہ شادی کی بعض قبیح رسوم توجہ کی محتاج ہیں۔ نارضامندی کی شادیاں مسلمانوں میں عام ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے ۹۹ فی صد اسلامی گھروں میں اس بات کا رونا رہتا ہے کہ میاں بیوی کی آپس میں نہیں بنتی۔ منگنی کا دستور نہایت مفید ہو سکتا ہے بشرطیکہ شادی سے پہلے میاں بیوی کو اپنے بزرگوں کے سامنے ملنے کا موقع دیا جائے تا کہ وہ ایک دوسرے کی عادات اور مزاج کا مطالعہ کر سکیں اور اگر ان کے مذاق قدرتاً مختلف واقع ہوئے ہیں تو منگنی کا معاہدہ فریقین کی خواہش سے ٹوٹ سکے۔ لیکن افسوس ہے کہ موجودہ دستور کے مطابق **فانکحوا ما طاب لکم من النسا** پر پورا عمل نہیں ہو سکتا۔ لڑکا خواہ منگنی سے پہلے اپنے سسرال کے گھر میں جاتا ہی ہو، منگنی کے بعد تو اس کو اس گھر سے ایسی پرہیز کرنی ہوتی ہے جیسے ایک متقی کو مے خانے سے۔ افغانوں میں منگنی کے بعد میاں بیوی کو آپس میں ملنے کی عام اجازت ہوتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ مغلیہ دستور اسلامی نہیں بلکہ اسرائیلی ہے... تاہم اگر اس کی اصلاح کر دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ دستور مفید ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں مغربی 'کورٹ شپ' کی تمام خوبیاں موجود ہیں اور اس کے نقائص معدوم۔ (۳۹)

59

لالہ ہر دیال نوجوان تھے مگر وطن کی محبت میں سب سے آگے۔ انہیں اس بات کا بہت افسوس تھا کہ پچھلی صدی میں ۱۸۵۷ء کے غدر میں اُن کے صوبے پنجاب نے عام طور پر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ ہر دیال خود اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک روز کسی بات پر ینگ مینز کرسچین اسوسی ایشن کے سیکرٹری سے اُلجھ پڑے۔ یوں تو اس ایسوسی ایشن میں ہندوستانی اور انگریز سبھی شامل تھے مگر اُس زمانے میں عام طور پر انگریز ہندوستانیوں سے میل جول کو اپنے لیے توہین کا باعث سمجھتے تھے۔ وائسرائے اور گورنر کی کونسلوں میں ہندوستانیوں کا گزر ہونے لگا تھا مگر نسلی امتیاز میں فرق نہیں آیا تھا۔

ہر دیال ایسی ہی کسی نسلی امتیاز کی بات پر سیکرٹری سے الجھے تھے۔ چنانچہ فوراً اپنی رکنیت سے استعفیٰ دیا اور مقابلے پر ینگ منز انڈین ایسوی ایشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی سیمابی فطرت سے مجبور ہو کر شائد اُسی شام چھ بجے اس کا افتتاحی اجلاس بھی رکھ دیا۔

کوئی دوپہر کے تین بجے ہوں گے جب اقبال سے درخواست کی گئی کہ وہ اجلاس کی صدارت کریں۔ مقررہ وقت پر وہ آئے تو جلسہ ان کا منتظر تھا۔ اقبال نے تقریر کرنے کی بجائے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ایک نظم ترنّم سے پڑھنی شروع کر دی۔ جس نے سنی وہ محو ہو گیا اور محسوس کیا کہ ہندوستان کو ایک نئی شناخت مل گئی ہے۔

جلسہ کے اختتام پر ہر شخص اسے دوبارہ سُننے پر مصر تھا۔ چنانچہ ایک بار پھر اقبال نے اپنے خاص سُروں میں یہ گیت چھیڑا۔ (۴۰)

ہمارا دیس

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اِس کی یہ گُلستاں ہمارا
غُربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی، دِل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا

اے آبِ رُودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اُترا ترے کِنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا، آپس میں بَیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یُونان ومصرو روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
اقبالؔ ! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا!

اپریل سے عبدالحلیم شرؔر نے ایک نیا پرچہ ''اتحاد'' لکھنؤ سے نکالنا شروع کیا تھا جس کا مقصد ہندوؤں اور مُسلمانوں میں یکجہتی پیدا کرنا تھا۔ اگست میں انہیں لاہور سے کسی طالبعلم نے لکھا کہ مشہور شاعر شیخ محمد اقبال صاحب نے ایک نظم پڑھی ہے، میں اُس کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں۔

شرؔر نے ''ہمارا دیس'' دیکھی تو عش عش کر اُٹھے۔ فوراً جا کر کاتب کے حوالے کر دی۔ اُس نے خوشخط لکھی اور جب اتحاد کا اگلا شمارہ چھپ کر منظرِ عام پر آیا تو یہ نظم ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل گئی۔ (۴۱)

60

جب رسول اکرمؐ مدینۂ منوّرہ میں جلوہ افروز تھے تو کوئی بھی عاشق خدمت میں حاضر ہو کر اپنی نگاہوں کی پیاس بُجھا سکتا تھا

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اُسؐ کا
خوشا وہ روز کہ دیدار عام تھا اُسؐ کا

نظم: بلال

61

اُن دِنوں اقبال کا ذہن ایک دفعہ پھر تاریخ کے دریچوں میں جھانک رہا تھا۔ انہوں نے ایک عجیب

وغریب نظم ''سرگزشتِ آدم'' کے نام سے لکھی جس میں پوری انسانی تاریخ کا احاطہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کا کوئی پلاٹ نہ تھا۔ اگر تاریخی واقعات کو نکال کر نظم کے ابتدائی اور آخری اشعار کو مِلا دیا جاتا تو شاعر کا مطلب زیادہ واضح ہوسکتا تھا، یعنی جنّت میں شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے سے انسان کو عقل وشعور کی دولت مل گئی مگر خود اپنی ہستی کا راز گُم ہوگیا۔ دُنیا میں آ کر انسان نے عقل کے زور پر اسے سمجھنے کی کوشش کی مگر وہ تو صرف اپنے دل میں جھانکنے سے اُسے مل سکتا تھا!

نظم کے ۱۲۳ اشعار کے بعد مزید ۱۵ اشعار اسی بحر میں اضافہ کر دیئے گئے تھے اور تان اِس شعر پر آ کر ٹوٹی تھی:

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیر اقبالؔ
مَیں بُت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں مَیں نے

''مخزن'' کے قارئین سمجھے ہوں گے کہ یہ امیر مینائی کے دیوان کی طرف اشارہ ہے۔ مگر اِس سے پہلے جب اقبال نے یہ نظم اپنے بعض دوستوں اور خود امیر بیگم کو سُنائی ہوگی تو اُنہوں نے اِس پہلودار شعر کا خوب لُطف لیا ہوگا۔

62

گرامی اس دفعہ لاہور آئے تو اپنے دوست کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اقبال ہمیشہ کی طرح ہنستے مسکراتے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کئی دنوں سے امیر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی ماں کو اُس کا اقبال سے ملنا پسند نہیں تھا۔

گرامی اُسی وقت علی بخش کو لے کر نکل گئے اور امیر کی ماں سے جا کر کہا۔ ''تو نے ہمارے شاعر کو ختم کرنے کی ٹھانی ہے؟'' نائکہ نے جواب دیا۔ ''مولانا!...آپ کا شاعر تو ہمارے ہاں نقب لگانے آتا ہے، میری لڑکی چلی گئی تو کون ذمہ دار ہوگا؟'' گرامی نے خود ذمہ داری قبول کی تو اُن کی ڈاڑھی کے لحاظ میں امیر کو دو گھنٹے کی اجازت مل گئی۔ اقبال کے پاس پہنچ کر گرامی نے انہیں جھنجھوڑا اور بولے۔ ''اُٹھو جی، آ گئی امیر!''

اقبال کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا مگر امیر اُن کی نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی۔

کافی دیر بعد واپس آئے تو امیر اُن کے ساتھ تھیں۔ بڑی منت سماجت کے بعد ان کی والدہ نے اُنہیں بھیجا تھا، مگر اس شرط پر کہ دو گھنٹے میں اُن کی واپسی ہو جائے۔ (۴۲)

مہینے وصل کے، گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جُدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

63

سبب اے ہم نشینو! کچھ نہ پُوچھو میرے رونے کا
یہ ارماں ہیں کہ جو آنکھوں سے آنسو بن کے نکلے ہیں
مسافر، مَن چلے ہوتے ہیں کیا راہِ محبت کے!
متاعِ دل کو لے کر واسطے رہزن کے نکلے ہیں
کرامت دیکھ اے دستِ جنوں! بادِ محبت کی
عرب میں جا کے، پُرزے میرے پیراہن کے نکلے ہیں
برہمن روزِ محشر ڈھونڈھتا پھرتا ہے واعظ کو
صنم جو تھے، وہ پتھر وادیٔ اَیمن کے نکلے ہیں
تماشا کی جو وُسعت، مَیں نے اپنے دامنِ دل کی
ہزاروں دشت، اِک گوشے میں اِس دامن کے نکلے ہیں

64

اکتوبر میں اقبال ایک دوست سے ملنے ہوشیار پُور جانے والے تھے۔ پہلے کئی دفعہ وعدہ کر کے عین وقت پر ارادہ بدلا تھا۔ سبب اُن کی وہی فطری کاہلی جس سے اُن کے قریب کے دوست خوب واقف تھے، اور دُور کے دوست اب آگاہ ہو رہے تھے۔ گورنمنٹ کالج کی سینیٹ کا آئندہ اجلاس ۷ نومبر کو ہونے والا تھا۔ اقبال کو معلُوم ہوا کہ شاہ دین ہمایوں فیلوشپ کے لیے اُن کا نام تجویز کریں گے مگر اسے منظور کروانے کے لیے اُنہیں سینیٹ کے دوسرے ارکان کو ملاقات کر کے ہموار کرنا ہوگا۔ اقبال اِس دوڑ دھوپ پر آمادہ ہو گئے مگر اندر ہی اندر اُن کی خودداری پر چوٹ لگی۔ اُنہوں نے یہ طے کیا کہ وہ براہِ راست ارکان سے ملنے کی بجائے اُن کے دوستوں سے ملیں۔ ''ذاتی طور پر مجھے یہ زیب نہیں دیتا'' اُنہوں نے اپنے دوست کو انگریزی میں لکھا۔ ''مگر آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ مسلمان فیلوز کی تعداد بہت تھوڑی ہے... کل

چھ... جن میں سے تین، مولوی ہونے کے اعتبار سے عملاً گویا نہیں ہیں... اس زمانے میں قومی مفادات سب پر مقدم ہیں۔ دوسری چھوٹی چھوٹی باتوں کو پسِ پُشت ڈال دینا چاہیئے۔'' (۴۳)

65

غرض اکتوبر کا مہینہ اسی گناہِ بےلذّت کی نذر ہُوا۔

66

نومبر میں انہوں نے شائد تین نظمیں کہیں۔
پہلی نظم ''موجِ دریا'' تھی۔ یہ ''ہمالہ'' اور ''ابر'' وغیرہ کے سلسلے کی نظم تھی۔ موجِ دریا کی زبانی کہلوایا گیا تھا

مضطرب رکھتا ہے میرا دلِ بے تاب مجھے

یعنی دریا کی لہر جو ہر وقت بےقرار ہو کر اچھلتی رہتی ہے وہ دراصل سمندر کی جُدائی میں پریشان ہے۔
دوسری نظم ''صبح کا ستارہ'' تھی۔ اس میں صُبح کے ستارے کی بےچینی کا ذکر کیا تھا۔ وہ جو ٹمٹماتا ہے، تو اس فکر میں بے تاب ہے کہ میں تارے کی بجائے کچھ اور کیوں نہ بن جاؤں، تاکہ میری عُمر دراز ہو جائے۔ موتی؟ شبنم؟ افشاں کا ذرّہ؟ کسی مظلوم کی آہ کا شرارہ؟ آخر ان تمام چیزوں سے درگزر کر کے ستارہ کہتا ہے کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اُس بیوی کی آنکھ سے آنسو بن کر ٹپک جاتا، جس کا شوہر وطن کی حفاظت کی خاطر تلوار اُٹھا کر روانہ ہو رہا ہو۔ یہی آنسو ہمیشہ رہنے والی زندگی رکھتا ہے۔
تیسری نظم ''جگنو'' تھی۔ ''تصویرِ درد'' میں جو پیغام نظم کی طوالت کے سبب بے ربط ہو گیا تھا۔ وہی ''جگنو'' کے تیسرے بند میں سمٹ کر نہایت سلیقے سے ادا ہُوا تھا۔

جگنو (تیسرا بند)

حُسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سُخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا، شاعر کا دل ہے گویا

واں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیے ہیں، ورنہ
نغمہ ہے بُوئے بُلبُل، بُو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو؟
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

67

۱۹۰۴ء کے اواخر میں امیر بیگم اور اقبال کا تعلق امیر بیگم کی والدہ کی دخل اندازی سے ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ (۴۴)

68

اقبال کی جذباتی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے اُن کے ذہن کی ہمہ گیر وُسعت کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہ تو ممکن بلکہ یقینی نظر آتا ہے کہ کسی عورت کا حُسن اُن کی فطرت کے لئے بجلی بن جائے اور اُنہیں عظیم الشان نفسیاتی تجربے سے دوچار کردے۔ مگر یہ بات ہرگز قرینِ قیاس نہیں کہ محض کسی کے ہجر کا غم اُن کی زندگی کا رُخ بدل دے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۰۴ء کے اختتام پر اُن کی زندگی میں کئی مایوسیاں جمع ہوگئی تھیں۔ اُنہیں جس فیلو شپ کا آسرا ہوا تھا وہ انہیں نہیں ملی تھی۔ اُن کے عزیز دوست (عبدالقادر) انگلستان گئے تھے اور وہ اپنی بے پناہ ذہانت کے باعث اسے جائز طور پر اپنا حق سمجھتے تھے کہ اُنہیں بھی مغرب کے میکدۂ علم سے چند جُرعے حاصل کرنے کا موقع ملے۔ اس معاملے میں تقدیر اُن سے ناانصافی پر آمادہ نظر آتی تھی جس کی شکایت اُن دنوں کی نظموں میں صاف موجود ہے۔ اِن سب سے قطعِ نظر ہندوستان کے سیاسی پس منظر پر ہندو اور مسلمان کے درمیان بڑھتے ہوئے تعصبات اور جہالت کی کارفرمائیاں انہیں اپنے گردوپیش سے بیزار کررہی تھیں۔ یہ تعصب اور جہالت یقیناً ایک ایسے حساس شخص کے لئے جس کا نفیس فلسفہ ہندو کو خدا

پرست مانتا تھا، ایک ذاتی اذیّت سے کم نہ تھیں۔ خود اُن کا دل اگر مسلمان تھا تو جسم میں گردش کرنے والا خون برہمن تھا اور اس بات کو وہ زندگی میں کبھی نظرانداز نہ کر سکے۔ اُس زمانے میں ہندو اور مسلم کی معرکہ آرائی کا خیال ہی اُن کی اپنی شخصیت میں ایک تکلیف دہ توڑ پھوڑ کا استعارہ تھا۔

بہرحال، یہ عجیب اتفاق ہے کہ امیر بیگم سے قطع تعلق کے بعد آئندہ سات برس تک نہ وہ انجمن کے اجلاس میں نظم سُنا سکے، نہ کوئی طویل نظم لِکھ سکے۔

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست
وائے محرومی خزف چینِ لبِ ساحل ہُوں مَیں
مَیں وہی ہُوں، کھو گیا تھا جس کا دِل روزِ الست
تم نہ پہچانو، تو تُم جانو، وہی بے دِل ہُوں مَیں
ہے عبث اے برق تجھ کو میرے حاصِل کی تلاش
مجھ پر آ کر گر کہ اپنا آپ ہی حاصل ہُوں مَیں
ڈھونڈھتا پھرتا ہے کیا، اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر، آپ ہی منزل ہُوں میں

مخزن۔ دسمبر ۱۹۰۴ء

تتمہ

امیر بہت دن زندہ رہیں مگر اقبال سے نہ مل سکیں۔ یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ اتنے بڑے شاعر نے اُنہیں جس توجہ کے لائق سمجھا تھا اُنہوں نے آخر عُمر تک اُس کی لاج رکھّی۔ کوئی اقبال کا ذکر کرتا تو مُسکرا کر خاموش ہو جاتیں۔ کبھی کسی کو اپنی اور اقبال کی ملاقاتوں کا حال نہ بتایا یہاں تک کہ جب اقبال کی وفات کے بعد اور پاکستان بننے کے بعد اقبال کی شخصیت کے نام پر لوگوں نے دولت اور شہرت سے اپنا دامن بھرنا شروع کیا امیر نے تب بھی کوئی واقعہ، کوئی فِقرہ کہہ کر اِس دِلی تعلق کی تشہیر کرنا گوارا نہ کی۔ ایک صحافی نے ۱۹۴۸ء میں اُن سے ملاقات کا حال بیان کیا ہے۔

''امیر چھیاسٹھ برس کے سِن میں ہے... رنگ سنولا چکا بلکہ سیاہ ہوتا جا رہا ہے بال سفید ہو چکے ہیں...

'خالہ یہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔'

''امیر نے آنکھیں کھول دیں... ہم نے سوال کیا تو اُس کے بوڑھے چہرے کی جھریاں مُسکرائیں، جیسے کسی گُم شدہ کہانی کے الفاظ بکھر گئے ہیں اور وہ اُنہیں ایکا ایکی جوڑ دینا چاہتی ہے۔ اقبال کے نام سے اُس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں ایک نور سا جاگ اُٹھا، لیکن بسرعت مدھم ہوگیا۔ گویا ایک چُپ، سَو سُکھ۔

''اُس نے کچھ بتانا قبول نہ کیا۔ ہمارا اصرار بڑھا تو قدرے جھنجھلا کر کہا۔ 'ہمارے ہاں مُردوں کے کفن پھاڑنے کا رواج نہیں۔ انسانی گوشت کی چاٹ بُری ہوتی ہے... اِس عُمر میں انسان کو خوفِ خدا کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا۔ جب خُدا کا خوف نہیں تھا تو سب کچھ یاد تھا۔'

''ہم نے بات کو طول دینا چاہا اور تقاضا کیا کہ وہ اُن صحبتوں کی کوئی کہانی چھیڑے، جب اقبال، عبدالقادر گرامی، ناظر وغیرہم حاضر ہوتے تھے، لیکن اُس نے کھو کھلے قہقہوں میں ہمارے استفسار کو سمیٹا پھر ذرا ترُش ہو کر کہا۔ 'میں کوئی کتاب نہیں کہ اُٹھایا، ورق پلٹے، جس پیرے یا صفحے پر نظر ٹھیری اُس کو کھنگالنا شروع کیا۔ پُرانی باتیں وقت کے ساتھ مَر چکی ہیں۔'

''ہمیں یقین ہو گیا کہ امیر اِس معاملے میں سر خفی ہے۔ اُس کا رُوپ مر چکا ہے لیکن اُس کی آن نہیں مری، اُس کی خُودی زندہ ہے۔'' (۴۵)

حاشیے

نوٹ:

☆اس سوانح میں تمام منظومات ''ابتدائی کلامِ اقبال'' (مرتبہ گیان چند) سے لی گئی ہیں۔ جہاں کوئی اور ماخذ ہے وہاں نشاندہی کی گئی ہے۔

☆جن معلومات کا مآخذ اقبال کے خطوط ہیں وہاں صرف مکتوب الیہ کا نام اور خط کی تاریخ درج کی گئی ہے (مثلاً دیکھئے باب ۲ حاشیہ ۷)۔ ایسی تمام صورتوں میں ہمارا حوالہ ''کلیاتِ مکاتیبِ اقبال'' (مرتبہ سیّد مظفر حسین برنی) رہی ہے۔

باب ۱: زمین اور آسمان

(۱) یہ وہی منتر ہے جسے گاتیری کہتے ہیں۔ اقبال نے ''آفتاب'' کے نام سے اس کا ترجمہ کیا اور کفر کا فتویٰ پایا۔ دیگر تفصیلات نیز سنسکرت متن کے لئے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۷۴

(۲) اقبال کے خاندانی پس منظر کے بارے میں معلومات زیادہ تر جاوید اقبال (۱۹۷۹) اور اعجاز احمد (۱۹۸۴) سے لی گئی ہیں۔

(۳) اعجاز احمد (۱۹۸۴)

(۴) انیسویں صدی کے سیالکوٹ کے بارے میں معلومات عام طور پر سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) سے لی گئی ہیں۔

(۵) اعجاز احمد (۱۹۸۴)

(۶) سید میر حسن کے بارے میں معلومات عام طور پر سلطان محمود حسین (۱۹۸۱) سے لی گئی ہیں۔

(۷) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۵) نے ماہنامہ میثاق لاہور، دسمبر ۱۹۷۷ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولوی میر حسن کی غالب سے ملاقات کا حال پروفیسر سلیم چشتی نے خود مولوی صاحب سے سنا تھا۔

(۸) یہ روایت سیدز کی شاہ کی ہے۔ دیکھئے عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷)۔

(۹) یہ واقعہ خود اقبال نے ۱۹۰۴ کے ایک لیکچر میں سنایا تھا۔ دیکھئے ''مقالاتِ اقبال'' مرتبہ عبدالواحد معینی

(۱۹۶۳)

(۱۰) تقریر کا اقتباس انور صدیقی (۱۹۸۷) کی ''انتخاب مضامین سر سید'' (ص ۱۱) سے لیا گیا ہے۔

(۱۱) علی گڑھ کالج کے سنگِ بنیاد سے متعلق عام واقعات Graham (1885/1909) بالخصوص باب ۱۳ سے لیے گئے ہیں۔

(۱۲) روایت سیدز کی شاہ۔ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷)

(۱۳) یہ خواب بہت مشہور ہے۔ ہمارا ماخذ عبدالمجید سالک (۱۹۵۵) ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم نے خود اقبال سے سُنا تھا۔

(۱۴) اقبال کی تاریخِ پیدائش متنازعہ ہے۔ اقبال کی تاریخ پیدائش پر مفصل بحث جاوید اقبال (۱۹۷۹ء) یا اعجاز احمد (۱۹۸۴ء) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال اکادمی لاہور سے ''اقبال کی تاریخ ولادت'' کے عنوان سے مقالات کا مجموعہ بھی شائع کیا ہے۔

مندرجہ ذیل تاریخوں کو اُن کی پیدائش سے متعلق سمجھا گیا ہے۔

۹ نومبر ۱۸۷۷ء (۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ)

اقبال نے میونخ یونیورسٹی میں اپنا مقالہ داخل کرتے ہوئے اپنی تاریخِ پیدائش ''۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۶ء)'' لکھی تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے گھر والوں سے تاریخ معلوم کروائی ہوگی۔ وہاں سے ہجری تاریخ بتائی گئی اور عیسوی سال اقبال نے خود اندازے سے نکال لیا۔ چنانچہ زندگی بھر خود اقبال اور اُن کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد اِسی لحاظ سے اقبال کی عمر کا حساب لگاتے رہے۔ اقبال نے اپنی زندگی میں سالِ ولادت ہمیشہ ۱۸۷۶ء لکھا یہاں تک کہ جب ۱۹۳۱ء میں اُن کا پاسپورٹ بنا تو اُس پر بھی یہی سال درج کیا۔

۱۹۶۳ء میں عطا محمد کے فرزند اعجاز احمد نے ایک تقویم سے صحیح عیسوی تاریخ نکالی جو ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بنتی تھی۔ یہ تاریخ انہوں نے فقیر سیّد وحید الدّین کی کتاب روزگارِ فقیر (جلد دوم) میں شائع کروادی مگر اُس وقت تک بعض دوسری تاریخیں (خصوصاً ۱۹۷۳ء) اس قدر مشہور ہو چکی تھیں کہ چند سال بعد پہلے بزمِ اقبال لاہور کو اور اِس کے بعد حکومتِ پاکستان کی وزارتِ تعلیم کو باقاعدہ کمیٹیاں مقرر کرنا پڑیں۔ بزمِ اقبال کی کمیٹی ۱۹۷۲ء کی آخری سہ ماہی میں بیٹھی جبکہ وزارتِ تعلیم کی کمیٹی نے جنوری ۱۹۷۴ سے یکم فروری ۱۹۷۴ تک تین اجلاس منعقد کرنے کے بعد اِس تاریخ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس کمیٹی کے گیارہ ارکان تھے یعنی (۱) ڈاکٹر محمد اجمل (سیکرٹری تعلیم) چیرمین (۲) ریٹائرڈ جسٹس ایس اے رحمان (۳) جسٹس جاوید اقبال (اقبال کے بیٹے) (۴) پروفیسر حمید احمد خان (ناظم

مجلس ترقیٔ ادب لاہور) (۵) ایس اے واحد (نائب صدر اقبال اکادمی پاکستان کراچی) (۶) پروفیسر محمد عثمان (معتمد بزمِ اقبال) (۷) ڈاکٹر سیّد عبداللہ (۸) پروفیسر وقار عظیم (۹) ڈاکٹر وحید قریشی (۱۰) خواجہ عبدالرحیم ایڈووکیٹ اور (۱۱) شیخ اعجاز احمد (اقبال کے بھتیجے)۔

یہ تاریخ سیالکوٹ کے رجسٹرِ پیدائش میں کہیں نہیں ملتی۔ اس بات کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ شیخ نُور محمد اپنے بچوں کی پیدائش کا اندراج کروانے میں بعض اوقات لاپرواہی برت جاتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اقبال کی بعض بہنوں کی پیدائش کا اندراج بھی رجسٹر میں نہیں ملتا۔ اس تاریخ کو درست تسلیم کرنے کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں: (۱) یہ تاریخ اقبال نے خود اپنے ہاتھ سے درج کی (۲) اقبال کی زندگی میں وہ خود اور اُن کے اہلِ خانہ اسی کو اُن کی پیدائش کی تاریخ سمجھتے رہے۔ اہلِ خانہ کی مزید شہادتیں اعجاز احمد (۱۹۸۵) میں درج ہیں۔ (۳) اس تاریخ کو جمعے کا دن تھا۔ اقبال کی والدہ کہا کرتی تھیں کہ وہ جمعے کے دن پیدا ہوئے تھے۔ اقبال کی دوسری جتنی بھی تاریخیں بیان کی جاتی ہیں وہ جمعے کے علاوہ دوسرے دنوں کی ہیں۔

پاکستان میں یہ تاریخ سرکاری طور پر اقبال کی پیدائش کی تاریخ تسلیم کی گئی ہے۔ اقبال کے اکثر سوانح نگار (مثلاً جاوید اقبال) اب یہی تاریخ استعمال کرتے ہیں۔

اس تاریخ کے متعلق شبہات کا اظہار بھی بہت زیادہ کیا گیا ہے۔ شبہات کی بنیاد مندرجہ ذیل امور پر ہے۔ (۱) اقبال کی زندگی میں اُن کا کلام تو بہت چھپا مگر اتفاق سے تاریخِ پیدائش کی اشاعت زیادہ نہیں ہوئی۔ اُن کی وفات کے بعد جو تاریخِ پیدائش مشہور ہوئی وہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء تھی۔ یہ تاریخ اتنا عرصہ لوگوں کے ذہنوں میں رہی کہ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں اچانک اِسے ترک کرنا بعض لوگوں کو گوارا نہ ہو سکا۔ (۲) جن حالات میں حکومتِ پاکستان نے تاریخِ ولادت کی تحقیق کروائی وہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی تاریخ کو مشکوک کر دیتے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں بھارت میں اعلان ہوا تھا کہ اگلے برس اقبال کا صد سالہ جشنِ ولادت منایا جائے گا۔ یہاں اُس وقت ہوش آیا جب اگلے برس بھارت میں جشن شروع ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان میں اتنے بڑے جشن کا اہتمام کرنے کے لئے وقت درکار تھا۔ لہٰذا یہ بات حکومت کی خواہش کے عین مطابق تھی کہ تاریخ پیدائش ایسی نکل آئے جسے ابھی سو سال پورے ہونے میں کچھ وقت باقی ہو۔ مثلاً اگر فروری ۱۹۷۴ء میں وزارتِ تعلیم کی کمیٹی یہ اعلان کرتی کہ اقبال ۱۸۷۳ء ہی میں پیدا ہوئے تھے تو حکومتِ پاکستان کے پاس اِس بات کا کیا جواب ہوتا کہ یہ تحقیق پہلے کیوں نہ ہوئی اور اقبال کا جشن بھارت میں منایا گیا تو خود پاکستان میں کیوں نہ منایا گیا؟ (۳) ایک الجھاوا یہ بھی ہے کہ اقبال نے نومبر ۱۸۹۰ء میں مڈل کے امتحانی فارم میں اپنی عمر پندرہ سال درج کی تھی۔ دو ڈھائی سال بعد انٹرنس کا

امتحان پاس کیا تو گزٹ میں اُن کی عمر سترہ سال بتائی گئی۔ اِس لحاظ سے اُنہیں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہونا چاہیئے تھا۔

دسمبر ۱۸۷۶ء

اصل میں یہ تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہی ہے۔ اقبال کی وفات کے بعد روزنامہ ''انقلاب'' کے رپورٹر نے اُن کے بھائی سے تاریخِ پیدائش دریافت کی تو انہوں نے ہجری تاریخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اندازے سے دسمبر ۱۸۷۶ء کہہ دیا۔ یہ تاریخ روزنامہ انقلاب کے اپریل ۱۹۳۸ء کے شماروں میں شائع ہوئی۔

۲۲ فروری ۱۸۷۳ء

یہ تاریخ سب سے پہلے روزنامہ انقلاب کی ۷ مئی ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ماخذ یہ تھا کہ سیالکوٹ میں کسی نے رجسٹرِ پیدائش میں اس تاریخ کے سامنے ایک لڑکے کی پیدائش کا اندراج دیکھا تھا۔ لڑکے کے باپ کا نام نتھو درج تھا۔ اس اندراج کو اقبال کی پیدائش کا اندراج سمجھا گیا۔ شیخ عطا محمد کے نواسے خالد نظیر صوفی کا خیال ہے کہ یہ اصل میں اُس لڑکے کی پیدائش کا اندراج ہے جو بچپن ہی میں فوت ہوگیا تھا۔ (دیکھئے اِسی باب کی فصل نمبر ۳۷ اور ۳۹)۔ مگر پروفیسر عثمان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اندراج سرے سے شیخ نور محمد کے گھر کا ہی نہیں ہے کیونکہ رجسٹرِ پیدائش میں کم از کم پچیس نتھو ملتے ہیں جو سبھی سیالکوٹ میں رہتے تھے۔ اقبال کے والد بھی اگرچہ نتھو کے نام سے مشہور تھے مگر وہ محلہ چوڑی گراں میں رہتے تھے جبکہ ۱۸۷۳ء والے اندراج میں نتھو کا پتہ محلّہ کشمیریاں ہے۔

۱۹۵۵ء میں بزمِ اقبال لاہور کے زیرِ اہتمام ذکرِ اقبال شائع ہوئی جسے اقبال کی پہلی باقاعدہ سوانح کہنا چاہیئے۔ اتفاق سے اس کے مصنف عبدالمجید سالک تھے جو انقلاب کے بانی اور مدیر تھے۔ انہوں نے کتاب میں بھی یہی تاریخ درج کی اور وہاں سے یہ ہر جگہ نقل ہونے لگی۔ ۱۹۷۴ء تک یہی تاریخ درست سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ بھارت میں اقبال کا صد سالہ یومِ پیدائش اِسی حساب سے منایا گیا۔

۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء

یہ تاریخ سب سے پہلے ۱۹۷۱ء میں ''اقبال درونِ خانہ'' میں شائع ہوئی۔ کتاب کے مصنف خالد نظیر صوفی تھے یعنی شیخ عطا محمد کے نواسے اور اعجاز احمد کے بھتیجے۔ اُن کا ماخذ بھی سیالکوٹ کا رجسٹرِ پیدائش تھا جس میں اس تاریخ کو ایک اور لڑکے کی پیدائش کے اندراج میں والد کا نام نتھو درج تھا۔ اِس اندراج کے متعلق بھی پروفیسر عثمان

کی تحقیق یہی ہے کہ یہ نتھو کوئی اور ہے کیونکہ اس کا پتہ اگر چہ چوڑی گراں ہے مگر ''پیشہ۔قوم و مذہب'' کے خانے میں خیاط درج ہے جسے پیشہ نہیں قوم (ذات) سمجھنا چاہیئے۔نور محمد ہوتے تو وہ اس خانے میں کشمیری لکھواتے جیسا کہ اُن کے والد محمد رفیق نے ۶ ستمبر ۱۸۷۰ء کو اُن کی لڑکی کی پیدائش کے اندراج میں لکھوایا تھا۔

۱۸۷۵ء

یہ تاریخ سب سے کم معروف ہے اور اقبال کے محققین میں سے بہت کم اِسے قبول کرتے ہیں (مثلاً سلطان محمود حسین)۔اِس کا مآخذ اقبال کی مڈل کی سند اور انٹرنس کے نتیجے والا گزٹ ہے۔مڈل کی سند اُس امتحانی فارم کی بنیاد پر جاری کی گئی جسے اقبال نے نومبر ۱۸۹۰ء میں بھرا ہوگا۔انٹرنس کا نتیجہ دوڈھائی سال بعد نکلا تھا۔فارم میں عمر پندرہ سال لکھی گئی ہے جس کے مطابق اقبال کو ۱۸۷۵ء میں پیدا ہونا چاہیئے تھا۔انٹرنس کے نتیجے سے بھی یہی حساب نکلتا ہے۔اِس کے جواب میں شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں کہ اقبال کو پہلی جماعت میں شائد مولوی میر حسن نے داخل کروایا ہوگا اور اندازے سے اُن کی عمر لکھوادی ہوگی۔اقبال اچھے قد کاٹھ کے تھے لہٰذا مولوی صاحب کو عمر میں مغالطہ لگ سکتا تھا۔پھر اسکول کے رجسٹر میں یہی عمر چلتی رہی اور مڈل اور انٹرنس (میٹرک) کے رزلٹ تک لکھوائی جاتی رہی۔بعد میں بی اے کی درخواستِ داخلہ میں ۱۸۹۶ء میں انیس سال عمر لکھوائی۔اس لحاظ سے اُن کا سالِ پیدائش ۱۸۷۵ء نہیں بلکہ ۱۸۷۷ء بنتا ہے۔

اِس کے جواب میں سلطان محمود کا استدلال یہ ہے کہ اولین فارم پر درج کی ہوئی عمر ہی درست تھی اور بعد میں اِسے دو سال کم اِس لئے کیا گیا کہ اقبال کے دِل میں سرکاری ملازمت کے حصول کا خیال پیدا ہو گیا تھا اور سرکاری ملازمت میں عمر کم بتانے میں جو فائدہ ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔

۱۹۰۷ء میں اقبال کے جوانی کے دنوں کے دوست منشی محمد دین فوق نے کشمیری میگزین (لاہور) میں اقبال کے حالاتِ زندگی شائع کئے تھے۔بعد میں یہی حالات ترمیم و اضافے کے ساتھ ۱۹۱۱ء میں اپنی کتاب مشاہیرِ کشمیر میں شائع کئے۔اِس کے بعد بھی اقبال کی زندگی میں اِن میں دو دفعہ اور ترمیم ہوئی۔منشی فوق نے اقبال کی تاریخِ پیدائش ۱۸۷۵ء ہی بتائی ہے اور ہر مرتبہ اِسی لحاظ سے اُن کی عمر لکھی ہے۔

(۱۵) خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) لکھتے ہیں کہ محمد اقبال نام امام بی بی نے تجویز کیا تھا مگر کوئی سند نہیں دی۔

(۱۶) حمید احمد خاں (۱۹۷۴) ص ۵۰۔اُنہیں اقبال نے خود یہ بات بتائی تھی۔

باب۲: ماں کی آغوش کی وُسعت

(۱) حمید احمد خاں (۱۹۷۴) ص ۵۰

(۲) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۳۔ اُن کا ماخذ ہے غلام دستگیر رشید (۱۹۶۴) آثارِ اقبال۔

(۳) نذیر نیازی (۱۹۶۱) ص ۷۰۔۶۹

(۴) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۸۰۔۱۷۹۔ یہ روایت اقبال اور عطا محمد کے بھانجے منظور احمد کی ہے۔ وہ طالع بی کے بیٹے تھے۔

(۵) اعجاز احمد (۱۹۸۵) ص ۵۰

(۶) ایضاً ص ۴۹

(۷) اقبال بنام مہاراجہ کشن پرشاد ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء

(۸) سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) ص ۱۱۵

(۹) نذیر نیازی (۱۹۷۹) ص ۱۰۔ اُنہوں نے ۱۹۷۳ میں کریم بی سے انٹرویو کیا تھا جب محترمہ کی عمر نوے برس سے اُوپر تھی۔ غلط اور غلت والا واقعہ بھی نذیر نیازی ہی نے ص ۵۲ پر لکھا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ اُنہوں نے کس سے سنا۔ نہ ہی یہ لکھا ہے کہ اقبال نے یہ بات کب اور کس اُستاد کے سامنے کہی۔

(۱۰) اقبال بنام شاہ سلیمان پھلواری ۲۴ فروری ۱۹۱۶ء

(۱۱) سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) ص ۱۱۵

(۱۲) خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۷۵

(۱۳) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۲۳۔ یہ روایت سیّد زکی شاہ کی ہے۔

باب۳: خاندانِ مرتضیٰ کی بارگاہ

نوٹ: اقبال کی ابتدائی تعلیم (سیالکوٹ کے زمانۂ قیام) اور اُس زمانے کے نصاب سے متعلق معلومات عام طور پر سلطان محمود (۱۹۸۶ء) سے اخذ کی گئی ہیں۔

(۱) مولوی سیّد میر حسن کے حالات عام طور پر سلطان محمود (۱۹۸۱) سے اخذ کئے گئے ہیں۔

(۲) اعجاز احمد (۱۹۸۵) ص ۴۹

(۳) ایضاً۔ باب نمبر ۶، ۷، ۸

(۴) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۴۵۔ روایت سیّد ذکی شاہ

(۵) مسلم ایجوکیشنل کانگریس (کانفرنس) کے اجلاسوں کی کاروائی، قراردادوں اور دیگر تفصیلات کے لئے دیکھئے الطاف علی بریلوی (۱۹۷۰)۔

(۶) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۲۷ روایت سیّد ذکی شاہ۔ اُن کا کہنا ہے کہ اخیر عمر میں عطا محمد کو واقعی افیون کی عادت پڑ گئی تھی۔

(۷) خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۹۔۸۔ یہ روایت مہتاب بیگم کی ہے۔ مصنف نے غالباً اُن کی بیٹی سے سُنی ہوگی جو مصنف کی والدہ تھیں۔

(۸) اعجاز احمد (۱۹۸۵) ص ۶۹۔۱۶۸ اعجاز احمد نے یہ واقعہ خود اقبال کی زبانی سنا تھا۔

(۹) سلطان محمود (۱۹۸۱ء) ص ۹۴۔

(۱۰) شیخ گلاب دین اور میر حسن کا معاملہ جو اِس باب کی آئندہ فصلوں میں بھی آئے گا، عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۳۴۔۳۳ پر سیّدز کی شاہ کی روایت سے ماخوذ ہے۔

(۱۱) خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۱۰،۹۔ یہ روایت اُن کے والد صاحب نے اقبال کے ایک ہم جماعت کے حوالے سے سنائی تھی جس کا نام کتاب میں درج نہیں۔

(۱۲) خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۸۔ معلوم ہوتا ہے مصنف نے یہ واقعہ اقبال کی بھابی یعنی شیخ عطا محمد کی دوسری بیوی مہتاب بیگم کی زبانی سنا تھا۔ وہ مصنف کی نانی تھیں۔

(۱۳) معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو خود اپنے بچپن کا یہ واقعہ سنانے کا بہت شوق تھا۔ عطیہ فیضی (۱۹۴۶) اور عبدالمجید سالک (۱۹۵۵) نے الگ الگ موقعوں پر اِسے اقبال سے سن کر روایت کیا ہے۔

(۱۴) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۳۳۔ اُن کا ماخذ خوشیا کا انٹرویو ہے جو رحیم بخش شاہین کی ''اوراقِ گم گشتہ'' میں شائع ہوا۔

(۱۵) فقیر سیّد وحید الدین (۱۹۶۳) ص ۵۸۔ انہوں نے یہ واقعہ خود اقبال کی زبانی سنا تھا۔

(۱۶) یہ واقعہ اتنا مشہور ہوا ہے کہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارا ماخذ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۹ ہے مگر انہوں نے اپنا ماخذ درج نہیں کیا۔

(۱۷) گیان چند (۱۹۸۸) ص ۳۵۔ اُن کا ماخذ رفیع الدین ہاشمی کی ''تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ'' ہے جہاں رسالہ الزبیر، اقبال نمبر ۱۹۷۷ء نمبر ۲ کے صفحہ ۱۱ پر خود محمد تقی شاہ کا بیان درج ہے۔ گیان چند نے اسے مخمس قرار دیا ہے اور یاد دلایا ہے کہ چوتھا مصرعہ پچھلے مصرعوں سے ہم قافیہ نہیں ہے۔ ممکن ہے یہی بات ہو مگر یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ دراصل مسدّس ہو اور محمد تقی کو مصرعے بیان کرتے ہوئے خیال نہ رہا ہو کہ وہ تیسرے مصرعے کے بعد ٹیپ کے شعر پر آ گئے ہیں (زبانی سنانے میں اِس بات کا احتمال ہے)۔ ویسے بھی اُن دنوں مسدّس لکھنے کا رواج عام تھا۔

سیّد نذیر نیازی (۱۹۷۹) ص ۵۳ پر بھی اِس کا حوالہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''محمد اقبال نے شعر کہا: جی میں آئی جو تقی کے تو کبوتر پالے۔ کوئی کالا، کوئی اسپید ہے، دومُیالے۔''

(۱۸) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷)۔ دیکھئے اوپر حاشیہ نمبر ۴۔ کسان والا واقعہ (۳۸): ایضاً ص ۳۴۔ اُن کا ماخذ ہے رحیم بخش شاہین کی ''اوراقِ گم گشتہ'' میں سیّدز کی شاہ کا بیان ص ۲۶۸۔

(۱۹) ایضاً

(۲۰) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۶۳۔ یہ روایت پروفیسر محمد دین بھٹی نے بیان کی ہے۔

(۲۱) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۲۸۔ اُن کا ماخذ ہے سیارہ ڈائجسٹ، قرآن نمبر (۲) ص ۵۲۷

(۲۲) نذیر نیازی (۱۹۷۹) ص ۵۲۔ انہوں نے یہ روایت جمشید علی راٹھور سے سنی تھی۔

(۲۳) اقبال بنام شاہ سلیمان پھلواری ۲۴ فروری ۱۹۱۶ء

(۲۴) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۳۸۔ ان کا ماخذ ہے ''اقبالنامہ'' حصہ اول ص ۳۴۳

(۲۵) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۲۵۔ روایت سیّد ز کی شاہ

(۲۶) ایضاً ص ۱۹۹۔ روایت لالو پہلوان

(۲۷) سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) ص ۱۸۹۔ اُن کا ماخذ ہے ڈاکٹر بشارت احمد کی خود نوشت ''یادِ رفتگاں''۔ احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام لاہور (سنہ ندارد) حصہ اول ص ۱۴۰

(۲۸) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۳۰۔ روایت سیّد ذ کی شاہ

(۲۹) اقبالیات کے بعض شائقین میں اقبال اور احمدیت کو ایک متنازعہ موضوع سمجھا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ بات صاف ہے کہ اقبال نے کبھی مرزا غلام احمد کی بیعت نہیں کی تھی یہاں تک کہ جب ۱۹۰۲ء میں میر حامد شاہ نے (جو ایک طرح سے اقبال کے اُستاد بھی تھے) اقبال کو دعوت دی تو اقبال نے اِس کا نہایت واضح جواب منظوم کر دیا۔ اِس کے منتخب اشعار ''بانگِ درا'' میں ''عقل ودل'' کے نام سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبال کے بھتیجے اور واقفِ حال شیخ اعجاز احمد بھی جو خود نہایت سرگرم احمدی تھے، اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' (۱۹۸۴) میں خوش دلی سے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ایک عرصے تک اقبال احمدیت کو پنجاب میں اسلامی معاشرے کا ایک صحت مند مظہر سمجھتے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں اُن کے احمدیت سے اختلافات سامنے آنے لگے۔ اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ پہلے ختمِ نبوّت کے قائل نہ تھے اور بعد میں ہوئے۔ ختمِ نبوّت کا عقیدہ اُن کے ابتدائی اشعار میں بھی پیش کیا گیا ہے مثلاً ایک نعت میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے ہیں: ''اے کہ بعد از تُو نبوّت شد بہر مفہوم شرک۔'' اور ''عقل ودل'' والی نظم میں بھی دل کی پیروی سے یہی عقیدۂ ختمِ نبوّت مراد لیا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اقبال وسیع النظر تھے اور عام طور پر تعصبات سے بلند رہتے تھے۔ اُن سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی عقیدے پر ایمان نہ رکھنے کی وجہ سے اُس عقیدے کے ماننے والوں کی اچھائیوں کو نظر انداز کر دیں گے۔

اصل تنازعہ اقبال کے والدین اور بھائی کے احمدیت سے تعلق پر ہے۔ صورت حال یوں ہے کہ شیخ اعجاز احمد کا دعویٰ تھا کہ اُن کے والد صاحب یعنی اقبال کے بھائی شیخ عطا محمد شروع ہی میں احمدی ہو گئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ اقبال کے والدین بھی مرزا غلام احمد سے عقیدت رکھتے تھے۔ امام بی بی نے اُن سے دعا کروائی تھی جس کے نتیجے میں عطا محمد کے یہاں لڑکا پیدا ہوا اور اُس کا نام اعجاز احمد بھی اسی سبب سے رکھا گیا۔ نیز یہ کہ شیخ نور محمد نے مرزا غلام احمد کی بیعت کر لی تھی جس سے وہ ۱۹۰۲ء میں دستبردار ہوئے۔ اقبال کے دیگر رشتہ داروں کو ان روایات کے قبول کرنے میں تردد ہے اور ان میں خود شیخ عطا محمد کی نسل بھی شامل ہے۔ مثلاً اُن کے نواسے خالد نظیر صوفی اصرار کرتے ہیں کہ وہ احمدی نہیں تھے۔ راقم الحروف سے ایک انٹرویو میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ تمام روایات، یہاں تک کہ شیخ عطا محمد کی احمدیت کی روایت بھی، اعجاز احمد کے حسنِ عقیدہ کا اعجاز ہے۔ شیخ عطا محمد کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ وہ بیٹے کے لحاظ میں خاموش رہتے تھے اور اُس کے سامنے اپنے احمدی نہ ہونے پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ایک دلچسپ روایت ملفوظاتِ اقبال میں اقبال کی زبانی بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے جب نیا نیا الہام کا دعویٰ کیا تو وہ سیالکوٹ کی مسجد میں اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز اقبال بھی پہنچ گئے اور کہا کہ مجھے بھی الہام ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے سننے پر رضامندی ظاہر کی تو انہوں نے عربی میں احمدیت کے خلاف کچھ فقرے جوڑ کر پیش کر دیے جس پر وہ ساری جماعت اِن کے خلاف ہو گئی اور انہیں جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

بظاہر تو یہ شرارت اقبال کے مزاج کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے مگر اسے درست تسلیم کرنے میں قباحتیں ہیں۔ اول تو یہ کہ مرزا غلام احمد نے الہام کا دعویٰ ۱۸۸۰ء میں کیا تھا اور اگر بالفرض اقبال کی تاریخِ پیدائش ۱۸۷۳ء بھی مان لی جائے تو اُس وقت اُنکی عمر سات سال بنتی ہے۔ ۱۸۷۷ء کے لحاظ سے تو وہ صرف تین برس کے ہوئے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ مرزا غلام احمد کا سیالکوٹ میں قیام اِلہام کے دعوے سے بہت پہلے کی بات ہے۔ تیسرے، اگر مرزا غلام احمد اپنے معتقدین کے ساتھ بیٹھے تھے تو اُن میں بہت سے ایسے افراد شامل رہے ہوں گے جو اقبال کے لئے بزرگوں کا درجہ رکھتے تھے مثلاً اُن کے اُستاد سیّد میر حسن کے چچازاد بھائی میر حسام الدین جن کی مسجد میں اقبال نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا اور حسام الدین کے بیٹے سیّد حامد شاہ جن سے ایک روایت کے مطابق اقبال نے انگریزی زبان کا پہلا سبق لیا تھا۔ اِن بزرگوں کی موجودگی میں اُس شخص کے ساتھ یوں شوخی سے پیش آنا جسے یہ حضرات اپنا رہنما مانتے تھے اور جس کی اُس وقت تک خود اقبال بھی عزت کرتے تھے (جیسا کہ اُن کے

۱۹۰۲ء کے انجیلی والے مقالے سے ظاہر ہے) ایک ایسی بات ہے جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔

(۲۹) اقبال اور احمدیت کے حوالہ سے نہایت مفصل بحث اعجاز احمد (۱۹۸۵) میں ہے۔ خود احمدی ہونے باوجود اعجاز صاحب نے اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے۔

(۳۰) اعجاز احمد (۱۹۸۵) ص۳۲۔ اعجاز احمد کے بیان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ کس زمانے کا ہے۔

(۳۱) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص۶۲۔ روایت پروفیسر محمد دین بھٹی۔

(۳۲) نذیر نیازی (۱۹۷۹)۔ ص۵۳۔ اُن کا ماخذ ہے رحیم بخش شاہین کی ''اوراقِ گم گشتہ'' میں سید محمد زکی کا بیان: اقبال کا بچپن ص۲۶۶ اور ۲۶۷۔

باب ۴: گجرات کا قید خانہ

(۱) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۳۷

(۲) یہ تجزیہ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی (۱۹۸۳) کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

(۳) اقبال کی تاریخ گوئی پر محمد عبداللہ قریشی (۱۹۸۷) مفصل ہے۔

(۴) کلیاتِ مکاتیب اقبال ص

(۵) سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) ص ۱۴۸

(۶) اعجاز احمد (۱۹۸۵) ص ۹۲

(۷) ایضاً ص ۴۳

(۸) اقبال کا مقالہ قومی زندگی، جو ۱۹۰۴ء میں ایبٹ آباد میں پڑھا گیا۔ مشمولہ: عبدالواحد، سیّد۔ محمد عبداللہ قریشی (۱۹۶۳)

(۹) محمد عبداللہ چغتائی۔ ۱۹۷۷۔ ص ۲۶۔ روایت سیّد زکی شاہ

(۱۰) ایضاً

(۱۱) نکاح کا مفصل احوال سلطان محمود (۱۹۸۶) میں دیکھیے۔

(۱۲) شبلی نعمانی

(۱۳) نذیر نیازی (۱۹۶۱) ص ۶۷-۶۶

(۱۴) عبدالقادر، دیباچہ بانگِ درا

(۱۵) گیان چند (۱۹۸۸) ص

(۱۶) ممتاز مرزا، بیگم (۱۹۸۸) خلیق انجم نے یہ بات دیباچے میں لکھی ہے۔

(۱۷) طرح مصرع گیان چند (۱۹۸۸) میں درج ہے۔

(۱۸) اعجاز احمد (۱۹۸۵) ص ۱۸۶-۱۸۵۔ یہ چونکہ گیان چند کی مرتبہ ''ابتدائی کلامِ اقبال'' میں بھی شامل نہیں لہٰذا یہاں پوری درج کی جارہی ہے۔ اس کا عنوان تھا ''مشہور پنجابی مثل ہے جیہا منہ تئ چپیڑ''۔

واہ سعدی دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی
مہتروں میں خوب ہو گی قدر دانی آپ کی
بیت ساری آپ کی بیت الخلا سے کم نہیں
ہے پسندِ خاکروباں شعر خوانی آپ کی
تیلیاں جاروب کی لیتے وہ خامہ کے عوض
کھینچتے تصویر گر بہزاد و مانی آپ کی
راہ اپنی چھوڑ کر نکلے دہن کی راہ سے
ہے مگر بادِ مخالف نغمہ خوانی آپ کی
ان دنوں کو فصلِ گل کہیے و یا دن پھول کے
ہر طرف ہوتی ہے سعدی گل فشانی آپ کی
آپ کے اشعار موتی ہیں مگر تی کے بغیر
گوشِ عالم تک یہ پہنچے ہیں زبانی آپ کی
گوہرِ بے آرا جھڑے ہیں آپ کے منہ سے سبھی
جان سے تنگ آ گئی ہے مہترانی آپ کی
ہر طرف سے آ رہی ہے یوں جو دُر دُر کی صدا
بھا گئی اہلِ سخن کو دُرفشانی آپ کی
آپ سے بڑھ کر عروضے کوئی دنیا میں نہیں

واہ صاحب شعرخوانی شعردانی آپ کی
خاک کو ہم چاٹ کر یہ بات کہہ دیتے ہیں آج
تلخ کامی ہو گی یہ شیریں دہانی آپ کی
جب اُدھر سے بھی پڑیں گے آپ کو سابن کے مول
آپ پر کھل جائے گی رنگیں بیانی آپ کی
کھاؤ گے فرمائش سر پلپلا ہو جائے گا
پھر نکل جائے گی سر سے شعرخوانی آپ کی
دین اور ایمان کی دُم میں واہ نمدہ دے دیا
سارے عالم کی زباں پر ہے کہانی آپ کی
آفتابِ صدق کی گرمی سے گھبراؤ نہیں
حضرتِ شیطاں کریں گے سائبانی آپ کی
اشتہارِ آخری اِک آنت ہے شیطان کی
سر بسر جن سے عیاں ہے خوش بیانی آپ کی
وہ مثل ہے، ہے طویلے کی بلا بندر کے سر
ہو گیا ہم کو یقیں شامت ہے آئی آپ کی
خر کمہاروں کا موا ستی ہوتی ہے مفت
ہے مگر قومِ نصاریٰ یارِجانی آپ کی
رانڈ کے چرخے کی صورت کیوں چلے جاتے ہیں آپ
اہلِ عالم نے سبھی بکواس جانی آپ کی
نیلے پیلے یوں نہ ہو پھر کیا کرو گے اُس گھڑی
جب خبر لیوے گا قہرِ آسمانی آپ کی
بات رہ جاتی ہے دنیا میں نہیں رہتا ہے وقت
آپ کو نادم کرے گی بدزبانی آپ کی

قومِ عیسائی کے بھائی بن گئے پگڑی بدل
واہ کیا اسلام پر ہے مہربانی آپ کی

(۱۹)ایضاً ص۳۷

(۲۰)ایضاً ص۹۸

(۲۱)افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷)ان کا ماخذ ہے اقبال کی اپنی روایت منقولہ دررسالہ جوہر (دہلی) ۱۹۳۸ء

(۲۲)اعجاز احمد (۱۹۸۵)ص۲۲

(۲۳)اقبال نے یہ واقعہ مثنوی رموزِ بیخودی میں نظم کیا ہے۔

باب۵: حکیموں کا بازار

(۱) غلام بھیک نیرنگ کی روایت ہے (دیکھیے جریدہ اقبال (اکتوبر ۱۹۵۷) ص۲

(۲) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص۴۲

(۳) مظفر حسین برنی ص۹۵۴

(۴) اعجاز احمد (۱۹۸۵) ص۲۶، ۲۷۔ اعجاز احمد نے مقدمے کی تاریخ نہیں دی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور یہی زمانہ رہا ہوگا۔

(۵) Siddique, Muhammad

(۶) میر غلام بھیک نیرنگ کی روایت دیکھیئے جریدہ اقبال (اکتوبر ۱۹۵۷) ص۲

(۷) عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص۶۸

(۸) عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص۱۳۶

(۹) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص۱۳۳

(۱۰) اعجاز احمد (۱۹۸۵)

(۱۱) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص۱۹۹۔ روایت لالو پہلوان

(۱۲) معراج بیگم کا تذکرہ اقبال کی تمام سوانح میں پایا جاتا ہے۔

(۱۳) عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۱۳۹

(۱۷) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۵۱

(۱۸) ایضاً

(۱۹) عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۵۱

(۲۰) عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۷۰

(۲۱) عبداللہ قریشی (۱۹۸۸)

(۲۲) عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۲۴۳

(۲۳) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) روایت احمد حسین خان

(۲۴) اقبال پر طوائف کے قتل کے الزام کے سلسلے میں مفصل بحث کے لئے دیکھیے جاوید اقبال (۱۹۸۱) ص ۱۸۰

(۲۵) عبداللہ قریشی (۱۹۷۷) ص ۵۴ روایت جمشید راٹھور

(۲۶) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۸۱۔ روایت پروفیسر منظور احمد (اقبال کے بھانجے)

(۲۷) انگریزی: صدیق، محمد۔

(۲۸) سلطان محمود حسین (۱۹۸۱) ص ۷۶

(۲۹) Muhammad Siddique

(۳۰) Javed Iqbal, ed (1962)

(۳۱) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۴۴

(۳۲) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۴۲۔ روایت زکی شاہ

(۳۳) آفتاب اقبال کی تاریخ پیدائش متعدد کتابوں میں درج ہے۔

(۳۴) اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۱۳۶

(۳۵) ایضاً ص ۲۷

(۳۶) ایضاً ۲۸

(۳۷) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۹۷۔ روایت خواجہ فیروز الدین بیرسٹر

(۳۸) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۵۷

(۳۹) حنیف شاہد (۱۹۷۲) ص ۱۰۹

(۴۰) حسن اختر ۱۹۸۸) اور دوسرے

(۴۱) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۷۔ روایت زکی شاہ۔ انہوں نے ۱۸۹۵ء بتایا ہے جو یادداشت کی غلطی ہے۔ لاہور میں اجلاس ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا۔

(۴۲) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۷۔ روایت زکی شاہ۔

باب۶: مشرقی کالج کا استاد

(۱) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۷

(۲) ایضاً

(۳) اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۱۶۱

(۴) ایضاً ص ۹۹

(۵) ایضاً

(۶) اعجاز احمد (۱۹۸۵) ص ۱۶۲

(۷) متعدد، خصوصاً عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۹۷۔ روایت علی بخش

(۸) وحیدالدین، فقیر سید (۱۹۵۰) ص ۱۰۰۔ نوٹ: اُس زمانے کی ایک سنی سنائی روایت یہ ہے کہ ایک روز جب وہ ستار بجا رہے تھے، اُن کا کوئی سکھ دوست اُن کے پاس آیا۔ اُسے مذاق سوجھا تو اُس نے معنی خیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''شیخ صاحب! وَجا رہے ہو؟''

اقبال نے ذومعنی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

''سردار جی! سکھنی جے ہوئی۔''

سردار جی نے اس بات کا جواب دینا چاہا۔

''تیرا منڈا اوی سکھ دا اے؟''

اقبال نے ''سکھدا'' اور ''سکھ دا'' کے پھیر کو سردار جی پر اُلٹ دیا۔

''نہ او سکھ دا اے، نہ توں سکھ دا اے!''

(۹) سوامی رام تیرتھ کے حالات کے لئے دیکھئے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۳۰۴ اور افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۷

(۱۰) اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۱۸۶

(۱۱) سعید اختر درّانی (۱۹۸۵) ص ۲۹۷

(۱۲) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۶

(۱۳) حنیف شاہد (۱۹۹۷) ص ۸۶

(۱۴) حسن اختر، ڈاکٹر ملک (۱۹۸۸) ص ۴۰

(۱۵) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۳۴

(۱۶) جاوید اقبال (۱۹۷۹) ص ۹۸

(۱۷) یہ گوپی چند نارنگ کے معروضات ہیں۔ دیکھئے ان کا مضمون ''اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام'' مشمولہ بشیر فاروق (۱۹۹۳) ص ۵۱

(۱۸) حنیف شاہد (۱۹۹۷) ص ۸۲ بحوالہ سالانہ رپورٹ اورینٹل کالج ۱۹۰۰ء

(۱۹) اس مقالے کا بہت سا حصہ اقبال کی کتاب Development of Metaphysics in Persia میں بھی شامل ہوا

(۲۰) B. A. Dar (1967), p. 36

(۲۱) حنیف شاہد (۱۹۹۷) ص ۸۲

(۲۲) عبداللہ قریشی (۱۹۸۷) ص ۳۵

(۲۳) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷)

(۲۴) یہ رائے پروفیسر کرار حسین صاحب نے اپنی ایک تقریر میں پیش فرمائی ہے۔

باب ۷: ہمالہ

(۱) حسن اختر (۱۹۸۸) ص ۵۹

(۲) فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳) ص ۱۲۶

(۳) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۰۵

(۴) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۶۳

(۵) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۸

(۶) گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۰۹

(۷) ایضاً ص ۹۴

(۸) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۳۵

(۹) گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۰۵

(۱۰) عبدالقادر نے یہ واقعہ 'بانگِ درا' کے دیباچے میں تحریر کیا ہے۔

(۱۱) مخزن کا یہ شمارہ بیت الحکمۃ (ہمدرد لائبریری) میں راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے۔

(۱۲) مکتوب بنام کشن پرشاد

(۱۳) اس دور کی نظموں میں یہ تاثر صاف موجود ہے۔

(۱۴) عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) ص ۲۵۰

(۱۵) ایضاً

(۱۶) یہ عام خیال ہے۔

(۱۷) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۰۰

(۱۸) مخزن کا یہ شمارہ بیت الحکمۃ (ہمدرد لائبریری) میں راقم کی نظروں سے گزرا ہے۔

(۱۹) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۴۲ روایت زکی شاہ

(۲۰) حسن اختر، ڈاکٹر ملک (۱۹۸۸) ص ۱۵۱۔ مرتب نے بعض گمشدہ درسی کتاب بازیافت کر کے اقبال کی چند نظموں خصوصاً ''ایک مکڑا اور مکھی'' اور ''ہمدردی'' کے اولین متنوں پر تحقیق کی ہے جو اس لحاظ سے لائق توجہ ہے کہ یہ تصریحات گیان چند (۱۹۸۸) میں بھی شامل نہیں ہیں۔ نظم ''ہمدردی'' کی مکمل ابتدائی صورت وہاں سے نقل کی جاتی ہے:

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
آنکھوں سے ٹپک رہے تھے آنسو
کہتا تھا کہ ہائے اب کروں کیا
کس طرح سے گھونسلے کو جاؤں
یہ شام یہ رات کا اندھیرا
پھیلی ہے یہ رات کی سیاہی
رستہ نہیں گھونسلے کا ملتا
افسوس مجھے سمجھ نہ آئی
اُڑنے چگنے میں دن گزارا
خورشید کے ڈوبنے سے پہلے
گھر مجھے چاہیئے تھا جانا
بچے مرے دیر سے ہیں بھوکے
دے گا انہیں کون جا کے دانا
مر جائیں نہ وہ غریب ڈر کر
گر جائیں نہ گھونسلے سے باہر
بلبل نے کہا جو حال اپنا

جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دِیا بنایا
روشن ہیں جو پر برے تو مجھ کو
آسان ہے راہ کا دکھانا
اوروں کے جو کام میں نہ آؤں
کس کام کا پھر برا ہے جینا
بلبل کو اُڑا یہ کہہ کے جگنو
لے کر اُسے گھونسلے میں آیا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

(۲۱) عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) ص ۳۳
(۲۲) اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۱۸۵
(۲۳) اس بحث کے لئے دیکھئے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۳، اور اعجاز احمد (۱۹۸۵) ۱۹۰
(۲۴) عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸) ص ۱۸۷ و ع
(۲۵) دیباچہ علم الاقتصاد۔
(۲۶) عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) ص ۴۳
(۲۷) مکتوب بنام مسز اسٹراٹن۔ نیز افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۶
(۲۸) عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) ص ۹۸
(۲۹) عبدالمجید سالک (۱۹۵۵) ص ۶۸

باب ۸: سورج کے سامنے

(۱) عبدالواحد معینی (۱۶۳) ص ۴۳

(۲) عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸) ص ۱۹۱

(۳) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۶۹۔ روایت پروفیسر محمد دین بھٹی۔

باب ۹: امیر کا صنم خانہ

(۱) امیر بیگم کے حالات دیگر ماخذوں کے علاوہ جاوید اقبال (۱۹۸۱) اور افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) سے اخذ کیے گئے ہیں۔ دیگر ماخذوں کا حوالہ ان کی جگہ پر دیا گیا ہے۔

(۲) عبداللہ قریشی ص (۱۹۸۸) صد ۵۵

(۳) گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۴

(۴) اقبال نے اپنے مکتوب (۱۱ مارچ ۱۹۰۳) میں امیر بیگم کو اشارتاً "علت ابرِ گہر بار" لکھا ہے۔ دیگر تفاصیل انہی دنوں حبیب الرحمٰن شروانی کے نام ایک خط میں میں لکھی ہیں۔ ان میں امیر بیگم کا نام نہیں آیا چنانچہ بین السطور پڑھ کر میں نے یہ نتائج اخذ کیے ہیں۔

(۵) سالک (۱۹۵۵) ص ۲۴۶

(۶) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۸۸

(۷) گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱۰

(۸) مکتوب بنام منشی سراج الدین، ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء

(۹) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) روایت علی بخش

(۱۰) حسن اختر (۱۹۸۸) ص ۶۵

(۱۱) اعجاز احمد (۱۹۸۵) ص ۵۳ نیز گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱۴۔

(۱۲) حسن نظامی

(۱۳) گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱۴-۲۱۵

(۱۴) حسن نظامی (۱۹۹۰) ص ۶۹

(۱۵) عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) ص ۵۲

(۱۶) دیکھیے مکتوب ۱۳ اگست ۱۹۱۸ء

(۱۷) اقبال (۱۹۰۸ء) ص ۹۰۔ نوٹ: اقبال نے انگریزی میں بزمِ قدرت کے لئے "ایکسٹرنل نیچر" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

(۱۸) عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) (ص روایت لی بخش)

(۱۹) عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) ص ۵۱

(۲۰) گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۸

(۲۱) حسن نظامی

(۲۲) حنیف شاہد (۱۹۷۲) ص ۸۷

(۲۳) سالک (۱۹۵۵) ص ۲۴۷

(۲۴) خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۳۷

(۲۵) گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۰۴

(۲۶) گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۰

(۲۷) افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۸۸

(۲۸) گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۴۶

(۲۹) جاوید اقبال (۱۹۷۹) ص ۹۹

(۳۰) عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸)

(۳۱) حنیف شاہد (۱۹۷۲) ص ۸۲)

(۳۲) گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۴۷

(۳۳) حسن اختر (۱۹۸۸) ص ۱۸۳

(۳۴) ایضاً

(۳۵) حنیف شاہد (۱۹۷۲) ص ۸۸

(۳۶) مکتوب ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء

(۳۷) عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) میں شامل اقبال کا مضمون ''قومی زندگی''

(۳۸) عطیہ فیضی (۱۹۶۷) دیکھئے جریدہ Dawn, April 30, 1967

(۳۹) عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) میں شامل اقبال کا مضمون ''قومی زندگی''

(۴۰) گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۶

(۴۱) ایضاً

(۴۲) شورش کاشمیری (نورتن) ص ۳۵۔ اس روایت کو نقل کرنے میں شورش سے کہیں غلطی ضرور ہوئی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ عبدالمجید سالک نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ وہ خود بھی گرامی کے ساتھ امیر کو لینے گئے تھے۔ یہ درست نہیں ہوسکتا کیونکہ ۱۹۰۴ء میں سالک کی عمر گیارہ برس تھی جبکہ اقبال سے ان کی پہلی ملاقات ۱۹۱۴ء کے قریب ہوئی۔ یہ واقعہ بعد کے زمانے کا بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ اول تو اقبال اور امیر کا تعلق ۱۹۰۴ء میں ختم ہوگیا تھا، دوسرے خود اسی روایت میں سالک کہتے ہیں کہ اقبال اُن دنوں بازارِ حکیماں میں رہتے تھے۔ یہ معلوم ہے کہ اقبال ۱۹۰۵ء کے بعد کبھی اُس محلے میں نہیں رہے۔

(۴۳) مکتوب ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۴ء

(۴۴) دیکھئے اس باب کا حاشیہ (۱)

(۴۵) شورش کاشمیری (اُس بازار میں) ص ۱۸۴

منتخب کتابیات

☆ اس فہرست میں صرف انہی کتابوں کا اندراج کیا جارہا ہے جن کا حوالہ مآخذ میں دیا گیا ہے۔ دیگر کتب جن سے اس سوانح کی تیاری میں مدد لی گئی وہ اس فہرست میں شامل نہیں۔

☆ مصنف کا نام درج کرتے ہوئے لقب، عہدہ یا ذات نکال کر اس کے بعد والے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ اگر نام کا پہلا لفظ محمد ہے تو اسے بھی نام سے پہلے شمار نہیں کیا گیا۔ مثلاً عبدالمجید سالک تو عبدالمجید سالک ہی رہا ہے مگر ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کو ہم نے ''عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر محمد'' لکھا ہے۔

☆ مصنف کے نام کے بعد کتاب کی پہلی اشاعت کا سال درج کیا گیا ہے۔ چونکہ اُردو زبان میں تاریخِ اشاعت درج کرنے کا رواج عام نہیں رہا ہے اس لئے بعض صورتوں میں ہمیں دیباچے کی تاریخ کو طبعِ اوّل کی تاریخ فرض کرنا پڑا ہے۔

☆ ناشر کا نام کتاب کے اُس نسخے سے لیا گیا ہے جس سے براہِ راست استفادہ ہوا۔ اگر یہ پہلا ایڈیشن نہ رہا ہو تو ناشر کے نام کے بعد قوسین میں اس ایڈیشن کی تاریخ درج ہے۔

کتب اقبال

The Development of Metaphysics in Persia (1908). Bazm-e-Iqbal (1964) Lahore.

علم الاقتصاد (۱۹۰۴)۔ آئینۂ ادب (۱۹۹۱) لاہور

اقبال کی وہ تحریریں جو دوسروں نے مرتب کیں

گیان چند، ڈاکٹر۔ ۱۹۸۸۔ ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیب مہ وسال۔ شائستہ پبلشنگ ہاؤس۔ کراچی
مظفر حسین برنی۔ ۱۹۹۲۔ کلیات مکاتیب اقبال (جلد اول)۔ اُردو اکادمی۔ دہلی
محمد عبداللہ قریشی۔ ۱۹۸۷۔ حیاتِ جاوداں۔ بزمِ اقبال۔ لاہور
عبدالواحد معینی، عبداللہ قریشی۔ ۱۹۶۳۔ مقالاتِ اقبال۔ آئینۂ ادب (۱۹۸۸)۔ لاہور

B. A. Dar 1967 *Letters And Writings Of Iqbal* Iqbal Academy Pakistan, Lahore

بنیادی مآخذ

خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) بزمِ اقبال (۱۹۸۳) لاہور
عبدالقادر، شیخ۔ ۱۹۲۴۔ دیباچہ بانگِ درا۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز (۱۹۷۳)۔ لاہور
فقیر سیّد وحید الدین۔ ۱۹۵۰، ۱۹۶۳۔ روزگارِ فقیر (جلد اوّل)۔ آتش فشاں پبلی کیشنز (۱۹۸۸)۔ لاہور
حمید احمد خاں۔ ۱۹۷۴۔ اقبال کی شخصیت اور شاعری۔ بزمِ اقبال (۱۹۸۳ء)۔ لاہور
اعجاز احمد۔ ۱۹۸۵۔ مظلوم اقبال۔ اعجاز احمد۔ کراچی
عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر محمد۔ ۱۹۷۷۔ روایاتِ اقبال۔ اقبال اکادمی پاکستان (۱۹۸۹)۔ لاہور
عبدالمجید سالک۔ ۱۹۵۵۔ ذکرِ اقبال۔ بزمِ اقبال۔ لاہور
عبدالمجید سالک۔ ۱۹۵۴۔ سرگزشت۔ الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب (۱۹۹۳)۔ لاہور
نذیر نیازی، سیّد۔ ۱۹۶۱۔ اقبال کے حضور۔ اقبال اکادمی۔ کراچی
عبداللہ قریشی (مرتب)۔ ۱۹۸۸۔ تذکارِ اقبال از منشی محمد الدین فوق۔ بزمِ اقبال۔ لاہور
عطیہ فیضی (۱۹۴۸) اقبال۔
حنیف شاہد، محمد۔ ۱۹۷۲۔ نذرِ اقبال، سر عبدالقادر کے مضامین، مقالات، مقدمات اور مکاتیب کا مجموعہ۔ بزمِ اقبال۔ لاہور

Muhammad Siddique: *Descriptive Catalogue of Allama Iqbal's Personal Library.*

Iqbal Academy, Lahore

جرائد

Dawn, April 21, 1952 (Attiya Faizi: When soft music confused Iqbal)
Dawn, April 30, 1967 (Attiya Faizi: Iqbal, a reflection)
اقبال (بزمِ اقبال لاہور) اکتوبر ۱۹۵۷ء: غلام بھیک نیرنگ۔ اقبال کے بعض حالات

ثانوی مآخذ

عبداللہ قریشی۔ ۱۹۸۲۔ حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں۔ بزمِ اقبال۔ لاہور
افتخار احمد صدیقی۔ ۱۹۸۷۔ عروجِ اقبال۔ بزمِ اقبال۔ لاہور
سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سیّد۔ ۱۹۸۶۔ اقبال کی ابتدائی زندگی۔ اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور
سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سیّد۔ ۱۹۸۱۔ علاّمہ اقبال کے اُستاد شمس العلماً مولوی سیّد میر حسنؒ (حیات و افکار)۔ اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور
نذیر نیازی، سیّد۔ ۱۹۷۹۔ دانائے راز۔ اقبال اکادمی پاکستان (۱۹۸۸)۔ لاہور
الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ)، سیّد اور پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے (مرتبین)۔ ۱۹۷۰۔ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ کراچی
اکرام، ایس۔ ایم۔ (تاریخ ندارد)۔ یادگارِ شبلی۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (۱۹۹۴)۔ لاہور
ابوالاعجاز حفیظ صدیقی۔ ۱۹۸۳۔ اوزانِ اقبال۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور
حسن اختر، ڈاکٹر ملک۔ ۱۹۸۸۔ اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ۔ یونیورسل بکس۔ لاہور
سعید اختر درّانی۔ ۱۹۸۵۔ اقبال یورپ میں۔ اقبال اکادمی۔ لاہور
شبلی نعمانی۔ سفرنامہ مصر و روم و شام
بشیر فاروق۔ ۱۹۹۳۔ دانائے راز۔ فاروق اکیڈمی۔ کراچی
عبدالرؤف عروج۔ ۱۹۸۸۔ رجالِ اقبال۔ نفیس اکیڈمی۔ کراچی
شورش کاشمیری (تاریخ ندارد)۔ اُس بازار میں۔ الفیصل تاجرانِ کتب۔ لاہور
شورش کاشمیری (تاریخ ندارد)۔ نورتن۔ الفیصل تاجرانِ کتب (۱۹۹۸)۔ لاہور
حسن نظامی۔ آپ بیتی۔ مکتبہ تعمیر انسانیت (۹۹۰) لاہور

"کسی موضوع کے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ کرنا عجیب سی بات ہے۔ مگر اس کے باوجود مجھے یہ کہنا ہے کہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اِقبال کی ابتدائی زندگی کی وہ تمام باتیں جو کسی بھی صورت میں معلوم یا دستیاب ہیں اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس دائرے میں صرف اُن کی زندگی کے حالات ہی نہیں آتے بلکہ وہ خیالات جو انہوں نے دوسروں کی تحریروں سے اخذ کیے، خود اُن کی اپنی شاعری اور نثر کا مکمل جائزہ اور اِن کا تعارف اِس میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کتاب اُس عہد کی تصویر بھی ہے۔۔۔"

خرم علی شفیق

Pakistan Rs. 250

ISBN 969-516-100-6
9789695161005

www.alhamra.com